Gh. Rasool Bhat
Gh. Rasool Bhat

Gh. Rasool Bhat

2.3
1
19.3
50
40
283
150
133
45
178

Ali Mohd Kumar
9 - 72

Amin

Amina Bano

7266

سچی کہانیاں

پریم پجاری

کتب خانۂ علم و ادب دہلی

قیمت ۳ روپے
۱۹۴۵ء
طبع دوم ۲۰۰۰

مندرجات

انتساب

رام پور کے ساتھ اپنے وطنی تعلق اور فرماں روائے رام پور کرنل، ہزہائنس، عالی جاہ، فرزندِ دل پذیرِ دولتِ انگلشیہ، مخلص الدّولہ، ناصر الملک، امیر الامرا، ڈاکٹر، نواب، سر سید رضا علی خاں بہادر، مستعد جنگ، کے، سی، ایس، آئی، ایل، ایل، ڈی۔ ڈی، لٹ۔ کی معارف پروری کی بنا پر میں اپنی اس ادبی کوشش کو تاج دار موصوف کے نام نامی سے منسوب کرنے کی عزّت حاصل کرتا ہوں۔

عندلیب شادانی

دیباچہ طبع ثانی

ملک میں مختصر افسانوں کی مانگ بہت زیادہ ہے اس لئے اچھے برے ہر قسم کے مختصر افسانوں کے مجموعے آئے دن شائع ہوتے رہتے ہیں لیکن عموماً اُن کے دوبارہ چھپنے کی نوبت نہیں آتی۔ اس کے دو سبب ہیں۔ یا تو پہلا ایڈیشن کبھی ختم ہی نہیں ہوتا یا دوسرے ایڈیشن کی مانگ ہی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس "سچی کہانیاں" شائع ہوتے ہی چند ماہ کے اندر اندر فروخت ہوگئی اور پڑھنے والوں کی مانگ باقی رہی۔ جنگ کی پیدا کی ہوئی مجبوریاں مانع نہ ہوتیں تو دوسرا ایڈیشن آج سے بہت پہلے شائع ہو چکا ہوتا۔ اسی سے کتاب کی مقبولیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اُردو کے معتبر رسالوں۔ آل انڈیا ریڈیو، دہلی، اور مختلف حضرات و خواتین نے جن لفظوں میں اس کتاب پر تبصرہ کیا وہ ہر مصنّف کے لئے قابلِ رشک ہے غرض مجھے خاص و عام سے اپنی دماغی کاوش کی پوری پوری داد مل گئی اور اس کے لئے میں پڑھنے والوں کا تہِ دل سے ممنون ہوں۔

(ڈاکٹر) عندلیب شادانی

ایم، اے۔ ایم، او، ایل۔ ایم، ایف۔

پی، ایچ، ڈی (لندن)

صدر شعبۂ فارسی و اُردو۔ ڈھاکا یونیورسٹی

۲۲ جون ۱۹۴۵ء۔ بھیم تال

دیباچہ

خیالی افسانے بھی اگرچہ زندگی کا عکس ہی ہوتے ہیں پھر بھی ان کے پڑھنے سے طبیعت اتنی متاثر نہیں ہوتی جتنی "حقیقی واقعات" کے مطالعہ سے ہوتی ہے۔ یورپ نے اس نفسیاتی نکتہ کو سمجھا اور سچی کہانی (TRUE STORY) کو اپنے افسانوی ادب کی ایک اہم صنف قرار دیا۔ چنانچہ وہاں متعدد ماہ نامے صرف سچی کہانی کے لئے وقف ہیں اور بعض رسالے ایسے بھی ہیں جن کے ہر نمبر میں، دوسرے مضامین کے علاوہ، ایک سچی کہانی بھی ضرور شائع ہوتی ہے۔ یہ سچی کہانیاں معقول معاوضہ دے کر حاصل کی جاتی ہیں۔

میں نے انگلستان کے دوران قیام میں بہت سی سچی کہانیوں کا مطالعہ کیا اور انہیں بے حد دلچسپ اور سبق آموز پایا۔ جس طرح مشاہیر کے بڑے بڑے کارنامے ہمارے دل میں اُمنگ، ولولہ اور حوصلہ پیدا کر دیتے ہیں۔ اسی طرح دوسروں کی خامیاں اور کوتاہیاں بھی ہمارے لئے شمع ہدایت اور درس عبرت بن جاتی ہیں لیکن ہندوستان میں ابھی اتنی اخلاقی جرأت پیدا نہیں ہوئی کہ کوئی اپنی زندگی کے اہم واقعات —— خصوصاً ایسے واقعات جن سے کسی اخلاقی کمزوری کا اظہار ہوتا ہو —— بے کم وکاست پبلک کے سامنے پیش کر دے۔

انگلستان سے واپسی کے بعد میں نے اردو کے افسانوی ادب میں سچی کہانی کی کمی کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور میرے احباب میں جو لوگ افسانہ نگار ہیں انہیں

اس طرف توجہ دلائی لیکن کسی نے در خورِ اعتنا نہ سمجھا۔ وجہ ظاہر ہے کہ کوئی بھی اپنی "کمزوریاں" دوسروں کو سنانے کے لیے تیار نہ تھا۔ ایک مرتبہ میں نے ساقی کے ایڈیٹر مسٹر شاہد احمد کو لکھا کہ "افسانہ نمبر" کے بجائے ساقی کا "سچی کہانی نمبر" شائع کیجیے۔ انہوں نے جواب دیا کہ "ہمارے افسانہ نگار سچی کہانیوں کے بجائے "صرف کہانیاں" سنائیں گے اور جو مقصود آپ کے پیشِ نظر ہے وہ حاصل نہ ہو سکے گا"! اگرچہ اشخاص اور مقامات کے نام بدل دینے کے بعد کسی کا پہچانا جانا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ پھر بھی واقعات اور ماحول غمازی کر ہی دیتے ہیں۔ اسی خوف سے کوئی آپ بیتی لکھنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

افسانہ نگاری کے اصول میں نہیں جانتا لیکن جو لوگ اس فن میں اچھی دستگاہ رکھتے ہیں ان میں سے بعض کو میں نے یہ کہتے سنا تھا کہ "افسانہ نگار کا ایک بڑا کمال یہ ہے کہ وہ افسانہ کو حقیقت بنا دے"! اس بنا پر میں نے خیال کیا کہ اگر اپنی اور دوسروں کی زندگی کے بعض اہم اور غیر معمولی واقعات صاف ستھری اردو میں بے کم و کاست بیان کر دیے جائیں تو یقیناً وہ اچھے افسانوں کی طرح دل چسپ، اثر انگیز اور سبق آموز ثابت ہوں گے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۲ء سے میں نے "پریم پجاری" کے نام سے ساقی میں "سچی کہانی" کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ سچی کہانیاں میری توقع سے زیادہ مقبول ہوئیں بہت سے حضرات و خواتین نے ساقی کے ایڈیٹر کی معرفت گم نام مصنف کو تعریفی خطوط لکھ کر اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ساقی پر تبصرہ کرنے والوں نے "پریم پجاری" کی سچی کہانیوں کو سراہا اور کئی ناشروں نے انہیں کتابی صورت میں شائع کرنے کی خواہش کی۔

بے محل نہ ہوگا اگر "پریم پجاری" کا فرضی نام اختیار کرنے کی وجہ بھی بیان کر دی جائے۔ اردو میں ابھی تک بے لاگ تنقید کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہمارے تبصرہ نگار کسی

تصنیف کے ذاتی حسن و قبح سے قطع نظر کرکے عموماً دوسرے محرکات کی بنا پر اس کی تعریف یا مذمت کرنے کے عادی ہیں۔ چنانچہ بارہا ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک نقّاد نے کسی کتاب کو "اردو ادب میں قیمتی اضافہ" قرار دیا۔ دوسرے نے اُسی کو "طومارِ خرافات" ٹھہرایا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے رسائل میں عام طور پر جو تنقیدیں شائع ہوتی ہیں۔ ان کی روشنی میں کسی تصنیف کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگانا بہت دشوار ہے۔ میں اپنی سچی کہانیوں کے متعلق مختلف طبقوں کی بے لاگ رائے جاننا چاہتا تھا۔ اس لئے پریم پجاری کا یہ فرضی نام اختیار کیا۔ گم نام پریم پجاری کا نہ کوئی دوست تھا نہ دشمن۔ اس لئے جس کسی نے "سچی کہانی" کے متعلق جو کچھ کہا بے تعصبی کے ساتھ کہا اور یہی میرا مقصد تھا۔

ممکن ہے کہ کتاب شائع ہونے کے بعد بعض "احباب" کا جذبۂ حسد بیدار ہو جائے اور وہ سچی کہانیوں کو جھوٹ اور خرافات کا مجموعہ ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ مگر سچی کہانیوں کی سچی تعریف جواب تک ہو چکی ہے وہ میرے لئے بالکل کافی ہے۔

سچی کہانیوں کے متعلق صرف ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔ ان میں بعض باتیں غیر معمولی ہونے کی وجہ سے شاید بعض لوگوں کو غیر فطری معلوم ہوں۔ واقعات میں کتر بیونت کرکے اس "عیب" کو بڑی آسانی سے مٹایا جا سکتا تھا۔ مگر میں نے صداقت کا خون کرنا کسی حال میں گوارا نہیں کیا۔

عندلیب شادانی
۴۷، بیگم بازار روڈ۔ ڈھاکا
۲۵ جنوری ۱۹۴۳ء

سچی کہانی

(سردار ہرنام سنگھ)

تیرہ برس گذرے، میں پنجاب کے ایک خالصہ ہائی اسکول میں پرشین ٹیچر تھا۔ بعض وجوہ سے اس مقام کا اصلی نام ظاہر کرنا نہیں چاہتا جہاں یہ اسکول واقع تھا۔ آپ تھوڑی دیر کے لئے امرت پور فرض کر لیجئے۔ امرت پور ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس کی آبادی اُس وقت کُل ۲۳۰۰ (دو ہزار تین سو) تھی اور باشندے زیادہ تر سکھ۔ اُنہیں کا یہ اسکول تھا جس میں اردگرد کے دیہات سے لڑکے پڑھنے آتے تھے۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر ایک بنگالی بابو مسٹر مکرجی تھے اور سکنڈ ماسٹر ایک سکھ نوجوان سردار ہرنام سنگھ[1] بی۔ اے۔ میں اور مکرجی ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ اور آپس میں بہت ہی بے تکلف ہو گئے تھے۔ تین مہینے کے مختصر قیام میں سردار ہرنام سنگھ سے اتنے تعلقات بڑھے کہ ہم گہرے دوست ہو گئے۔ ہرنام سنگھ نے مجھ سے فارسی پڑھنی شروع کی۔ وہ فارسی میں ایم۔ اے کا امتحان دینا چاہتے تھے۔ اُنہیں اُمید تھی کہ اگر فارسی میں ایم۔ اے کر لیا تو خالصہ کالج امرتسر میں اُنہیں

---

[1] بربنائے مصلحت بعض مقامات اور اشخاص کے اصلی نام ظاہر نہیں کئے گئے۔

پروفیسری مل جائے گی۔

پہلے میرا خیال تھا کہ سکھ لوگ بڑے متعصب ہوتے ہیں اور خصوصاً مسلمانوں سے بہت نفرت کرتے ہیں، لیکن سردار ہرنام سنگھ سے ملاقات ہونے کے بعد مجھے اپنی رائے بدل دینی پڑی۔ سردار ہرنام سنگھ اگر سکھ تھے اور یقیناً سکھ تھے تو پھر سکھوں سے زیادہ بے تعصب قوم دنیا میں کوئی نہیں۔ وہ سراپا محبت تھے۔ سراپا اخلاص تھے۔ اس وقت اُن کا سن ۳۲ سال سے زیادہ نہ تھا۔ دراز قامت، بلند بالا، گندمی رنگ، کتابی چہرہ، تیکھے نقشہ، بلند پیشانی۔ دانت اُن کے ایسے آبدار اور خوبصورت تھے کہ جو دیکھتا رشک کرتا۔ چھوٹی سی سیاہ ڈاڑھی اُن کے بھولے چہرہ پر بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ مزاج میں سادگی کے ساتھ ساتھ نفاست پسندی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اُن کی شادی ہو چکی تھی۔ بیوی اُن کے ساتھ تھیں اور بہت جلد ایک بچہ کی ماں بننے والی تھیں۔ ایران، عراق، عرب، مصر، یورپ کے اکثر ممالک اور ہندوستان میں کشمیر سے کولمبو تک اور کوئٹہ سے ڈھاکے تک میں نے اچھی طرح سیاحت کی ہے۔ مگر سچ کہتا ہوں کہ مسز ہرنام کی سی دل ربا صورتیں میں نے دو چار سے زیادہ نہیں دیکھیں وہ بنگالنوں کے سے ڈھیر کے ڈھیر، لمبے لمبے کالے بال، کمر سے نیچے تک لٹکتے ہوئے وہ بڑی بڑی سیاہ موہنی آنکھیں جن پر شیرازیوں کو ناز ہے۔ لمبی لمبی گھنی پلکیں۔ بھنویں تھیں کہ کمانیں جیسے کسی چابک دست نقاش نے گہری سیاہ پنسل سے سفید کاغذ پر بنائی ہوں۔ ایرین ٹائپ کی بلند اور ستواں ناک۔ پتلے پتلے گلابی ہونٹ جن پر مسکراہٹ سے ایک عجیب قسم کی چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ کشمیرنوں کی سی گوری بھبھوکا رنگت۔ رخساروں پر جوانی کے خون کی جھلک، جس سے شبہ ہوتا تھا کہ شاید روژ لگایا ہے۔ بیضوی چہرہ چھوٹا سا دہانہ، خوبصورت بتیسی، جسم تھا کہ سانچہ میں ڈھلا ہوا۔ سینہ کا اُبھار، کمر کی باریکی اور اس کے بعد جسم کے نچلے حصہ کا اُبھر کر ایک مخروطی شکل میں کم ہوتا چلا جانا۔

اور ان سب حصّوں کا باہمی توازن و تناسب، فطرت کی نادرہ کاری کا ایک ایسا نمونہ تھا
جو بار بار دیکھنے میں نہیں آتا۔ ایک ایک عضو اس قدر موزوں، اس قدر متناسب کہ دور
سے دیکھو تو شک ہو جائے کہ یہ انسان ہے یا کوئی یونانی مجسمہ۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھ،
چھوٹے چھوٹے پاؤں۔ چال میں ایک قدرتی متوالا پن۔ مزاج میں بے انتہا انکسار مگر چہرہ
سے بلا کی تمکنت نمایاں، ناواقف دیکھے تو سمجھے کہ کوئی رانی یا شاہزادی ہے۔ ہزار
کے مجمع میں بٹھا دو تو الگ نظر آئے، جیسے ستاروں میں چاند۔ ماتھے پر سُرخ بندی
ایک مہر خشمیہ تھی جس سے حُسن اُبل رہا تھا۔ میں جب اُسے دیکھتا، ہرنام سنگھ کی قسمت پر
رشک کرتا اور دل میں کہتا "کاش میں مُصوّر ہوتا"، ہرنام سنگھ کو "پریما"[1] کے پردہ کا
بہت خیال تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ حق پر تھے۔ ایک دفعہ نہیں، میں نے بار بار دیکھا
کہ جب کبھی پریما کے گھونگٹ کا پٹ اُلٹ گیا اور کسی کی نظر اُس پر پڑ گئی وہ ساری دنیا
کو بھول گیا اور جب تک دیکھ سکا پریما کے سوا اور کسی چیز کو نہ دیکھا۔

ہرنام سنگھ کو فارسی ادب سے ہی نہیں بلکہ ایران کی ہر چیز سے غیر معمولی دلچسپی
تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر میرے یہاں بیٹا ہوا تو اس کا نام شہریار رکھوں گا۔ اور
بیٹی ہوئی تو شہربانو۔ ایک مرتبہ میں نے کہا اگر تم نے ایسی حرکت کی تو سکھ لوگ تمہیں
اپنی برادری سے نکال دیں گے، انہوں نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا کہ میں سچ مچ کا
سکھ ہوں یعنی گرونانک کا چیلا۔ وہ گرونانک جس نے ذات پات کے بندھنوں کو توڑ کر
چھوت چھات کو مٹایا جس کے یہاں رام اور رحیم کے ایک ہی معنی ہیں۔ جس کے یہاں صرف
محبت و اخلاص معتبر ہے۔ الغرض جب ایک مہینہ بعد اُن کے یہاں بیٹی ہوئی تو انہوں نے
اُس کا نام شہربانو رکھا۔ امرت پور کے سکھوں اور ہندوؤں نے اُن کی اس "بدعت" کو
بہت ناپسند کیا۔ ناراضی یہاں تک بڑھی کہ وہ اُنہیں اسکول سے علیحدہ کر دینے پر

[1] ہرنام سنگھ اپنی بیوی کو اسی نام سے پکارتے تھے۔ اصلی نام مجھے خود بھی معلوم نہیں۔

آمادہ ہو گئے۔ مگر کسی مناسب موقع کے منتظر تھے۔

دو مہینے اور گذر گئے، امرت پور میں سکھوں کا ایک بڑا بھاری جلسہ ہوا۔ مہمانوں کے لئے ہمارے اسکول کے میدان میں خیمے لگائے گئے اور وہیں "دربار" لگا۔ گرد و نواح کے ہزاروں سکھ جلسہ میں شریک ہوئے۔ باہر سے آنے والے نمایندوں میں ارجن گڈھ کی رہنے والی ایک نوجوان عورت بھی تھی جس کا نام روپ کور تھا۔ اس نے اپنی زندگی مذہبی خدمت کے لئے وقف کر دی تھی۔ اب تک کنواری تھی اور آیندہ بھی شادی کا ارادہ نہ تھا۔ چھریرا بدن، متوسط قامت، سانولی رنگت، تیکھا نقشہ، تیز آنکھیں، چہرے سے ذہانت کے ساتھ ساتھ تیز مزاجی کے بھی آثار نمایاں تھے۔ سر سے پاؤں تک سیاہ لباس پہنے۔ کرپان لگائے جس کا میان بھی سیاہ، حمائل بھی سیاہ بڑی تمکنت سے اسٹیج پر آئی اور پنجابی زبان میں بھجن گایا۔ اس کی آواز بہت پیاری تھی۔ کوئل کی طرح کوکتی تھی۔ الفاظ تو میری سمجھ میں نہیں آئے، مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کانوں کی راہ سے دل پر امرت کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ میں اور سردار ہرنام سنگھ اسٹیج کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ جیسے ہی روپ کور اسٹیج پر آئی، ہرنام سنگھ کچھ مضطرب سے ہو گئے اور کسی کام کے بہانے سے اٹھنے لگے۔ میں نے زبردستی بٹھا لیا۔ بیٹھنے کو تو وہ بیٹھ گئے۔ مگر بہت بے چین، چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ تھوڑی دیر میں پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ میں حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ پوچھا خیر تو ہے، کہا کچھ نہیں طبیعت خود بخود بگڑ رہی ہے۔ روپ کور ایک محویت کے عالم میں بھجن گا رہی تھی۔ یکایک اس کی نظر سردار ہرنام سنگھ پر پڑی، جیسے کوئی اچانک کالے ناگ کو اپنے قریب دیکھ کر جھجک جائے اور گھبرا کر پیچھے ہٹے ٹھیک یہی حالت اس کی ہوئی۔ اسے ایک دھچکا سا لگا۔ اس کی آواز میں ایک لرزش پیدا ہوئی۔ ایسی لرزش جو چھپ نہ سکتی تھی۔ وہ اب بھی گا رہی تھی مگر اس کی روح

کہیں اور تھی۔ اس کی نظر ہماری طرف جمی ہوئی تھی جس سے غم و غصہ اور نفرت و حقارت برس رہی تھی۔ جذبات کا ہیجان اس کی آنکھوں اور چہرہ سے ایسا نمایاں تھا۔ جیسے فانوس میں سے شمع یا شیشہ میں سے شراب۔ اس کے دل میں چوٹ لگی تھی، درد تھا، چبک تھی، کسک تھی، کوئی پرانا زخم ہرا ہو گیا تھا، وہ ایک گھائل ناگن کی طرح بل کھا رہی تھی، زیادہ دیر تک نہ گا سکی، اور جلد بھجن ختم کر کے بیٹھ گئی۔

جلسہ ختم ہونے میں ابھی دیر تھی۔ میں نے ہرنام سنگھ سے کہا چلو تمہیں گھر پہنچا دوں انہوں نے کہا میں چلا جاؤں گا۔ میں نے ساتھ چلنے پر اصرار کیا۔ وہ چپ ہو رہے۔ ہم دونوں اُٹھے اور جلسہ سے باہر آئے۔ میں نے کہا ایک منٹ ٹھہرو میں ابھی آیا۔ دفتر میں میری چھتری رکھی ہے وہ لے آؤں۔ میں چلا گیا۔ کوئی تین چار منٹ میں واپس آیا۔ ہرنام سنگھ جا چکے تھے۔ مجھے تعجب تھا۔ یہ عمل اُن کی عادت کے بالکل خلاف تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں۔ اتنے میں مکرجی نظر پڑے اور ہم دونوں گھر چلے گئے۔ شام کو ہرنام سنگھ ملے تو میں نے پوچھا کہ آپ کہاں چلے گئے تھے۔ انہوں نے کہا کیا بتاؤں۔ جلسہ کے سکریٹری صاحب مجھے اپنے کیمپ میں کھینچ کر لے گئے۔ آپ کو مفت میں انتظار کی تکلیف اُٹھانی پڑی۔ معاف کر دینا۔ میں نے کہا وہ بات ہی کیا ہے۔ اس واقعہ کے تیسرے دن سر شام ہرنام سنگھ میرے یہاں آئے۔ میں اُس وقت تنہا تھا، مکرجی باہر گئے ہوئے تھے۔ ہرنام سنگھ کو میں نے ایسی پریشان حالت میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مُنہ اُترا ہوا، آنکھوں میں سُرخی اور بھاری پن، ہونٹ خشک، آواز بھرائی ہوئی۔ ہاتھ ملایا تو معلوم ہوا بدن جل رہا ہے، خوب بخار چڑھا ہوا ہے۔ وہ میرے پاس پلنگ پر بیٹھ گئے۔ ابھی میں کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ مجھے جھپٹ کر ایک سہمے ہوئے بچہ کی طرح آہستہ آہستہ رونے لگے۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ کوئی خاص واقعہ رونما ہوا ہے میں نے پوچھا

خدا کے لئے بتاؤ تو کیا ہوا۔ وہ کچھ نہ کہتے تھے۔ سسکیوں نے ہچکیوں کی صورت اختیار کی۔ آنکھیں گنگا جمنا بن گئیں۔ آخر میرے بار بار پوچھنے پر انہوں نے صرف اتنا کہا "پریم۔ میں تباہ ہو گیا۔ اب کوئی مجھے نہیں بچا سکتا"۔

ٹھکرجی کے واپس آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ اس لئے میں نے کہا چلو دریا پر چلیں، وہاں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ قصبہ سے پانچ چھ فرلانگ کے فاصلہ پر ایک ندی بہتی تھی۔ جو برسات میں بڑھ کر ایک خاصہ بڑا دریا اور گرمیوں میں سوکھ کر ایک پایاب نالا بن جاتی۔ راستہ بھر ہم دونوں خاموش رہے کوئی دس بارہ منٹ میں دریا پر پہونچ گئے۔ میں نے جوتا اتار ڈالا اور پانی میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ ہرنام سنگھ بھی بیٹھ گئے۔ میں نے کہا:۔

"اچھا اب بتاؤ کیا حادثہ ہوا؟"

"کیا بتاؤں کیا حادثہ ہوا" انہوں نے ایک نہایت غم ناک لہجہ میں کہنا شروع کیا۔ "آج تک تم مجھے ایک نیک نہاد، شریف انسان سمجھتے ہو مگر آج سے ایک بد ذات، کمینہ، بدمعاش، آوارہ اور خدا جانے کیا کیا سمجھو گے۔ خیر جو کچھ سمجھو۔ مگر میں واقعات کو تم سے چھپا نہیں سکتا میں جیسا کچھ بھی ہوں۔ آخر تم نے مجھے دوست بنایا ہے۔ اور تمہاری محبت سے امید ہے کہ مصیبت میں ایک بدنصیب دوست کو تنہا نہ چھوڑو گے"۔ میں نے کہا "ہرنام سنگھ اس تمہید کی ضرورت نہیں۔ تم مجھ سے اچھی طرح واقف ہو، میں ہر حال میں تمہارے ساتھ ہوں، مگر کچھ معلوم تو ہو کہ ہوا کیا"۔

انہوں نے کہا "سمجھ میں نہیں آتا، کہاں سے شروع کروں"۔

"جہاں سے جی چاہے شروع کرو۔ کوئی عدالت کے سامنے تو بیان نہیں دے رہے ہو"۔

"تو سنو۔ پریما میری بیاہتا بیوی نہیں۔ نہ وہ ہمارے خاندان کی لڑکی ہے۔ وہ ہمارے قصبہ کے ایک بڑے ساہوکار پنڈت داس کی اکلوتی بیٹی ہے۔ وہ عورت جس نے "دربار"

میں بھیجن گا یا تھا اس کا نام روپ کور ہے۔ میرا ایک دوست ہے پرتھی سنگھ وہ ڈاکٹر ہے آج کل بغداد میں ملازم ہے۔ پریا، روپ کور، پرتھی سنگھ اور میں چاروں بچپن میں ایک ہی پاٹھ شالا میں پڑھتے تھے اور ہم چاروں میں بڑا پیار تھا۔ پرتھی سنگھ مجھ سے دو سال بڑا اور پریا کئی سال چھوٹی ہے، میں اور روپ کور ہم عمر ہیں۔ جب ذرا بڑے ہوئے تو میں اور پرتھی سنگھ پاٹھ شالا چھوڑ کر ہائی اسکول میں آ گئے اور پریما اور روپ کور دونوں لڑکیوں کے پرائمری اسکول میں داخل ہو گئیں۔ اب ہمارے اسکول علیحدہ علیحدہ تھے۔ مگر محلہ ایک تھا اور ہمارے گھر بھی پاس پاس تھے۔ اس لیئے ساتھ کے کھیل کود میں کچھ زیادہ فرق نہیں آیا۔ روپ کور مجھے بہت چاہتی تھی، مگر مجھے اس سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ پرتھی سنگھ کا پریا کے بغیر کھیل میں جی نہ لگتا تھا، مگر پریما اس سے بے خبر تھی۔ وہ بڑی الڑھ تھی۔ میرا اور پریما کا بچپن ہی میں یہ حال تھا کہ گویا ہم ایک دوسرے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ پاٹھ شالا میں جب کبھی وہ پیسے دو پیسے کی مٹھائی یا اور کوئی چیز خریدتی یا گھر سے لاتی تو مجھے ضرور کھلاتی۔ میں نہ ملتا تو رکھ چھوڑتی جب ملتا دے دیتی۔ یہ تھی ابتدا۔ سات برس گذر گئے۔ ہم سب جوان ہو گئے۔ اور ہمارے ساتھ ہماری محبت بھی جوان ہو گئی۔ مجھے اٹھارواں سال تھا، پریما کو چودھواں۔ اسی سال میں نے انٹرنس پاس کیا۔ پرتھی سنگھ دو برس سے میڈیکل کالج لاہور میں پڑھتا تھا پریما اور روپ کور نے چھٹی کلاس پاس کرنے کے بعد ہی اسکول چھوڑ دیا تھا۔ ان سات برس کے واقعات کو کہاں تک سناؤں گا۔ مختصر یہ کہ ہر آنے والا دن ہمیں ایک دوسرے کے لئے محبوب تر بنا دیتا۔ اور ہر گذرنے والی رات ہمیں قریب تر چھوڑ جاتی۔ پرتھی سنگھ اب تک پریا کو چاہتا تھا۔ مگر خاموش تھا۔ روپ کور کی محبت کو میری سرد مہری نے اور بھی بھڑکا دیا تھا۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد میں خالصہ کالج امرتسر میں داخل ہو گیا۔

پریما جوان تھی، اس لئے بغیر کسی خاص ضرورت کے گھر سے نہیں نکل سکتی تھی اور ہماری ظاہری ملاقاتیں ڈھائی تین سال سے موقوف تھیں مگر ملے بغیر ہمیں چین کہاں، چھپے چوری ملتے تھے۔ وہ تقریباً ہر روز منہ اندھیرے پوجا کے بہانے مندر جاتی اور میں ٹہلنے کے حیلہ سے علی الصباح گھر سے نکل جاتا۔ جہاں موقع پاتے مل لیتے۔ خط و کتابت کا بھی انتظام کر لیا تھا۔ گرمیوں کی چھٹی میں جب میں گھر آتا اس وقت بھی یہی سلسلہ جاری رہتا۔ اس طرح دو برس گزر گئے اور میں ایف۔ اے کا امتحان دے کر امرت سر سے چلا آیا۔ پرتھی سنگھ بھی اسی زمانہ میں اپنی تعلیم ختم کر کے اور ڈاکٹر بن کر گھر آیا ہوا تھا۔ وہ میرا بہت عزیز دوست تھا۔ میں نے سال بھر کے پورے حالات اُسے سُنائے۔ وہ خاموشی کے ساتھ سُنتا رہا۔ جب میں کہہ چکا تو وہ بولا "ہرنام! میں بھی آج ایک بات تمہیں بتانے والا ہوں۔ مجھے بھی پریما سے ایسی ہی محبت ہے جیسی تمہیں اور آج سے نہیں بلکہ اس وقت سے جب ہم یہ بھی نہ جانتے تھے کہ محبت کیا چیز ہے، لیکن رفتہ رفتہ مجھے یقین ہو گیا کہ پریما سے محبت کرنے کا حق صرف تمہیں حاصل ہے۔ اس لئے کہ وہ خود تمہیں چاہتی ہے کسی دوسرے کا اُس سے محبت کرنا ایسا ہی بے معنی ہے جیسے کسی خیالی مخلوق سے محبت کرنا۔ جس طرح میں نے تمہیں ہمیشہ اپنا بھائی سمجھا اُسی طرح آج سے پریما کو بہن سمجھوں گا۔"

یہ تھا پرتھی سنگھ جس نے اپنی محبت کو ——— اس محبت کو جسے دس برس تک دل کے آغوش میں پرورش کیا اور سینہ میں چھپا چھپا کر رکھا ——— دوستی اور شرافت پر قربان کر ڈالا۔ اور ایک میں تھا جس نے شرافت اور انسانیت دونوں کو اپنی تمناؤں کی بھینٹ چڑھا دیا۔ اُس کی محبت نفرت میں تبدیل ہو گئی۔ وہ اُس بھوکی شیرنی کی طرح بپھری ہوئی تھی جس کے بچوں کو شکاری نے چھین لیا ہو۔ ہر چند پریما بالکل بے قصور تھی مگر میرے نزدیک وہ مجھ سے زیادہ عذاب کی

سمراد ارتھی، اس کا خیال تھا کہ اگر پریما کا قدم درمیان میں نہ ہوتا تو میں اُس کی محبت کا جواب سرد مہری سے نہ دیتا۔ وہ ہمیشہ ہم دونوں کو تباہ کرنے کی تدبیر سوچتی رہتی تھی۔ اس کی مخالفانہ کوششوں اور ہماری بے احتیاطیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے قصبہ میں ہماری خفیہ ملاقاتوں کا چرچا ہونے لگا۔ پریما کی نقل وحرکت پر نظر رکھی جانے لگی طرح طرح کی پابندیاں عائد کردی گئیں اور اب بڑی دشواریوں سے ہفتہ عشرہ میں گھڑی دو گھڑی کے لئے ملنا نصیب ہوتا۔ اسی دوران میں ایف۔ اے کا نتیجہ نکل آیا۔ میں پاس ہوگیا۔ والدین نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ فوراً میری شادی کردی جائے۔ میں نے ہرچند شور مچایا، ہرچند مخالفت کی، مگر ایک پیش نہ گئی اور بزرگوں نے اپنی گھڑی بھر کی خیالی خوشی کی خاطر میری زندگی بھر کی حقیقی راحت ومسرت کو خاک میں ملا دیا۔ ان حالات میں مجھے بیوی سے کیا دلچسپی ہوتی۔ اب گھر مجھے کاٹنے کھاتا تھا اور میں جلد سے جلد کالج چلا جانا چاہتا تھا۔ لیکن والد صاحب کی خواہش تھی کہ میں اپنی زمینداری کا کاروبار سنبھالوں، لکھنا پڑھنا موقوف۔ خدا کی قدرت دو ہفتے کے اندر یکایک اُن کا انتقال ہوگیا۔ ہمارا خاندان بہت معزز اور پرانا ہے۔ سرکار کی خدمت کے صلے میں بزرگوں کو جاگیریں ملی تھیں۔ جواب تک باقی ہیں۔ ہمارے چچا سردار ہردیو سنگھ پولیس انسپکٹر ہیں، اس وجہ سے اور بھی سارا اردن گڈھ ہمارا احترام کرتا ہے۔ چچا نے ہمیشہ مجھے بیٹے کی طرح سمجھا۔ بلکہ بیٹے سے زیادہ۔ والد کے انتقال کے بعد میری وحشت اور بھی بڑھ گئی۔ یہ حالت دیکھ کر چچا مجھے کالج بھیجنے پر رضامند ہوگئے۔ مگر بعض وجوہ سے میں نے دہلی کو امرتسر پر ترجیح دی اور سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں داخلہ کرا لیا۔

میری شادی کے بعد پریما بہت افسردہ رہنے لگی تھی۔ ملاقات ہوتی تو بہت کم بات کرتی، خاموش بیٹھی رہتی۔ میں اُسے تسلّی دیتا تو رونے لگتی اور رخصت ہوتے

وقت کہتی "شاید یہ آخری ملاقات ہو۔ بھگوان جانے کیوں آپ ہی آپ میرا دل بیٹھا جاتا ہے"۔ پریما کے والدین خود اس فکر میں لگے ہوئے تھے کہ جس قدر جلد ممکن ہو اس کی شادی کر کے ہمیشہ کے لئے اُن رسوا کُن افواہوں کا سدباب کر دیا جائے، جو اب روز بروز زیادہ تیزی کے ساتھ پھیلتی جا رہی تھیں۔ دہلی جانے سے ایک روز پیشتر میں پریما سے ملا۔ اُس روز اُس کی حالت بہت تباہ تھی۔ اُس نے کہا کہ "ایک ضروری بات سُن لو۔ میں دو منٹ سے زیادہ نہیں ٹھیر سکتی"۔ اور قبل اس کے کہ میں کچھ پوچھوں اُس نے خود ہی کہنا شروع کیا "دہلی کے کوئی سیٹھ ہیں کندن لال۔ اُن کے بیٹے سے میری شادی طے ہو گئی۔ وہ لوگ چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد یہ کام ہو جائے۔ پتاجی کی خود ہی مرضی ہے"۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے بہت بلندی سے مجھے فضا میں ڈھکیل دیا اور میں گرتا چلا جا رہا ہوں، میں ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ قریب ہی کسی کے پیروں کی چاپ سُنائی دی۔ پریما تیزی سے مڑی اور میرے دیکھتے دیکھتے غائب ہو گئی، اب روپ کور میرے سامنے کھڑی تھی۔ اُس نے ایک فاتحانہ انداز میں کہا:۔

"کیوں پکڑے گئے آخر۔ مجھ سے بھاگ کر کہاں جاؤ گے؟" شاید وہ میرے جواب کی منتظر تھی مگر میں کچھ کہے سُنے بغیر چپ چاپ وہاں سے چلا آیا۔ اپنے پیچھے میں نے اُسے یہ کہتے ہوئے سُنا:۔ "دلی جا کر سیٹھ کندن لال کے بیٹے کو مار ڈالنا۔ نہیں تو پریما ہاتھوں سے گئی"۔ زندگی میں آج پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ پریما مجھ سے چھن جائے گی۔ کیا بتاؤں، وہ رات کیسے کٹی۔ کٹی جیسے کٹی۔ صبح کو میں دہلی روانہ ہو گیا۔

تین ہفتے گذر گئے۔ پریما کی کوئی خیر خبر نہ ملی۔ نہ اس کا خط آیا نہ میں لکھ سکا۔ مجھے اپنا نہیں پریما کی رسوائی کا خوف تھا۔ پرمٹی سنگھ نوکری کی تلاش میں لاہور گیا ہوا تھا۔

ورنہ اس کے خط سے کچھ نہ کچھ اطلاع ضرور ملتی۔ ایک روز شام کو کھیل کے میدان میں میرے ایک دوست مہندر سنگھ نے ہندو کالج کے ایک طالب علم سے تعارف کرایا۔ اُس کا نام مدن لال تھا۔ مدن نے برسبیل تذکرہ میرا وطن پوچھا، میں نے کہا "ارجن گڑھ" مدن نے ذرا تعجب کے لہجہ میں کہا "اچھا آپ ارجن گڑھ کے رہنے والے ہیں"۔

میں نے پوچھا "کیا آپ کبھی ارجن گڑھ گئے ہیں؟"

مدن ابھی کوئی جواب نہ دینے پایا تھا کہ مہندر سنگھ نے کہا:۔

"گئے تو نہیں مگر اب جایا کریں گے۔ وہاں کے سیٹھ پنڈی داس کی بیٹی سے ان کی شادی ہونے والی ہے"۔ پنڈی داس کا نام سن کر میں سناٹے میں آگیا۔

"کہو کوئی چٹھی آئی؟" مہندر نے مدن سے پوچھا۔

"ہاں۔ کل خط آیا۔ ابھی تک وہی حالت ہے۔ بخار کسی وقت نہیں اُترتا"۔ مدن نے جواب دیا۔ میں بڑی توجہ کے ساتھ ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ کون بیمار ہے اور کس کا بخار نہیں اُترتا۔ مگر آپ ہی آپ میرا دل بیٹھا جاتا تھا جب مدن چلا گیا تو میں نے مہندر سے پوچھا کہ "تم کس کا ذکر کر رہے تھے۔ کون بیمار ہے"۔ اس نے کہا "مدن کی منگیتر، پندرہ بیس دن سے اس کی علالت کی خبریں آ رہی ہیں۔ یکایک اختلاج قلب کا عارضہ ہو گیا ہے۔ اب کوئی آٹھ دن سے بخار بھی ہے۔ اسی مہینے میں مدن کی شادی ہونے والی تھی۔ مگر لڑکی کی بیماری کی وجہ سے ملتوی ہو گئی"۔

* * *

پریا کی بیماری نے بہت طول کھینچا۔ چھ مہینے گذر گئے۔ حالت سنبھلتی اور پھر بگڑ جاتی۔ صحت کی اُمید بندھتی اور پھر ٹوٹ جاتی۔ یہ میں جانتا تھا کہ پریا مجھے بہت

چاہتی ہے مگر ایسا بھی خیال نہ تھا کہ میرے بغیر اس کی جان کے لالے پڑ جائیں گے، میری زندگی خود اجیرن تھی۔ مگر میں تنہائی میں بیٹھ کر رو لینے کے سوا کچھ نہ کر سکتا تھا۔ مدن سیٹھ کندن لال کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ماں کا بڑا لاڈلا۔ والدین کو اس کی شادی کا بڑا ارمان تھا اور چاہتے تھے کہ جس قدر جلد ممکن ہو بہو گھر میں آ جائے۔ مگر پریما کی بیماری سے شادی میں تاخیر پر تاخیر ہوتی چلی گئی۔ آخر وہ لوگ زیادہ دنوں تک صبر نہ کر سکے اور مدن کی منگنی پریما سے چھڑا کر مہینے بھر کے اندر اندر کہیں اور اس کی شادی کر دی۔ ادھر مدن کی شادی ہوئی اُدھر پریما کو صحت ہونی شروع ہوئی اور کوئی ۲ دو مہینے میں وہ خاصی تندرست ہو گئی۔ میرا بی۔ اے کا پہلا سال تمام ہو گیا اور میں پریما سے ملنے کی بڑی بڑی آرزوئیں دل میں لے کر گھر آیا۔ مگر پریما کے باپ نے بہت سی مصلحتوں کا لحاظ کرتے ہوئے میرے ارجن گڑھ پہنچنے سے پہلے ہی پریما کو اس کی ماں کے ہمراہ چپ چپاتے کسی پہاڑ پر بھیج دیا اور چھٹیوں کے ختم ہونے تک مجھے یہ بھی پتا نہ چل سکا کہ وہ کہاں ہے۔ مجھے جیسی کچھ مایوسی ہوئی ہو گی آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔ سال بھر تک ملاقات نہیں ہوئی۔ خط بھی اس مدت میں زیادہ نہیں آئے۔ مگر پریما کی محبت طوفان کی طرح بڑھتی ہی چلی جاتی تھی۔ ہم دونوں کی ایک ہی حالت تھی۔ مگر میں پھر آزاد تھا۔ پریما بالکل بے بس تھی۔ اب میرا بی۔ اے کا دوسرا سال تھا۔ امتحان میں تھوڑا ہی زمانہ باقی تھا۔ مجھے اپنی کامیابی کی ذرا بھی امید نہ تھی۔ ہر وقت کی کاہشوں نے مجھے کھا لیا تھا۔ میرا دماغ بالکل بیکار ہو گیا تھا۔ بہر حال امتحان کی تیاری میں مصروف تھا۔ یکایک پریما کا خط آنا بند ہو گیا۔ دو مہینے گذر گئے۔ مطالعہ اب میرے لئے ناممکن تھا۔ ہر وقت پریما کا خیال دل و دماغ پر چھایا رہتا تھا۔ سوتے جاگتے اُس کی تصویر آنکھوں میں پھرتی۔ میں اسی اُدھیڑ بن میں مبتلا تھا کہ کیا کروں کہ ایک دن لائبریری سے واپس آیا تو دیکھا کہ پریما کا خط میری میز پر رکھا ہے۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ اس میں کیا لکھا ہے۔

مگر میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی بڑی مصیبت آنے والی ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے خط کھولا لکھا تھا :۔

"پریتم۔ جس گھڑی کا ڈر تھا آخر آگئی۔ آج برہسپت ہے، آج سے چھٹے دن یعنی منگل کے روز میری شادی ہو جائے گی۔ میں بے بس ہوں۔ تم مرد ہو، تم چاہو تو اب بھی سب کچھ ہو سکتا ہے۔ ورنہ ہم نے تو جو دل میں ٹھانی ہے وہ ٹھانی ہے۔ اس جنم میں تو ملنے کی اب آس نہیں۔ پھر کب ملیں گے، کہاں ملیں گے، کسے خبر۔ بھگوان تمہیں جیتا رکھے، خوش رکھے۔ مرتے دم تک تمہاری۔ پریا"

میرے لئے اس خط میں کوئی نئی بات نہ تھی۔ میں جانتا تھا کہ پریا میری نہیں ہو سکتی پھر بھی اس تحریر کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے بجلی کا تار چھو لیا۔ دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ پریا نے لکھا تھا کہ تم چاہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ مگر میں پریا سے زیادہ بے بس تھا۔ کوئی خطرناک اقدام سوائے اس کے کہ ہم دونوں کی رسوائی اور تباہی کا باعث ہو اور کسی طرح سود مند نہ تھا۔ پریا نے دل میں کیا ٹھانی تھی، اس کا مجھے اچھی طرح اندازہ تھا، مجھے یقین تھا کہ اس کے شوہر کو حجلۂ عروسی میں دلہن کے بجائے ایک لاش ملے گی اس تصور سے مجھے چکر سا آگیا اور اگر میں فوراً بیٹھ نہ جاتا تو لڑکھڑا کر گر پڑتا۔ میں کئی دن تک نہ کالج گیا، نہ کہیں اور، رات دن اپنے کمرہ میں پڑا رہتا۔ اس دوران میں ایک عجیب کیفیت مجھ پر طاری رہی۔ نہ رنج کا احساس تھا نہ تکلیف کا۔ نہ اپنی خبر تھی نہ پریا کی۔ نہ کوئی ارادہ تھا نہ خیال۔ وقت گذر رہا تھا۔ کبھی کبھی رونے کو جی چاہتا۔ مگر جب آنسو نہ نکلتے تو البتہ اذیت ہوتی۔ ہاں میں یہ کہنا بھول گیا کہ کئی مہینے سے پرتھی سنگھ ملازم ہو کر دہلی آگیا تھا۔ مگر کوئی ہفتہ بھر سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، پریا کا خط آئے آج پانچواں دن تھا۔ یعنی منگل۔ آج رات کو پریا کی شادی

ہونے والی تھی۔ شام ہو رہی تھی کہ پرتھی سنگھ آیا اُس نے کہا "ہرنام یہاں اندھیرے میں پڑے کیا کر رہے ہو اور اتنے دنوں سے تم تھے کہاں ؟"
مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یکایک سوتے سے آنکھ کھل گئی۔ حاسّے بیدار ہو گئے۔ پریما، اُس کا خط، اُس کی شادی۔ ایک آنِ واحد میں آنکھوں کے سامنے تھی۔ اب آنسو اُمنڈ کر آئے اور میں پرتھی سنگھ کو لپٹ کر رونے لگا۔ پریما کا خط دکھایا پرتھی سنگھ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر دھیمی آواز سے بولا "ہرنام۔ افسوس! تم نے بہت دیر کی۔ دو ڈھائی گھنٹے میں پریما کی شادی اور موت سب کچھ ہو چکے گا۔ مگر دیکھو اب ہمت سے کام لینے کا وقت ہے۔ تم اگر اپنی جان بھی دے دو تو اب کچھ حاصل نہیں"۔ پرتھی سنگھ کہہ رہا تھا۔ میں خاموش بیٹھا سُن رہا تھا۔ مگر آنسو کسی طرح نہ تھمتے تھے۔ کلیجہ کے ٹکڑے ہو جاتے تھے۔ اتنے میں کسی کے پاؤں کی آہٹ سُنائی دی۔ میں نے قمیص کے دامن سے اپنے آنسو پونچھے۔ آنے والا بورڈنگ ہاؤس کا چپراسی تھا۔ اُس نے کہا "سردار جی، ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں، اور اکیلے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں، بہت ضروری کام ہے"۔ میں حیران تھا کہ یہ آنے والا کون ہے، کیا کام ہے اور تنہائی میں ملنے کی کیا ضرورت ہے۔ پرتھی سنگھ نے مجھے اور میں نے پرتھی سنگھ کو دیکھا۔ پھر پرتھی سنگھ نے کہا "میں برآمدہ میں بیٹھا جاتا ہوں تم اُنہیں کمرہ میں بلا کر مل لو"۔ دو منٹ کے بعد ایک نوجوان جس کی پگڑی، کوٹ، قمیص، شلوار سب کپڑے سفید تھے، میرے کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے آج سے پہلے اُسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُس نے کمرہ میں داخل ہوتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ میں حیران تھا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھنے لگا۔ اجنبی میری طرف بڑھا اور قبل اس کے کہ میں اپنی جگہ سے جنبش کروں، اُس کی باہیں میری گردن میں اور اُس کا سر میرے سینہ پر تھا، اُس نے آہستہ سے کہا "پریتم" "مجھے ایسا محسوس

ہوا، جیسے بجلی کی ایک لہر میرے سارے بدن میں دوڑ گئی ۔ میں پلنگ پر بیٹھ گیا
پریا میرے آغوش میں سسکیاں لے رہی تھی ۔

---×××---

ہم تینوں نے وہ رات پرتھی سنگھ کے مکان پر گذاری ۔ دوسرے دن پرتھی سنگھ نے پریا کو اپنی بہن بتا کہ اندر پرست گرلس ہائی اسکول کے بورڈنگ میں داخل کر دیا ۔ اور مجھے سخت تاکید کر دی کہ ہفتہ بھر تک کالج کے سوا بورڈنگ ہاؤس سے کہیں نہ جاؤں دو دن کے بعد ارجن گڑھ کا تھانہ دار، اور دو سپاہی، دہلی پولیس کے ایک افسر کے ساتھ اچانک میرے کمرہ میں آداخل ہوئے ۔ ہمیں پہلے سے اُن کی آمد کا انتظار تھا، وہ پریا کی تلاش میں تھے ۔ اور مجھے اُس کے فرار کا ذمہ دار خیال کرتے تھے ۔ باتیں تو بہت ہوئیں، مگر نتیجہ معلوم ۔ آخر ناکام واپس گئے ۔ اس کے بعد کئی دن تک خفیہ طور پر میری نقل و حرکت کی نگرانی کرتے رہے، مگر بے سود ۔ آٹھ دن کے بعد میں پرتھی سنگھ کے مکان پر پریا سے ملا ۔ تنہائی تھی، آزادی تھی، اطمینان تھا، ہماری زندگی میں سچی خوشی کا یہ پہلا دن تھا ۔ ایک دن اور ایک رات ہمیں باتیں کرتے ہی گذر گئے ۔

---×××---

بی ۔ اے کا نتیجہ نکل آیا ۔ میں فیل ہو گیا ۔ چچا کو میں نے لکھا کہ بیماری نے امسال کام کرنے کا موقع نہ دیا ۔ اب گرمیوں کی چھٹیاں دہلی ہی میں گذاروں گا، تاکہ اچھی طرح تیاری کر سکوں ۔ چچا بیچارے راضی ہو گئے ۔ چھٹیاں ختم ہو گئیں اور پریا پھر اپنے بورڈنگ ہاؤس میں چلی گئی ۔ اس سال کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا ۔ میں نے پھر بی ۔ اے کا امتحان دیا اور پاس ہو گیا ۔ فوراً ہی یہاں اسکول میں نوکری مل گئی اور میں پریا کو لے کر یہاں آگیا ۔ میں چاہتا تھا کہ وطن سے دور کسی گمنام جگہ میں رہوں ۔

امرت پور سے دونوں مقصد پورے ہو گئے، یہاں کے لوگوں کو ہمارے متعلق کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں ہوا۔ اور اگر یہ نیک بخت روپ کور یہاں نہ آئی ہوتی تو آئندہ بھی کسی کو کانوں کان کچھ خبر نہ ہوتی۔ اُس روز آپ تو آفس سے چھتری لینے چلے گئے اور میں باہر کھڑا آپ کا انتظار کر رہا تھا کہ یکایک کسی نے پیچھے سے نام لے کر مجھے پکارا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، یہ روپ کور تھی۔ اُس نے کہا "ہرنام مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔ ذرا میرے خیمہ میں چلو۔" میں انکار نہ کر سکا۔ خیمہ اکیلا تھا۔ ہم بیٹھ گئے۔ روپ کور کے چہرہ پر اس وقت غصّہ کے بجائے مہربانی کے آثار تھے۔ اُس نے بڑی نرمی سے پوچھا "ہری تم یہاں کب آئے؟" میں نے کہا "تھوڑے ہی دن ہوئے۔" کہا "پریما اچھی ہے۔" اُس کے مُنہ سے پریما کا نام سُن کر میرا خون خشک ہو گیا۔ مگر میں نے خود کو سنبھالا اور فوراً جواب دیا:-

"خدا کرے اچھی ہو"

"اچھی ہو۔ خوب۔ گویا وہ تمہارے ساتھ نہیں؟"

"میرے ساتھ! میرے ساتھ کیسے"

"ہم نے تو یہی سُنا تھا"

"جانے دے روپو۔ اس طرح ستانے سے کیا فائدہ"

"اچھا تو پھر کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم"

روپ کور یہ سُن کر خاموش ہو گئی اور کئی منٹ تک سوچتی رہی، پھر بولی۔

"کیا تم یہاں اکیلے ہو؟"

"نہیں، بیوی بھی ساتھ ہے"

"آہا۔ بیوی سے اتنا پریم کب سے ہو گیا؟"

"پرم ہو یا نہ ہو، دنیاداری کرنی ہی پڑتی ہے"
"کیا تم اب بھی مجھ سے خفا ہو؟"
"میں تو تم سے کبھی بھی خفا نہ تھا"

وہ پھر خاموش ہو گئی۔ ایک مبہم خوف لمحہ بہ لمحہ مجھ پر طاری ہوتا جا رہا تھا۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ مجھے سخت الجھن ہو رہی تھی۔ وہ یکایک کھڑی ہو گئی اور بولی "اچھا ہری فرصت ملے تو شام کو آنا۔ میں کل صبح چلی جاؤں گی"۔ میں خدا کا شکر کرتا ہوا اس کے خیمہ سے نکلا۔ آپ کو دیکھنے دفتر میں گیا۔ آپ جا چکے تھے۔ میں دفتر سے نکل رہا تھا کہ اس جلسہ کے سکریٹری صاحب آ گئے اور وہ مجھے اپنے ہمراہ لے گئے۔ کوئی پندرہ منٹ وہاں ٹھیرنا پڑا۔ جس وقت گھر پہونچا تو مجھے دروازہ ہی سے کسی کے زور زور سے بولنے کی آواز سنائی دی، میں سہم گیا اور اندر پہنچکر جو منظر دیکھا، اس نے اور بھی میرے ہوش اڑا دیئے، کیا دیکھتا ہوں کہ روپ کور ایک غضب ناک شیرنی کی طرح گرج رہی ہے، اور پریما ایک گنہگار کی طرح ہاتھ جوڑے اس کے سامنے کھڑی آنسو بہا رہی ہے۔ مجھے دیکھ کر روپ کور اور بھی آپے سے باہر ہو گئی۔ اور کڑک کر بولی :-

"کیوں، یہی ہے تیری بیوی۔ "پریما کہاں ہے۔ مجھے نہیں معلوم" آدمی جھوٹ بولے تو اتنا تو بولے۔ شرم تو نہ آتی ہو گی۔ ایک شریف گھر کی بیٹی کو آوارہ کرنا، بدمعاشوں کی طرح بھگا لے جانا۔ اور پھر اسے اپنی بیوی ظاہر کر کے معتبر بننا، آخر کمینہ پن کی کوئی انتہا بھی ہے۔ یہ ہیں اسکول کے سکنڈ ماسٹر صاحب، لڑکوں کے اخلاق سدھارنے والے۔ جہاں کے استاد ایسے ہوں گے، وہاں کے شاگردوں کا کیا کہنا۔ کمیٹی والے بھی اندھے ہیں، جو ایسے لفنگے بدمعاشوں کو ٹیچر بناتے ہیں۔ دیکھ ابھی تیری ساری قلعی کھولے دیتی ہوں۔ عورت کی محبت کو ٹھکرا دینا کھیل نہیں"

روپ کور غصہ کے مارے کانپ رہی تھی۔ اس کا چہرہ سیاہ ہو گیا تھا۔ پریما خوف کے مارے ایک سوکھی ہوئی پتی کی طرح لرز رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ روپ کور پر میری منت وسماجت کا اُلٹا اثر ہو گا۔ پریا کی گریہ وزاری سے اُس کی آتشِ انتقام اور بھی بھڑک اٹھی تھی۔ میں نے بھی ذرا بلند آواز سے درشت لہجہ میں کہنا شروع کیا۔

"ضرور ضرور۔ دل میں کوئی حسرت نہ رہ جائے۔ ساری دنیا کو دکھا دو کہ عورت کی محبت صرف اپنے نفس کی آگ بجھانے کے لیئے ہوتی ہے۔ یہ نہیں تو کچھ نہیں کیسی محبت، کس کا پریم۔ جس مرد نے عورت کی ہوس کو ٹھنڈا نہ کیا اُس نے اپنی قبر آپ کھود لی۔ روپو تو کیا جانے محبت کیا چیز ہے۔ محبت کو دشمنی سے کیا علاقہ محبت قربانی کو کہتے ہیں۔ مگر وہ صرف ایک مرد کر سکتا ہے۔ عورت نہیں، عورت کی محبت صرف تباہی لا سکتی ہے۔ عورت صرف انتقام لینا جانتی ہے۔ سچ ہے جس سے محبت ہو اُسے برباد نہ کیا تو کیا کیا!"

تیر ٹھیک نشانہ پر لگا۔ روپو چوٹ کھا گئی۔ اُس کا غصہ سرد پڑ گیا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ میں آگے بڑھا اور اپنے دونوں ہاتھ اُس کے کاندھوں پر رکھ کر پھر کہنا شروع کیا:۔

"روپو۔ آخر تو کیا چاہتی ہے۔ میری موت؟ مگر کیا تجھے یقین ہے کہ میری موت سے تجھے وہ خوشی نصیب ہو جائے گی جو تجھ سے چھن گئی ہے۔ نہیں روپو یہ تیری بھول ہے، میری موت سے تو خوش نہیں ہو سکتی۔ سوچ کے دیکھ۔ تھوڑی دیر کے لیئے فرض کر لے کہ میری خون میں ڈوبی ہوئی لاش تیرے سامنے پڑی ہے۔ کیا اس تصور سے تجھے چین ملتا ہے، خوشی ہوتی ہے؟ یقیناً نہیں۔ میں تجھے تیرے ارادہ سے روکنا نہیں چاہتا۔ مگر اتنا سمجھ لے کہ یہ بھید کھُل جانے کے بعد میرا ٹھکانا صرف موت کی گود ہے!!"

روپو کا سر جھک گیا۔ وہ اپنے فعل پر نادم تھی۔ اُس نے پھر سر اُٹھایا۔ اُس کی

آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ اُس نے میرے ہاتھ اپنے کاندھوں سے جُدا کئے اور اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر آہستہ سے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا: "ہری میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی!" اتنا کہا اور خاموشی کے ساتھ گھر سے باہر نکل گئی۔ میں اور پریا دونوں مبہوت کھڑے رہ گئے۔ اس روز شام کو آپ کے یہاں آنے سے پہلے میں کیمپ گیا کہ دیکھوں روپ کور کس رنگ میں ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ دوپہر ہی کی گاڑی سے ارجن گڑھ چلی گئی۔ چچا آج کل چھٹی لے کر گھر آئے ہوئے ہیں۔ آج تیسرے پہر اُن کا خط ملا۔" یہ کہہ کر ہرنام سنگھ نے ایک لفافہ جیب سے نکالا۔ لیکن اندھیرا ہو چکا تھا۔ اس لئے خط پڑھا نہ جا سکا۔ اُنہوں نے اُس کا خلاصہ زبانی بیان کیا:۔

"روپ کور نے تمہارا سارا کچّا چِٹھا کھول دیا۔ ابھی پنڈی والوں کو معلوم نہیں معلوم ہو جائے گا۔ پولیس جلد تمہاری گرفتاری کے لئے امرت پور پہونچے گی۔ تم نے سارے خاندان کی ناک کاٹ دی۔ ہمیں سر اُٹھانے کے قابل نہ چھوڑا۔ خیر جو کیا، اچھا کیا۔ اب اس کا نتیجہ بھی دیکھ لو گے۔ خیریت اسی میں ہے کہ اس عورت (پریما) کو وہاں سے نکال دو، ہمیں اب خط نہ لکھنا۔ ہم نے سمجھ لیا کہ آج تم مر گئے۔"

اس کے بعد ہرنام سنگھ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"میں یہ خط پریا کو دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اُس نے اصرار کیا۔ میں نے دیدیا اُس نے پڑھا اور ہائے رام کہہ کر مجھے چمٹ گئی۔ پھوٹ پھوٹ رونے لگی۔ روتے روتے بے حال ہو گئی۔ میں نے ہر چند اُسے تسلّی دی۔ مگر اُس کے آنسو کسی طرح نہ تھمتے تھے۔ بچی کو اُٹھا لائی اور میری گود میں ڈال دیا اور پھر مجھے چمٹ گئی۔ اُس

وقت سے اس کی عجیب حالت ہے۔ سودائیوں کی طرح کبھی اٹھتی ہے کبھی بیٹھتی ہے۔ کبھی ٹہلنے لگتی ہے۔ چپ ہو جاتی ہے۔ پھر رونے لگتی ہے۔ ابھی جیپ میں یہاں آنے لگا تو پھر میری آستین پکڑ کے کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی "مجھے چھوڑ کے نہ جاؤ، مجھے اپنے ہاتھ سے مار ڈالو۔ مگر اکیلا نہ چھوڑو۔ میرا دنیا میں کوئی نہیں"۔ بڑی مشکل سے یہ وعدہ کر کے آیا ہوں کہ گھنٹہ بھر میں واپس آجاؤں گا۔ کہئے اب کیا کروں"

میں نے کہا "میرے نزدیک تو سب سے محفوظ جگہ دہلی ہے۔ وہیں اندرپرست کے بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرا دو۔ مگر فوراً چلا جانا چاہئے"

"مگر وہ لوگ شادی شدہ لڑکیوں کو نہیں لیتے۔ بالفرض لے بھی لیں تو بچی کا کیا بندوبست کیا جائے۔ بچہ کو بورڈنگ میں رکھنے کی تو ہرگز اجازت نہ ملے گی"

"تو اس صورت میں بچہ کے لئے کسی قریب کے گاؤں میں دایہ کا انتظام کرنا پڑے گا"

"دایہ کا انتظام تو ہو سکتا ہے۔ مگر ماں اس ننھی سی جان کو جدا کرنا کیسے گوارا کرے گی"

"میں خود یہی سوچ رہا ہوں۔ مگر اب اس کے سوا چارہ کیا ہے؟"

سردار ہرنام سنگھ نے گھر جا کر پریا کو ہمارے مشورہ سے آگاہ کیا۔ وہ اپنی بچی کی جدائی کے خیال سے تڑپ گئی۔ رات بھر آنکھوں سے آنسو نہ تھما۔ ہمارے اسکول کا ڈرائنگ ماسٹر تیجا سنگھ قریب ہی کے ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ اسے کچھ دے دلا کر اس پر آمادہ کیا کہ بچی اس کی بیوی کی حفاظت میں رہے اور یہ راز کسی پر ظاہر نہ ہو۔ انگرلپہ ریل کا اسٹیشن نہیں۔ کھنڈا کرالے تک پیدل یا گھوڑے پر جانا پڑتا ہے، دوسرے دن رات کے تین بجے امرت پور سے روانگی قرار پائی۔ تاکہ چپ چپاتے نکل جائیں۔ چاندنی آخری تاریخیں تھیں۔ پچھلے پہر جب ہم لوگ سو کر اٹھے تو چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ گھوڑے

تیار تھے۔ تیجا سنگھ کی بیوی شہر بانو کو لینے کے لئے رات ہی کو آگئی تھی۔ میں نے فراق کا ایسا دل دوز منظر اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ پریا اپنی بچی کو کلیجہ سے چمٹائے ہوئے تھی۔ دیوانہ وار بار بار اُس کا منہ چومتی تھی۔ بلند آواز سے رو بھی نہ سکتی تھی۔ گھٹی گھٹی آواز نکلتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس غم سے اس کا دم نکل جائے گا۔ کبھی بچی سے خطاب کر کے کہتی "ننھی اب کب ملو گی میری جان۔ مجھے بھول نہ جانا بی بی۔ اس جنم میں نہیں تو اگلے جنم میں ملیں گے۔ میں تو تجھے فوراً پہچان لوں گی۔ یہ پیاری صورت کیا میں بھول سکتی ہوں۔ ننھی میرے پیچھے رونا نہیں۔ میں جلد آ جاؤں گی"۔ کبھی آسمان کی طرف مُنہ اُٹھاتی اور ایک درد بھری آواز سے کہتی "پرماتما پاپ تو میں نے کیا ہے۔ مگر اس ننھی سی معصوم جان کا کیا قصور ہے جو ماں کی گود اس سے چھن گئی"۔ پریا اسی فریاد و زاری میں مصروف تھی کہ ہرنام سنگھ نے کہا "اب وقت زیادہ نہیں جلدی کرو"۔ یہ کہا اور بچی کو پریا سے لے کر تیجا سنگھ کی بیوی کی گود میں دے دیا۔ پریا کے قدم ڈگمگا رہے تھے، ہرنام سنگھ نے سہارا دیکر اُسے سنبھالا اور گھوڑے پر سوار کیا۔ ہم دونوں بھی سوار ہو گئے، پریا نے کہا "میری ننھی کو ادھر لاؤ۔ آخری پیار تو کر لوں"۔ پھر بچی کو سینہ سے لگایا۔ مُنہ چوما اور کہا "جاؤ بی بی پرماتما کو سونپا"۔

آگے آگے میں اور پیچھے پیچھے پریا اور ہرنام سنگھ۔ اس طرح یہ تین سواروں کا قافلہ آخر شب کی خاموشی اور چاندنی کی زرد پھیکی روشنی میں امرت پور سے روانہ ہو گیا۔ ہم تینوں خاموش تھے۔ ریتیلے میدان میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز بھی سُنائی نہیں دیتی تھی۔ ابھی کوئی دو ڈھائی میل گئے تھے کہ مجھے اپنے پیچھے کسی چیز کے زور سے گرنے کی آواز سُنائی دی۔ ساتھ ہی ہرنام سنگھ نے گھبرا کر زور سے کہا "ارے"۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ پریا گھوڑے سے گر پڑی تھی۔ ہرنام سنگھ نے دوڑ کر اُٹھایا۔ وہ بیہوش تھی میں نے کہا لٹا دو۔ ہرنام سنگھ نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ قمیص کے بٹن کھول دیئے

میں دو قدم ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ پریما کئی منٹ بیہوش رہی۔ ہم دونوں سخت مضطرب تھے یکایک پریما نے آنکھیں کھولیں اور نہایت کمزور آواز میں کہا "نھی۔ ہائے نھی"۔ ہرنام سنگھ نے پوچھا کہیں چوٹ تو نہیں لگی۔ پریما نے جواب دیا مجھے کچھ خبر نہیں۔ پندرہ منٹ کے بعد ہم پھر روانہ ہو گئے، ہرنام سنگھ اور پریما دونوں ایک گھوڑے پر آگے آگے۔ اور میں دوسرے گھوڑے پر اُن کے پیچھے۔ تیسرے گھوڑے کی لگام بھی میرے ہاتھ میں تھی۔ اس طرح ہم دن نکلنے سے پیشتر کھڈاکرالا پہونچ گئے۔ میں ان لوگوں کو ریل میں بٹھا کر امرت پور واپس آ گیا۔

پریما کو اندرپرست گرلس ہائی اسکول دہلی کے بورڈنگ میں داخل کرا کے ہرنام سنگھ چوتھے دن امرت پور لوٹ آئے۔ قصبہ میں ہر طرف اُن کے واقعات کا چرچا تھا۔ اسکول والوں نے انہیں نوٹس دے دیا۔ میں بھی ان کی رفاقت میں ملازمت سے دست بردار ہو گیا۔ ہم دونوں کے چلے جانے کے بعد کمرجی بھی اسکول میں ٹھیرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے ہمارے ساتھ ہی اُنہوں نے بھی استعفا دے دیا۔ انگریزی مہینے کی پہلی اور دوسری تاریخ کی درمیانی رات میں پھر تین مسافر گھوڑوں پر سوار اس ریگستانی علاقہ میں جہاں حدِ نظر تک ریت کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا، خاموشی کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ ہرنام سنگھ کو میں اپنے ساتھ رام پور لے گیا۔ وہاں اُنہوں نے بڑی محنت سے ایم۔ اے کی تیاری شروع کر دی۔ مگر ان مسلسل پریشانیوں سے اُن کی صحت خراب ہو گئی تھی۔ انہیں ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا تھا۔ امتحان میں ابھی کئی مہینے باقی تھے۔ اُنہیں کرتار پور (ضلع فیروز پور) کے ایک مڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹری مل گئی اور وہ رام پور سے اپنی ملازمت پر چلے گئے۔ پریما دہلی ہی میں تھی۔ کیونکہ اُسے ساتھ رکھنا ہنوز خطرے سے خالی نہ تھا۔ کرتار پور گئے ابھی ایک ہی مہینہ گذرا تھا کہ

ہرنام سنگھ یکایک زیادہ بیمار ہو گئے۔ مگر کچھ دنوں میں پھر طبیعت سنبھل گئی، اسی دوران میں وہ اپنی بچی کو دیکھنے امرت پور گئے۔ وہاں سے واپس آ کر مجھے لکھا کہ :-

"بچی بہت بیمار ہے، سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے، جس وقت میں پہنچا تو میلے کچیلے گودڑ میں لپٹی ہوئی پڑی بلک بلک کر رو رہی تھی، کوئی اُس کے پاس نہ تھا۔ منہ پر مکھیوں کے چھتے تھے۔ یہ حالت دیکھ کر میرا دل پھٹنے لگا۔ میں نے اُسے اُٹھا لیا۔ سینہ سے لگا کر پیار کیا، وہ فوراً چپ ہو گئی۔ مجھے غور سے دیکھنے لگی اور ایک خفیف سی مسکراہٹ اُس کے معصوم ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔ گویا اُس نے مجھے پہچان لیا، پریم۔ اس منظر کو دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ بہت ضبط کیا مگر آنسو نہ رُک سکے۔ تیجا سنگھ کی بیوی کو میں کافی روپیہ ننھی کی پرورش کے لئے دے آیا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اُس بدبخت عورت نے ایک پیسہ بھی اُس پر صرف نہیں کیا۔ اب قریب کے گاؤں میں ایک اور بیوہ عورت کے سپرد کر آیا ہوں۔ پریما کو میں نے یہی لکھ دیا ہے کہ شہر بانو بالکل اچھی ہے۔ وہ اپنی بچی کے لئے بہت تڑپتی ہے۔ کچھ بنائے نہیں بنتی۔"

ہرنام سنگھ کی علالت روز بروز بڑھتی گئی۔ وہ مہینے بھر کے بعد پھر اپنی بچی کو دیکھنے گئے۔ جس وقت وہاں پہونچے اُس کے آدھے گھنٹے کے بعد بچی نے دم توڑ دیا۔ اُن کے دل پر جو کچھ گذری ہوگی، ایک صاحب اولاد ہی اس کا احساس کر سکتا ہے۔ اُنہوں نے بچی کی موت کو پریما سے پوشیدہ رکھا اور اُسے پھر یہی لکھ دیا کہ "میں خود دیکھ آیا ہوں ننھی بالکل تندرست ہے۔"

اب میرا قیام بریلی میں تھا۔ ہرنام سنگھ بیماری کے باوجود ایم۔ اے کا امتحان

دینے لاہور گئے اور فارغ ہو کر جب کرتار پور واپس آئے تو مجھے خط لکھا کہ "پرچے اچھے ہو گئے"۔ اس کے بعد ان کا کوئی خط نہیں آیا۔ دنوں سے ہفتے اور ہفتوں سے مہینے گذر گئے۔ اسی زمانہ میں میری والدہ کا انتقال ہو گیا۔ میں خود اپنی پریشانیوں میں مبتلا تھا۔ اس لئے بہت دنوں تک خط نہ لکھ سکا۔ پھر جب لکھا تو جواب نہ آیا۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا کہ اس طویل خاموشی کا باعث کیا ہے۔ کچھ دنوں بعد میں تعلیم کی غرض سے لاہور چلا گیا۔ تین مہینے یہاں بھی گذر گئے مگر ہرنام سنگھ کی کوئی خبر نہ ملی۔ ایک دن شام کے وقت لوہاری دروازے جاتے ہوئے نہر کے کنارے ایک اجنبی شخص نے مجھے سلام کیا اور ٹھہر گیا۔ میں نے اسے بالکل نہیں پہچانا۔ پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ "میرا نام رتن سنگھ ہے۔ میں نے امرت پور کے اسکول میں آپ سے پڑھا ہے اب انٹرنس پاس کر کے دیال سنگھ کالج میں آ گیا ہوں"۔ میں نے امرت پور کے لوگوں خصوصاً اسکول کے سب ماسٹروں کا حال فرداً فرداً پوچھا اور وہ بتلاتا رہا۔ خدا جانے کیوں ہرنام سنگھ کا نام لیتے ہوئے ایک مبہم خوف میری زبان پکڑے لیتا تھا۔ آخر میں نے پوچھا:۔

"اور ہرنام سنگھ کہاں ہیں؟"

"ہرنام سنگھ! ہرنام سنگھ تو کئی مہینے ہوئے فوت ہو گئے۔ وہ بہت دنوں سے کرتار پور خالصہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ انہیں دق ہو گئی تھی۔ اسی میں انتقال ہوا۔ شاید آپ کو معلوم ہو انہوں نے ایم۔ اے کا امتحان دیا تھا۔ نتیجہ اُن کے مرنے کے دو دن بعد آیا۔ وہ پاس ہو گئے تھے"۔

یہ سننا تھا کہ میرا دل دھک سے ہو گیا۔ جو صدمہ مجھے اُس وقت ہوا اُس کا اظہار میرے بیان کی قدرت سے باہر ہے۔ میں نے ہرنام سنگھ کے چچا سردار ہردیو سنگھ کو تعزیت کا خط لکھا۔ اُنہوں نے فوراً جواب دیا۔ ہردیو سنگھ کا ایک جوان بیٹا ہے،

سندر سنگھ، اُس نے مجھے علیحدہ خط لکھا اور ان تعلقات کے باقی رکھنے کی خواہش کی جو میرے اور مرحوم ہرنام سنگھ کے درمیان تھے۔ ہماری مراسلت جاری ہوگئی۔ دسمبر سنہ ۱۹۲۴ء میں کرسمس کی تعطیل میں میں نے سندر سنگھ کو لاہور بلایا۔ وہ آیا اور ہفتہ بھر میرا مہمان رہا۔ ایک دن میں نے اُس سے پوچھا کہ پریما کہاں ہے۔ اُس نے کہا کہ کچھ پتا نہیں۔ بھیا کے مرنے کے بعد بابا نے کہا کہ "جو ہونا تھا ہوا۔ اب وہ ہماری عزت ہے، اُسے لے آؤ" میں دہلی گیا۔ بورڈنگ کی سپرنٹنڈنٹ نے بتایا کہ پریما تو پانچ چھ مہینے سے "لاپتا" ہے۔ اُس کے پاس ایک خط کہیں سے آیا تھا۔ اُسے پڑھ کر دو دن رات برابر روتی رہی۔ کھانا پینا ترک کر دیا تھا، ہر چند اس سے پوچھا، مگر اُس نے کچھ نہ بتایا۔ ہرنام سنگھ کو تار دیا گیا مگر وہاں سے کوئی جواب نہ آیا۔ تیسرے دن صبح کو دیکھا تو پریما کا کمرہ خالی تھا۔ بہت تلاش کی۔ کچھ پتا نہ چلا۔ پولیس میں اطلاع کی۔ کچھ نتیجہ نہ ہوا۔ اُس کی گم شدگی کا سبھی کو افسوس ہے۔ ایسی نیک بخت اور محبت کرنے والی لڑکی ایک بھی اسکول میں نہیں آئی۔ خیال یہ ہے کہ شاید اُس نے جمنا میں ڈوب کر یا اور کسی طرح خودکشی کر لی۔ یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

* * *

سچی کہانی

مولینا

سنہ ۱۹۲۵ء کی گرمیاں ختم ہو رہی تھیں کہ چیفس کالج لاہور کے پرنسپل مسٹر کیلی کی سفارش پر پنجاب گورنمنٹ نے مجھے نواب صاحب دُجانہ کا اتالیق مقرر کیا۔ اطلاع ملتے ہی دُجانہ پہونچ کر میں نے اپنے کام کا چارج لے لیا۔

دُجانہ دہلی سے کوئی ساٹھ ستر میل کے فاصلے پر ایک خود مختار ریاست ہے چھوٹی سی بستی، کوئی چار ہزار کی آبادی۔ بس ایک بڑا سا گاؤں سمجھنا چاہیئے۔ ہمارے رہنے کے لئے عالی شان کوٹھی جس میں ہم سے پہلے جنات اور شہید رہتے تھے۔ سواری کے لئے موٹر، گھوڑے، اونٹ۔ بیلوں کے تانگے، بکروں کی گاڑی جو ہمارے نواب صاحب کے والد مرحوم نے بڑے شوق سے خود اپنے لئے بنائی تھی۔ شکار اگر نواب صاحب کی طرح پلنگ پر بیٹھے لیٹے کھیلنا مقصود ہو تو STICK GUN (اسٹک گن) اور بے شمار ھوسطے جنہوں نے باغ کے مالیوں کو عاجز کر دیا تھا۔ ورنہ جنگل میں ہرنوں کے جھنڈ کے جھنڈ جن میں سے کبھی ایک بھی ہماری بندوق سے نہیں مرا۔ کھانا نے بہتر سے بہتر، خدمت کے لئے چار چار نوکر مگر مائیں تو کم یار پسند خدمتگار دیوثیے۔ بوبک۔ غرض آسایش کے سب سامان مہیا تھے مگر دو آدمی

نہ تھے ۔ سخت وحشت ہوئی اور ہم جنس کی تلاش ۔ جویندہ یابندہ ۔ دو ہفتہ کی جستجو کے بعد پتا چلا کہ دُجانہ میں ایک بزرگ ہیں، مولینا سلیم الدین صاحب جن میں وہ سب خوبیاں موجود ہیں جن کی بنا پر ایک انسان دوسرے کی محبت اور احترام پر مجبور ہو جاتا ہے ۔ دوسرے دن میں اُن سے ملا ۔ جیسا سُنا تھا اس سے بہتر پایا ۔ کوئی پچاس سال کا سن، دراز قامت، چھریرا بدن، کتابی چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، ٹیک نقشہ، گوری رنگت، سفید ڈاڑھی جس سے صورت نہایت ہی نورانی معلوم ہوتی تھی۔ عالم باخبر، مگر ظاہر کی قیود سے آزاد ۔ خوش ذوق، خوش سلیقہ، خوش اخلاق، خوش گفتار، گانے کے عاشق، ستار بہت اچھا بجاتے تھے، تنہا تھے، شادی نہیں کی تھی، اُن کی ذات خاص وعام کا مرجع تھی ۔ ہر وقت ان کے یہاں ایک دربار سا لگا رہتا ۔ کوئی دعا کے لئے آتا ۔ کوئی بیگم صاحبہ اور دیوان ریاست کے نام سفارشی خط لکھواتا ۔ کوئی فیضانِ صحبت کی غرض سے، کوئی اُن کے ستار کی خاطر، اور کوئی فقط چائے کے لالچ میں حاضری دیتا، چائے کا دور ہر وقت چلتا رہتا تھا اور ہر شخص اُس میں شریک ہو سکتا تھا ۔ مگر ستار کی صحبت صرف چند احباب کے لئے مخصوص تھی۔

مولینا رات دن میں تین گھنٹے سے زیادہ نہ سوتے تھے ۔ ریشم کا نفیس تہمد باندھے، بڑا سا تولیہ اوڑھے، سُنہری فریم کی عینک لگائے، ایک چوکی پر بیٹھے اپنی پُرمغز اور دلچسپ باتوں سے حاضرین کو مستفید اور محظوظ کیا کرتے تھے ۔ دُجانہ میں وہ کبھی کسی کے یہاں نہیں جاتے تھے ۔ دس، بارہ ۱۲ برس سے اسی طرح گوشہ نشین تھے ۔ اُن کی آمدنی کے ذرائع نامعلوم تھے ۔ اور خرچ اُجلا ۔ اسی لئے دُجانہ کے جاہل اور عجائب پرست لوگوں میں اُن کے متعلق طرح طرح کی روایتیں مشہور تھیں ۔ کوئی کہتا "دست غیب" ہے ۔ کوئی کہتا "کیمیا" بناتے ہیں ۔ کوئی کہتا "ہمزاد" تابع ہے ۔ کوئی کہتا "حاضرات" کے عامل ہیں ۔ کوئی کہتا "بیگم صاحبہ ان کی مرید ہیں، وہی ان کے

سارے مصارف کی کفیل ہیں۔" ایک روایت یہ بھی سنی کہ جوانی میں ایک طوائف ان پر عاشق ہوگئی تھی، ایک لمحہ کے لئے اپنے سے جدا نہ کرتی تھی بمبئی کے سفر میں یکایک مرگئی اور اس کا تمام زیور اور بے شمار نقد روپیہ ان کے پاس رہا۔ بایں ہمہ دُجانہ کے تمام لوگ ان کے بیحد معتقد تھے اور بعض تو اُن کی کرامت کے بھی قائل تھے۔ احترام کی وجہ سے کوئی اُن کی غیبت میں بھی اُن کا نام نہ لیتا تھا۔ سب "حضرت جی" کہتے تھے۔ چند ہی روز میں حضرت جی مجھ سے اس قدر مانوس ہوگئے کہ میں کسی دن نہ جاتا تو بلا بھیجتے۔ میرے لئے بھی اُس "جانورستان" میں اُن کی صحبت ایک بڑی نعمت تھی۔ رفتہ رفتہ تعلقات اتنے بڑھے کہ میری فرصت کی تمام ساعتیں اُنہیں کے مکان پر گذرنے لگیں، مولینا نے دل بہت درد مند پایا تھا۔ ستار بجاتے بجاتے یکایک بیتاب ہوجاتے۔ اور آنسوؤں کے قطرے اُن کے رخساروں پر ڈھلکنے لگتے۔ کبھی کبھی کوئی فراقیہ شعر سُن کر بالکل بے خود ہوجاتے۔ اُن دنوں میری خود یہی حالت تھی۔ چاندنی راتوں میں جب ہر طرف خاموشی چھائی ہوتی تھی اُن کے ستار کے درد بھرے نغمے سینے میں جذبات کا ایک طوفان برپا کردیتے تھے اور میری آنکھیں بھی نمناک ہوئے بغیر نہ رہتیں۔ مولینا کو میں نے اپنی داستانِ غم کبھی نہیں سُنائی تھی۔ اور نہ اُن کی زندگی کے کسی ناکام رومان کا حال مجھے معلوم تھا۔ پھر بھی ہم دونوں ایسا محسوس کرتے تھے جیسے ایک دوسرے کے رازدار ہیں اور اس احساس کی بنا پر باہمی اعتماد روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ ضبطِ غم سے میرا کلیجہ پھٹا جاتا تھا۔ آخر ایک دن میں نے اپنی رُودادِ الم مولینا کو سُنادی۔ مولینا بیحد متاثر ہوئے میں نے دیکھا اُن کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔

ایک مہینا اور گذر گیا اور ہم پہلے سے زیادہ قریب ہوگئے۔ مولینا سراپا اخلاص محبت تھے، میں خلوص کا بندہ، قدرتاً خصوصیت بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ رات کو دس گیارہ بجے کے بعد جب لوگ اُٹھ جاتے، میں بیٹھا رہتا اور مولینا اپنی زندگی کے مختلف

دوروں کے دلچسپ واقعات سنایا کرتے - ایک مرتبہ جبکہ رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی اور سب لوگ جا چکے تھے - مولینا نے مجھ سے خواہش کی کہ اپنے کچھ اشعار سناؤں، میں نے یہ شعر پڑھا ؎

بھول جاتا ہوں کہ محرومِ تمنا ہوں میں
یاد آتی ہے جو مرحوم تمناؤں کی

اُس زمانہ میں میری آواز قیامت تھی - بلا کا سوز، غضب کا درد تھا - مولینا یہ شعر سُن کر بالکل مبہوت ہو گئے اور خود میں بھی کھو گیا - کئی منٹ تک ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے - آخر میں نے ہی کہا :-

"مولینا بہت دنوں سے ایک بات پوچھنے کی تمنّا ہے، مگر ہمت نہیں پڑتی"!

مولینا نے کہا "تعجب ہے کہ آپ اور مجھ سے کوئی بات پوچھتے ہوئے جھجکیں"

میں نے کہا "آپ نے شادی کیوں نہیں کی ؟"!

معلوم ہوا کہ ان چند لفظوں نے مولینا کو پھر کسی دوسری دنیا میں پہونچا دیا - چند منٹ خاموش رہنے کے بعد وہ اُٹھے - اندر کمرہ میں جا کر ایک بکس کھولا - اُس میں سے ایک پیکٹ نکال - باہر لائے، اور بغیر کچھ کہے اُسے میرے سامنے رکھ دیا - میں نے اُس پیکٹ کو اُٹھا لیا - کھولا - لفافہ میں سے ایک تصویر نکلی - میں کئی منٹ تک اُسے غور سے دیکھتا رہا - جمال و رعنائی کے ساتھ ایسی معصومیت شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی ہے - کوئی اٹھارہ، اُنیس سال کا سن، نازک اندام، ناک میں چھوٹی سی نتھ جس میں صرف ایک موتی اور ایک ٹکلی، کنوارے پنے کی علامت، سیدھی مانگ - پرانی وضع کا ڈھیلا پاجامہ - چہرہ پر انتہائی افسردگی چھائی ہوئی - آنکھوں سے غم ٹپکا پڑتا تھا -

مولینا نے یکایک تصویر میرے ہاتھ سے لے لی، اور کئی منٹ تک نظر جمائے اُسے دیکھتے رہے - میں نے دیکھا کہ ان کی حالت غیر ہوئی جا رہی تھی - اُنہوں نے ایک دل دوز آہ کی - اُن کے ہاتھ تھر تھرا رہے تھے آخر اُنہوں نے تولیا کا کونہ اُٹھا کر آنکھوں پر

رکھ لیا۔ اور گاؤ تکیہ سے پیٹھ رگا کر دراز ہو گئے۔ تصویر اب بھی اُن کے ہاتھ میں تھی۔ اور ہاتھ سینے پر، کتنی ہی دیر اس طرح پڑے رہے۔ پھر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اُن کا چہرہ حد درجہ افسردہ تھا۔ آواز بھرّا گئی تھی۔ اُنہوں نے مجھ سے کہا:۔

"ہاں...... صاحب! آپ نے وہ کیا شعر پڑھا تھا؟"

میں نے پھر اُس شعر کو دُہرایا ؎

یاد آتی ہے جو مرحوم تمنّاؤں کی　　بھول جاتا ہوں کہ محروم تمنّا ہوں میں

"کتنی گہری اور سچی بات کہی ہے" اُنہوں نے تصویر کو فرش پر رکھتے ہوئے کہا، "یاد رکھیے، ذرا دیر پہلے میں آج سے بیس بائیس سال پہلے کی دنیا میں سانس لے رہا تھا، آپ نے دیکھی یہ تصویر؟"

"ہاں دیکھی"

"کیسی ہے؟"

"کیسی ہے؟ ایسی ہے کہ اس کی کم سے کم قیمت ایک زندگی ہو سکتی ہے"

"مگر ضروری نہیں کہ اس قیمت پر مل بھی جائے"

"نہیں، ضروری نہیں"

"میں ایک زندگی دے کر بھی اسے نہ پا سکا"

"اچھا، اور یہ حور بہشتی اب ہے کہاں؟"

"بہشت میں"

مولینا کے ان دو لفظوں نے، ایسا معلوم ہوا کہ میرا دل مسوس ڈالا۔ ہائے ظالم موت نہ حُسن کی رعایت کرتی ہے، نہ جوانی کی، نہ ارمانوں کی۔ وہ جوانا مرگ ہوئی یہ جیتے جی زندہ درگور رہے۔ میرے دل میں قدرت کے خلاف ایک جذبہ انتقام بھڑک اٹھا تھا۔ مگر افسوس کہ میرا غم و غصہ مرنے والے کو زندہ نہیں کر سکتا تھا۔ احساسِ مجبوری

نے آخر جذبات کو دبایا۔ میری حالت ایسی تھی جیسی ایک شکست خوردہ مجروح سپاہی کی ہوتی ہے۔ جو دشمن کے ہاتھ میں گرفتار ہو گیا ہو۔ وہ سب کچھ سہنے پر مجبور رہوتا ہے آخر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ مولینا کا افسانۂ غم سننے کے لئے میرا دل بیتاب ہو رہا تھا۔ میں نے کہا :-

"اس کی کچھ تفصیل تو سنائیے"

"تفصیل کہاں تک سنیئے گا۔ رات آدھی سے زیادہ آچکی ہے"

"رات آخر اپنی ہے"

مولینا نے پہلو بدلا۔ ایک تکیہ زانو کے نیچے دبایا اور کہنا شروع کیا :-

"کوئی بیس بائیس برس گذرے میں اس وقت جوان تھا۔ یہ سفید بال سب سیاہ تھے۔ صحت بہت اچھی تھی۔ جے پور میں وکالت کرتا تھا۔ والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ کوئی بہن بھائی بھی نہ تھا جس کی ذمہ داری میرے سر ہوتی۔ شادی بھی نہیں کی تھی۔ اکیلی آزاد جان۔ آمدنی کافی۔ آرام سے گذرتی تھی۔ گانے کا مجھے ہمیشہ سے شوق تھا۔ اور اسی شوق کی تسکین کے لئے میں تقریباً ہر سال عرس کے موقع پر اجمیر جایا کرتا تھا۔ اس سال بھی اجمیر جا رہا تھا، یوں تو میں عموماً انٹر کلاس میں سفر کیا کرتا تھا۔ مگر عرس کے موقع پر اجمیر کے مسافروں کی اتنی کشمکش ہوتی تھی کہ سکنڈ کلاس میں سفر کئے بغیر آرام ملنا ناممکن تھا۔ اس مرتبہ سکنڈ کلاس بھی کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بہر حال ایک چھوٹے سے ڈبے میں جگہ مل گئی۔ اس میں بیٹھنے کے لئے کل دو برتھ تھے ایک پر ایک بوڑھی عورت اور ایک بوڑھا مرد بیٹھے تھے اور دوسرے پر ایک نوجوان لڑکی، ایک خوبصورت شال اوڑھے بیٹھی تھی۔ میں ابھی کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ کس سیٹ پر بیٹھوں کہ اس لڑکی نے میری طرف دیکھا۔ پہلے اپنے پاؤں سمیٹے، پھر فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے سر کو ذرا خم کر کے آنکھوں سے اظہار ممنونیت کیا اور بیٹھ گیا۔

اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ آخر یہ عورت کس طبقہ کی ہے جو مردانہ گاڑی میں سفر کر رہی ہے "ہو نہ ہو طوائف ہے" میں نے اپنے دل میں کہا، مگر اس کی معصوم اور مغموم صورت بار بار میرے اس خیال کی تردید کرتی تھی۔ ادھر بڑھیا بڈھے کا اس کے ساتھ ہونا جو بظاہر اس کے والدین یا ہمراہی معلوم ہوتے تھے، پھر مجھے اس کے طوائف سمجھنے پر مجبور کرتا تھا۔ میں خاموش تھا۔ وہ بھی خاموش تھی، بڑھیا اور بڈھا بھی خاموش تھے۔ آپ یقین کیجئے، میں جوانی میں بھی اپنے نفس پر اتنا ہی قابو رکھتا تھا جتنا کہ آج بڑھاپے میں آپ دیکھتے ہیں۔ مگر اس وقت خدا جانے مجھے کیا ہو گیا تھا کہ بے اختیار اُسے دیکھتے رہنے اور اس سے بات کرنے کو جی چاہا۔ پھر بھی میں نے ضبط کیا اور خاموش رہا۔ کوئی پندرہ منٹ کامل اسی طرح خاموشی میں گذر گئے میں سر جھکائے بیٹھا تھا اور وہ نظر جمائے مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے ذرا بھی تعجب نہ ہوا میرے شباب کی رعنائیوں نے یہ تماشا مجھے بارہا دکھلایا تھا۔ مگر میں غلطی پر تھا۔ میری صورت نے اس کی توجہ کو جذب نہیں کیا تھا۔ بلکہ میری متانت، خاموشی اور ظاہری بے توجہی اُس کی دلچسپی کا باعث تھی، جس کا حال بعد میں کھُلا۔ شاید سفر کے دوران میں اُسے اس قسم کا تجربہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس کا حُسنِ معصوم یقیناً دیکھنے والوں کے لئے مرکزِ نظر بن جاتا ہو گا۔ میری بے اعتنائی خود ظاہری تھی۔ ورنہ دل اور دماغ دونوں اسی کے خیال میں مصروف تھے۔

"میاں صاحب یہ گاڑی اجمیر شریف کس وقت پہونچے گی؟" بڑھیا نے یکایک مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ اس آواز نے میرے سلسلۂ خیالات کو درہم برہم کر دیا میں چونک پڑا۔ بہرحال میں نے سر اٹھا کر جواب دیا:۔

"دس بجے۔ کیا آپ لوگ اجمیر جا رہے ہیں؟"

"جی نہیں، ہمارا سفر تو بہت دُور کا ہے۔ بمبئی جائیں گے۔"

"کیا بمبئی آپ کا وطن ہے؟"

"نہیں ہم لوگ تو پورب کے رہنے والے ہیں، مگر یہ میری لڑکی زہرہ ایک سیٹھ کی ملازم ہو کر بمبئی جا رہی ہے!"

میں نے اپنے دل میں کہا "یقیناً یہ طوائفیں ہیں" لیکن بڑھیا کے لفظوں کا زہرہ پر وہی اثر ہوا جو ایک شریف آدمی پر فحش گالیوں کا ہو سکتا ہے۔ وہ اب بھی خاموش تھی، لیکن اُس کا چہرہ اور اُس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ یہ الفاظ نہیں نشتر تھے۔ جنہوں نے اُس کے نازک کلیجہ کو چھید ڈالا۔ اور میں موجود نہ ہوتا تو شاید دل کا یہ اندوہ و ملال آنسوؤں کی شکل میں ابل پڑتا۔ میں پھر خاموش ہو گیا۔ زہرہ اب بھی ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہی تھی۔ خدا جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ مگر اپنے ہمراہیوں کی موجودگی میں کہہ نہیں سکتی۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اُس نے نہایت غمناک لہجے میں مجھ سے پوچھا:-

"آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟"

"میں اجمیر جا رہا ہوں!"

"اور آپ کا دولت خانہ؟"

"غریب خانہ یہیں جے پور ہے!"

میرا خیال تھا کہ ابھی وہ کچھ اور بھی پوچھے گی۔ مگر نہیں وہ چپ ہو گئی۔ اب وہ کسی دوسری دنیا میں تھی۔ کسی گہرے خیال میں غرق۔ سلسلۂ گفتگو منقطع ہو گیا۔ مجھے خواہ مخواہ اس کے ساتھ دلچسپی نہیں بلکہ ایک ہمدردی سی پیدا ہو چلی تھی۔ دراصل اس کی غم آلود آنکھیں اور افسردہ چہرہ میرے لئے ایک معمّا تھے۔ میں اپنے دل میں کہتا تھا "یہ لوگ تو صرف خوش رہنے اور دوسروں کو خوش کرنے کے لئے بنے ہیں

انہیں رنج و غم سے کیا علاقہ جس ماحول میں ان کی پرورش ہوتی ہے اُس میں جذبات کا گذر کہاں۔ گوشت پوست سے بنی ہوئی بے حس پتلیاں ہیں کہ بظاہر عام انسانوں کی طرح عمل کرتی ہیں، مگر سب نمایش، سب فریب۔ ان کا مقصد تو دوسروں کی جیبوں سے روپیہ نکالنا ہے اور بس، اور اسی کے سلئے یہ سب کچھ کرتی ہیں۔ جب تک حُسن اور جوانی باقی ہے زندگی کی تلخیوں کا انہیں خواب میں بھی احساس نہیں ہو سکتا۔ پھر اس خاموشی اور افسردگی کے کیا معنیٰ؟ آوازمیں یہ دل کے درد کا امتزاج کیسا؟ ضرور اس میں کوئی راز ہے!"

یہ خیالات تھے جو بڑی تیزی کے ساتھ میرے دماغ میں آئے اور اس راز کے دریافت کرنے کی ایک زبردست خواہش میرے دل میں پیدا ہو گئی۔ کئی منٹ بھر خاموشی میں گذر گئے۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کس طرح سلسلۂ کلام جاری کروں کہ زہرہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا:۔

"دہلی میں سُنا تھا کہ خواجہ صاحب کا عرس ہونے والا ہے۔ شاید آپ بھی اسی سلسلہ میں اجمیر شریف جا رہے ہیں؟"

"جی ہاں۔ میں ہر سال خواجہ صاحب کے عرس میں شریک ہوتا ہوں۔ کبھی آپ کو بھی شرکت کا اتفاق ہوا؟"

"کبھی نہیں۔ ہم لوگ تو زندگی میں پہلی بار ادھر آئے ہیں!"

"اماں!" یکایک اُس نے بڑھیا سے مخاطب ہو کر کہا "کیا اچھا ہو کہ ہم بھی ایک دن کے سلئے اجمیر شریف ٹھہر جائیں اور خواجہ صاحب کی زیارت کرتے چلیں!"

بڑھیا نے اس تجویز کو بالکل پسند نہیں کیا۔ اُس نے منہ بنا کر کہا:۔

"نہیں بیٹا۔ پھر کبھی دیکھا جائے گا۔ سیٹھ جی کو انتظار ہو گا۔ وقت پر ہم لوگ نہ پہونچیں گے تو انہیں خواہ مخواہ پریشانی ہو گی!"

"پریشانی ہوگی تو ہوا کرے۔ میں تو زیارت کئے بغیر نہ جاؤں گی"۔ زہرہ نے ایک فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بڑھیا میں زہرہ کی مخالفت کی مجال نہیں اور وہ بہ لطائف الحیل اُسے اُس کے ارادہ سے باز رکھنا چاہتی ہے۔ اُس نے پریشانی کے لہجہ میں کہا:۔

"مگر ٹھہریں گے کہاں؟ اجمیر شریف، عرس کا موقع، اور رات کا وقت کوئی کلکتہ تو نہیں کہ ریل سے اُترے اور ہوٹل میں جا ٹھہرے"۔

زہرہ نے ایک عجیب انداز سے میری طرف دیکھا۔ گویا اس مشکل کے حل کرنے میں وہ میری امداد کی خواہشمند تھی۔

میں نے بڑھیا سے مخاطب ہو کر پوچھا:۔

"آپ لوگ کتنی دیر اجمیر ٹھہرنا چاہتے ہیں؟"

"بس ایک دن"۔

"اس کا انتظام ہو جائے گا۔ درگاہ کے دیوان صاحب میرے دوست ہیں"۔

.... صاحب کیا بتاؤں کہ میرے اِن لفظوں نے زہرہ پر کیا اثر کیا۔ وہ ممنونیت کی ایک مُنہ بولتی تصویر تھی۔ پہلی مرتبہ میں نے اُس کے افسردہ ہونٹوں پر مُسکراہٹ اور اس کی غم آلود آنکھوں میں مسرت کی چمک دیکھی۔ اس نے کہا:۔

"آپ کس قدر مہربان ہیں۔ ہم آپ کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ سے ملاقات ہو گئی، مگر آپ کا نام تو ہمیں اب تک بھی معلوم نہیں"۔

میں نے کہا "مجھے سلیم الدین کہتے ہیں"۔

بڈھا جواب تک خاموش بیٹھا تھا۔ یا شاید افیون کی پینک میں اونگھ رہا تھا نہایت نکرہ آواز میں مجھ سے مخاطب ہوا:۔

"کیا فرمایا آپ نے؟ عظیم الدین؟"

"جی نہیں سلیم الدین!"

بڑھیا کے دل سے تو خدا ہی خبیر تھا۔ مگر اس کی آنکھیں اور چہرہ اُس کے احساسات کی اچھی طرح ترجمانی کر رہے تھے۔ مگر اس نے بھی ظاہرداری کے طور پر میرا شکریہ ادا کیا۔ پان دان کھول کر پان بنائے اور تھالی میں رکھ کر پیش کئے۔ میں نے ایک پان اُٹھا کر کھایا اور تھالی زہرہ کی طرف بڑھا دی۔ زہرہ نے "تسلیم" کہہ کر تھالی میرے ہاتھ سے لے لی۔ وہ اجمیر ٹھہر جانے کے خیال سے بہت خوش معلوم ہوتی تھی اور یہی حالت میری بھی تھی۔ میں بالکل بھول گیا تھا کہ وہ ایک "طوائف" ہے۔ طوائف ہمیشہ میری نظر میں ایک ذلیل و مکروہ ہستی تھی۔ مگر گانا سننے کا شوق مجھے اس سے قطعی طور پر بیزار بھی نہ کر سکتا تھا۔ زہرہ اور بڑھیا کے درمیان ابھی ابھی جو مختصر گفتگو ہوئی تھی اور بڑھیا نے جس طرح اپنی خواہش کے خلاف زہرہ کی مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تھا اُس سے مجھے یقین ہو گیا کہ زہرہ ہرگز اس کی بیٹی نہیں اور نہ صرف اس قدر بلکہ جہاں ایک طرف زہرہ اس کی "سرپرستی" قبول کرنے پر مجبور رہے، وہاں وہ بھی کوئی بات زہرہ کی خواہش کے خلاف کرنے سے ڈرتی ہے ہر قدم پر راز زیادہ گہرا اور معمہ زیادہ پیچیدہ ہوتا جا رہا تھا اور اسی نسبت سے مجھے اُس کے جاننے کی خواہش بڑھتی جاتی تھی۔ اجمیر پہونچنے تک ہر قسم کی بہت سی باتیں ہوئیں اور برابر یہ شک یقین میں تبدیل ہوتا گیا کہ زہرہ "خاندانی طوائف" ہرگز نہیں بلکہ کسی حادثہ کا شکار ہو کر طوائف بننے پر مجبور ہو گئی ہے۔ آخر اجمیر کا اسٹیشن آیا۔ مسافروں کا ایک سمندر تھا کہ گاڑی سے اُبل پڑا اور پلیٹ فارم پر موجیں مارنے لگا۔ بڑھیا اور بڈھا ابھی گاڑی ہی میں تھے اور اپنا اسباب اُتروانے میں مصروف۔ میں اور زہرہ باہر کھڑے تھے۔ زہرہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک طرف کھینچا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے

کچھ کہنا چاہتی ہے۔ ہم دروازہ کے سامنے سے ذرا ہٹ گئے۔ بڈھوں کا جوڑا اب نہ ہمیں دیکھ سکتا تھا نہ ہماری باتیں سن سکتا تھا۔ زہرہ نے انتہائی عاجزی کے لہجہ میں کہا :۔

"خدا نے آپ کو بہت شریف دل دیا ہے۔ کیا آپ ایک بدنصیب لڑکی کی کچھ مدد کر سکتے ہیں؟"

یہ کہہ کر اُس نے نہایت حسرت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ زہرہ کی نظروں اور لفظوں میں خدا جانے کیا جادو بھرا تھا کہ میں فوراً ہر اقدام اور ہر انجام کے لئے تیار ہو گیا۔ میں نے کہا :۔

"بیشک جو کچھ میرے امکان میں ہو"

"تو پھر اپنا پورا پتا مجھے بتا دیجئے!"

"میرا پتا سلیم منزل بجے پور ہے۔ میں وکیل ہوں اور اس پیشہ کی وجہ سے شہر کے سب لوگ مجھے جانتے ہیں"

میں یہیں تک کہنے پایا تھا کہ بڑھیا اور بڈھا گاڑی سے اتر آئے اور مجھے خاموش ہو جانا پڑا۔ زہرہ کو میرے پاس اور اپنے سے دور کھڑا دیکھ کر بڑھیا نے ایک مشکوک انداز سے مجھے دیکھا مگر کہا کچھ نہیں۔ آدھے گھنٹے کے اندر ہم سب لوگ دیوان صاحب کے مکان پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ یہ لوگ تقریباً چوبیس گھنٹے اجمیر ٹھہرے۔ مگر اس خرانٹ بڑھیا کی نگرانی کے باعث مجھے ایک منٹ بھی زہرہ کے ساتھ تنہائی میں بات کرنے کا موقع نہ ملا۔ رخصت ہوتے وقت پھر زہرہ نے میرا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ اور اس طرح مجھے دیکھا کہ جو کچھ اُس کے دل میں تھا میں نے اُس کی آنکھوں میں پڑھ لیا۔ وہ کہہ رہی تھی "دیکھو، وعدہ یاد رہے، ایک بیکس کو بھول نہ جانا" زہرہ چلی گئی۔ اور میں دل میں ایک چوٹ لے کر جے پور واپس آگیا۔

سیٹھ کا نام اور پتا نہ میں نے پوچھا نہ زہرہ نے بتایا۔ اور سچ پوچھو تو مجھے اس کا خیال ہی نہ آیا۔ دماغ کی کچھ عجیب کیفیت تھی۔ ہزاروں خیال بیک وقت دماغ میں آتے اور قبل اس کے کہ میں اُن میں سے کسی ایک پر بھی غور کر سکوں، نئے آنے والے خیالات کے ہجوم میں گم ہو جاتے اور میں یہ سوچتا ہی رہ جاتا کہ میں کیا سوچ رہا تھا۔

اس واقعہ کے دو تین روز بعد میں اغوا کے ایک مقدمہ میں مستغیث کی طرف سے وکیل ہوا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ فوجداری کے مقدمات میں میری تقریر بہت ہی پُرجوش اور پُرمغز ہوا کرتی تھی۔ اور یہ واقعہ ہے کہ کم از کم اُس روز میں نہایت ہی زور شور سے تقریر کر رہا تھا۔ سامعین خاموش، عدالت ہمہ تن گوش۔ یکایک میرا خیال، زہرہ کی طرف جا پہونچا۔ اُس کا اُداس چہرہ، اُس کی مایوس آنکھیں، اُس کی اندوہگیں خاموشی۔ میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ اُس کی غم انگیز آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ میں یکایک خاموش ہو گیا اور پھر یکایک بولا:۔

"میں ثابت کر دوں گا کہ لڑکی بالکل بے گناہ ہے۔ اُسے زبردست فریب دیا گیا!" میری خاموشی اور پھر ان الفاظ نے حاضرین کو متحیر کر دیا۔

"مگر آپ جو واقعات بیان کر رہے تھے اُنہیں تو پہلے ختم کر لیجئے" مجسٹریٹ نے متانت سے کہا۔ اب میں چونکا اپنی ہنگامی بیخودی کا احساس ہوا۔ اسی ہفتہ میں اسی قسم کے اور بھی دو تین واقعے پیش آئے۔ جن سے مجھے یقین ہو گیا کہ گو میں اقرار نہ کروں۔ مجھے زہرہ کے ساتھ گہری دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ دراصل زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے کسی عورت سے اس قسم کی دلبستگی پیدا ہوئی تھی جب مجھے یہ خیال آتا کہ زہرہ ایک آبرو باختہ طوائف ہے تو میں خیال میں بھی اس سے

بھاگنے کی کوشش کرتا، مگر فوراً ہی اُس کا معصوم اور مغموم چہرہ مجھ سے اُس کی سفارش کرتا کہ نہیں، بدنصیب زہرہ محض مجبور ہے۔ قصور اُس کا نہیں مقدر کا ہے، جو تم اسے اس حال میں دیکھتے ہو۔ مجھے رہ رہ کر افسوس ہوتا کہ میں نے کیوں زہرہ کا پتا دریافت نہ کر لیا۔ پھر خود ہی یہ جواب دے لیتا کہ پتا معلوم بھی ہوتا تو میں کیا کر سکتا تھا۔

کئی دن تک تو مجھے یہ خیال لگا رہا کہ شاید زہرہ کا کوئی خط آئے۔ مگر جب ایک ہفتہ گذر گیا اور کوئی خط نہ آیا تو اس طرف سے بھی مایوسی ہو گئی۔ اُسی روز شب کو میں نے ایک بھیانک خواب دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سنسان ویران علاقہ ہے۔ جس میں جلی ہوئی پہاڑیوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے۔ میرے ہاتھ میں ایک بہت بڑا چھرا ہے جس سے میں نے ابھی کسی کو ذبح کیا ہے۔ خون کی بوندیں اُس سے ٹپک رہی ہیں۔ لاش خاک و خون میں پڑی پھڑک رہی ہے میں حیران کہ یہ میں نے کسے مار ڈالا اور کیوں مار ڈالا؟ مقتول کی شکل پہچانی نہیں جاتی۔ چہرہ خون میں لتھڑا ہوا ہے۔ آخر میں نے اپنے ہاتھوں سے اُس کا چہرہ صاف کیا۔ یہ زہرہ تھی۔ بے اختیار میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ اور میں جاگ اُٹھا۔ رات کا باقی حصہ بڑی پریشانی میں کٹا۔ دو دن اور گذر گئے۔ زہرہ کا خیال مجھے بار بار آتا تھا۔ تیسرے پہر کو میں چائے پی کر بیٹھا تھا کہ ملازم نے ڈاک لا کر دی۔ ایک خط پر بہت ہی بُرا پتا لکھا تھا۔ میری آنکھیں اس تحریر سے ناآشنا تھیں۔ مُہر دیکھی تو بمبئی کی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ خوشی بھی تھی اور ایک مبہم سا خوف بھی، بہرحال خط کھولا اور پڑھا۔ یہ زہرہ کا خط تھا، جو اُس نے کسی سے لکھوا کر بھیجا تھا۔ بہت ہی بُری تحریر مشکل سے پڑھی گئی۔ خلاصہ اُس کا یہ تھا:-

"اب تک میں نے کسی نہ کسی بہانے سے اپنی آبرو کو بچایا۔ مگر اب خدا ہی

حافظ ہے۔ آپ کو اپنی شرافت کا واسطہ بللہ ایک بیکس کی مدد کیجئے اور اس قید سے چھڑا دیجئے۔ سیٹھ دس دن کے لئے کلکتہ گیا ہے۔ اگر اس کی واپسی سے پہلے میں اس منحوس گھر سے نہ جا سکی تو جان دیدوں گی"۔

میں یہ تحریر پڑھ کر بے اختیار ہو گیا۔ زہرہ نے جو کچھ لکھا تھا مجھے اس کے ایک ایک حرف کا یقین تھا۔ بہرحال میں پہلی ٹرین سے بمبئی روانہ ہو گیا۔ اور وہاں پہونچ کر ایک فقیرنی کی مدد سے زہرہ کو اپنی آمد کی اطلاع کر دی۔ پانچویں دن شب کو میں اور زہرہ سلیم منزل میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ طویل سفر اور مسلسل کاہشوں اور پریشانیوں نے زہرہ کو بالکل خستہ کر دیا تھا۔ اس لئے کھانا کھانے کے بعد وہ جلد ہی سو گئی۔ علی الصّباح ہمیں ایک اور مختصر مگر پُر زحمت سفر درپیش تھا۔ بات یہ تھی کہ میرے ساتھ جے پور میں زہرہ کا قیام خطرہ سے خالی نہ تھا۔ میرا مکان مردانہ تھا۔ ہر وقت دوست احباب اور موکّل آتے جاتے رہتے تھے۔ بہت ممکن تھا کہ صبح ہوتے ہی لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ میرے گھر میں "چوری کا مال" موجود ہے۔ اور اس کے جو کچھ نتائج ہو سکتے تھے اُن سے میں بے خبر نہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ملک کے قانون کی رو سے میں نے ایک سنگین جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ اور راز فاش ہو جانے پر یقیناً اس سزا کا مستوجب تھا جو ایک مجرم کو ملنی چاہیے۔ مگر میرا قلب مطمئن تھا۔ میری نیت بخیر اور میرا ارادہ نیک تھا۔

زہرہ کا خیال تھا کہ اُس کی گمشدگی کے سلسلہ میں جن جن لوگوں پر شبہ کیا جا سکتا تھا اُن میں بڑھیا نے میرا نام بھی ضرور لیا ہو گا۔ اور سیٹھ کی گرسنہ ہوس نے پولیس کے کتّوں کو بڑے بڑے لالچ دیئے ہوں گے کہ جس طرح بنے زہرہ کو پیدا کر دو۔ اس لئے کامل احتیاط کی ضرورت تھی۔

جے پور سے کوئی بیس بائیس میل کے فاصلہ پر ویران پہاڑیوں کے دامن

میں ایک خانہ بدوش قوم آباد ہے۔ یہ لوگ عموماً "جرائم پیشہ" ہیں۔ ایک مرتبہ ان کا سردار قتل کے جُرم میں ماخوذ ہوا۔ میں اس کا وکیل تھا۔ پولیس جُرم کا پورا ثبوت بہم نہ پہونچا سکی اور وہ صاف چھوٹ گیا۔ اُس کا خیال تھا کہ میری قانونی موشگافیوں نے اُس کی جان بچائی اور اس دن سے وہ ایک بااخلاص مُرید کی طرح میری خدمت اور عزّت کرنے لگا۔ اپنے قبیلہ میں اس کا وہی مرتبہ تھا جو ہندوستانی مسلمانوں میں ترکی خلیفہ کا، اُس نے چوریاں بھی کی تھیں، ڈاکے بھی ڈالے تھے، خون بھی کئے تھے۔ مگر اس کے باوجود اُس میں کچھ ایسی خوبیاں بھی تھیں جو ہر زمانہ میں، ہر ملک میں، ہر قوم میں قابل ستائش سمجھی گئی ہیں۔ وہ بہادر تھا، دوست پرست تھا، امین تھا، اور اپنی بات کی لاج پالنے والا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میری کوئی خدمت بجالانے کا دل سے آرزومند۔ مجھے کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ کبھی دن مجھے اس کی مدد اور دوستی کی ضرورت پڑے گی۔ بہر حال میں نے یہ تہیّہ کر لیا کہ جب تک معاملات رو براہ ہوں میں زہرہ کو اس کی حفاظت میں چھوڑ دوں گا زہرہ کے لئے اس کی جھونپڑی سے بہتر امن اور پناہ کی جگہ دنیا میں کہیں نہیں ہو سکتی تھی۔ سپیدۂ سحر ابھی اچھی طرح نمودار بھی نہ ہوا تھا کہ ہماری سانڈنی تین چار میل طے کر چکی تھی۔ راستہ میں میں نے زہرہ سے اپنا وہ خواب بیان کیا جو آٹھ روز پہلے بے پور میں دیکھا تھا۔ اور سنسان میدان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ وہ بھی کچھ ایسی ہی جگہ تھی۔

زہرہ نے ایک غم آلود مُسکراہٹ کے ساتھ کہا:۔

"آپ سے تو ایسی اُمید نہیں کہ آپ ایک بیکس کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کریں لیکن اپنے مقدر سے سب کچھ اُمید ہے"!

دوپہر سے کچھ پہلے ہی ہم اپنی منزلِ مقصود پر پہونچ گئے۔ سردار کو میں نے الگ لے جا کر سب کچھ سمجھا دیا۔ اُس نے اس خدمت کو سعادت جانا اور بہت ممنون ہوا کہ

میں نے اُس پر اتنا بڑا اعتماد کیا۔ دوسرے دن میں پھر سلیم منزل میں بیٹھا مقدموں کی مسلیں دیکھ رہا تھا!

زہرہ نے بمبئی سے جے پور آتے ہوئے اپنی مصیبت کی ساری داستان سنائی پہلی ملاقات کے بعد میرے دل میں جو توقعات بیدار ہو گئی تھیں، زہرہ کے حالات سُن کر اُن میں سے اکثر یاس کی گود میں موت کی نیند سو گئیں۔ پھر بھی اُمید کی مضمحل روشنی مستقبل کی تاریک فضا میں کبھی کبھی چمک اُٹھتی تھی۔ با ایں ہمہ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ زندگی کی آخری سانسوں تک زہرہ کی حفاظت کروں گا۔ زہرہ قصبہ..... (ضلع فیض آباد۔ اودھ) کے ایک تعلّقہ دار کی بیٹی تھی ..... اس کا اصلی نام سلیمہ تھا۔ اپنے ماموں کے اکلوتے بیٹے منصور سے بچپن ہی میں اُس کی منگنی ہو چکی تھی۔ بچپن میں دونوں ساتھ کھیلے تھے، ساتھ پڑھے تھے، ساتھ پلے اور بڑھے تھے، ایک دوسرے سے بے انتہا مانوس تھے۔ جب زہرہ بارہ تیرہ برس کی ہوئی تو منصور سے اس کا پردہ کرا دیا گیا۔ مگر یہ کا نا پردہ تھا۔ جب لوگ اِدھر اُدھر ہوتے تو دونوں چھُپ کر مل لیتے۔ اُن کے ساتھ ساتھ اُن کی محبّت بھی جوان ہو گئی۔ پردہ میں اب پہلے سے زیادہ سختیاں ہونے لگیں جنہوں نے دونوں طرف اور بھی آگ لگا دی۔ چھُپ چھُپ کر ملنے کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ دونوں ایک دوسرے کو پرستاری کی حد تک چاہتے تھے۔ شادی میں کُل پانچ مہینے باقی رہ گئے تھے کہ زہرہ کے نانا کا انتقال ہو گیا۔ اُنہوں نے کافی جائداد چھوڑی تھی۔ زہرہ کی والدہ عمر میں اپنے بھائی یعنی منصور کے والد سے کہیں بڑی تھیں اور ان کو مثل اپنی اولاد کے سمجھتی تھیں۔ اسی لئے باپ کے ترکہ میں سے ایک پیسہ بھی بھائی سے لینا نہیں چاہتی تھیں۔ لیکن زہرہ کے والد نے مجبور کیا کہ اپنا شرعی حق چھوڑنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اسی پر سالے بہنوئی میں بدمزگی ہو گئی۔ نوبت عدالت تک پہونچی۔ منصور کے

والد مقدمہ ہار گئے۔ تعلقات منقطع ہوگئے۔ اور منصور اور زہرہ کا رشتہ بھی چھوٹ گیا۔ مگر محبت کا رشتہ اتنا بودا نہ تھا کہ والدین کی رنجشیں اُسے توڑ سکتیں تاہم اب شادی کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا۔ اپنے آنسوؤں کے سوا اور کسی پر زہرہ کا بس نہ چلتا تھا۔ وہ چھپ چھپ کر روتی اور گھنٹوں روتی منصور کو ایک چپ لگ گئی تھی۔ خفیہ ملاقاتوں کا اب امکان نہ تھا۔ زہرہ کی ماں بیٹی کے حال سے بے خبر نہ تھیں، مگر شوہر سے مجبور تھیں۔ منصور کے والد منصور کو اس سے کم نہ چاہتے تھے جتنا حضرت یعقوبؑ حضرت یوسفؑ کو۔ وہ اس کی حالت دیکھ دیکھ کر کڑھتے تھے مگر کچھ بس نہ تھا "دشمنوں" سے رشتہ کیا معنے۔ اور بالفرض وہ اس پر آمادہ بھی ہو جاتے تو زہرہ کے والد کو کون راضی کرتا۔

زہرہ کے نانا جوانی میں بنارس سے ایک طوائف لے آئے تھے وہی خبیثہ تھی جو زہرہ کو بمبئی لے گئی تھی۔ چونکہ بڑے میاں کے جیتے جی اس نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جو قابل اعتراض ہوتی، اس لئے گھر کے سب لوگوں کو اس پر اعتماد ہو گیا تھا اور وہ خاندان کے سب گھروں میں بے روک ٹوک آتی جاتی تھی۔ اب جو بڑے میاں کا انتقال ہو گیا تو کوئی اس کا پوچھنے والا نہ رہا۔ عیش و آرام میں خلل پڑا وہ زندگی بھر سے راحت کی عادی تکلیف اٹھانا کیا جانے۔ آخر سوچا ہو گا کہ یہ باقی زندگی کس طرح عیش و عشرت سے بسر ہو۔ شیطانی رگ جوش میں آئی اور میدان عمل بھی فوراً ہی مل گیا۔ پہلے وہ زہرہ کی ہمدرد اور پھر رازدار بنی منصور اور زہرہ کے پیغامات ایک دوسرے کو پہونچانے لگی۔ بدنصیب زہرہ صرف پڑھنا جانتی تھی لکھ نہیں سکتی تھی۔ اس لئے جو پیام ہوتا وہ زبانی ہوتا۔ ادھر زہرہ کو اس پر آمادہ کیا کہ زیورات اور نقد روپیہ جس قدر ہاتھ آسکے لے کر گھر سے نکل چلو اور کلکتہ چل کر منصور سے شادی کر لو۔ محبت کی دیوانی زہرہ اس کے پھندوں میں آگئی۔ ادھر رفتہ رفتہ منصور کو یقین

دلایا کہ اب زہرہ کو تمہاری وہ پہلی سی محبت نہیں رہی۔ اُس کے والدین ایک مال دار گھرانے میں اُس کی شادی کرنا چاہتے ہیں اور وہ بخوشی اس کے لئے تیار ہے۔ یہ سچ ہے کہ زہرہ کے "پیغام" کئی جگہ سے آئے تھے۔ مگر ابھی کوئی بات طے نہیں ہوئی تھی۔ اور اس نامراد کی مرضی کو اُس میں کوئی دخل نہ تھا۔ منصور ایک ناتجربہ کار، سادہ دل نوجوان، محبت میں اندھا، اس حرّافہ کی باتوں کو سچ سمجھا اور دل شکستہ ہو کر خدا جانے گھر سے کہاں چلا گیا۔ زہرہ کو اُس نے یہ سمجھایا کہ وہ کلکتہ گیا ہے۔ اور وہاں ہمارا منتظر ہے۔ چنانچہ دوسرے دن زہرہ اپنا اور اپنی ماں کا تمام زیور اور بہت سا نقد روپیہ لے بڑھیا کے ہمراہ راتوں رات گھر سے نکل گئی۔ کلکتہ پہونچ کر ان لوگوں نے ایک نہایت غیر آباد جگہ قیام کیا۔ بڑھیا نے بظاہر منصور کی تلاش میں دن رات ایک کر دیئے۔ مگر منصور کا کہیں پتہ نہ لگا۔ زہرہ کو اب دن رات رونے کے سوا کام نہ تھا۔ بڑھیا ہر چند تسلّیاں دیتی مگر مجبور دل کہیں خالی باتوں سے تسکین پاتا ہے۔ وہ منصور کی محبت میں دیوانی ہو رہی تھی۔ اسی طرح کوئی چھ مہینے گذر گئے۔ روپیہ رفتہ رفتہ ختم ہو رہا تھا۔ بڑھیا نے کہا "ہم زیورات کو فروخت نہیں کر سکتے۔ گرفتار ہو جانے کا اندیشہ ہے اور اُس کے بعد جو حشر ہو گا ظاہر ہے"۔

زہرہ اپنی بے ناموسی اور رسوائی کے خوف سے تھرّا اُٹھتی تھی۔ کلکتہ ہی میں بڑھیا نے ایک افیونی چانڈو باز سے آشنائی کر لی۔ اور اب وہ بھی ان کے ساتھ ہی رہنے لگا۔ یہی وہ خبیث افیمی تھا جو ریل میں زہرہ کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ کلکتہ کے دورانِ قیام میں ایک دن بڑھیا چپکے چپکے اپنی مکاریوں کی داستان اسے سنا رہی تھی۔ گفتگو کا کچھ حصہ زہرہ نے بھی سُن پایا۔ اُسی دن سے وہ ان دونوں خبیثوں سے نفرت کرنے لگی۔ مگر ان کے ہاتھوں میں کچھ اس طرح گرفتار تھی کہ کچھ

بس نہ چلتا تھا۔ بڑھیا کے بیان کے مطابق روپیہ اب برائے نام رہ گیا تھا۔ مکان کا کرایہ بھی ایک مہینے سے ادا نہیں ہوا تھا اور اگر جلد ہی آمدنی کی کوئی سبیل نہ نکل آئی تو فاقوں کی نوبت تھی۔ وہ اس فکر میں تھی کہ کسی رئیس کے ہاتھ زہرہ کو "بیچ ڈالے" یا ملازمت کے بہانے اپنے انڈے پراٹھے اور مرغ پلاؤ کا مستقل بندوبست کر لے۔ کلکتہ میں کامیابی نہ ہوئی تو زہرہ کو لے کر دہلی آئی۔ یہ تصویر (مولینا نے تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہا) وہیں کھنچوائی گئی تھی۔ دہلی میں جلد ہی ایک موٹا شکار پھنس گیا یہ وہی بمبئی والا سیٹھ تھا جو کسی کاروباری ضرورت سے دہلی آیا ہوا تھا۔ اس نے "تین سو روپیہ ماہوار اور کل مصارف" پر زہرہ کو نوکر رکھ لیا، اسے ابھی کہیں اور بھی جانا تھا۔ لہذا کرایہ اور دوسرے ضروری اخراجات کے لئے ان لوگوں کو کافی روپیہ دے کر اور ایک مقررہ تاریخ پر بمبئی پہونچنے کی تاکید کر کے اپنی منزل مقصود کی جانب روانہ ہو گیا۔ اسی شب کو بڑھیا اور بڈھے میں کسی بات پر تکرار ہوئی۔ زہرہ دوسرے کمرے میں سو رہی تھی۔ مگر ان کے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ بڈھا کہہ رہا تھا "تو نے اس معصوم کو جس طرح برباد کیا ہے اس کا انجام دیکھ لے گی!" اس کے بعد وہ سب واقعات دُہرائے جو بڑھیا نے کلکتہ میں اس سے بیان کئے تھے۔ اور جن کا کچھ حصہ زہرہ پہلے بھی سن چکی تھی۔ پھر یہ دھمکی بھی دی کہ "اگر مجھ سے ذرا تین پانچ کی تو پولیس میں خبر کر کے جیل میں سڑوا دوں گا" زہرہ نے کواڑ کی دراڑ میں سے جھانک کر دیکھا۔ بڑھیا برافروختہ افیمی کے قدم پکڑے اس سے خاموش رہنے کی التجا کر رہی تھی۔ بہرحال اب زہرہ کو اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ اسے کس طرح فریب دیا گیا۔

بمبئی سے آتے ہوئے جب اس نے مجھے اپنے حالات سنائے تو کیا دس بیس مرتبہ بھی نہ روئی ہو گی۔ وہ منصور کے لئے تباہ تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ "جس طرح ہو

منصور کا پتہ لگا دو۔ زندگی بھر احسان نہ بھولوں گی۔ ایک لونڈی کی طرح خدمت کروں گی"
جب تک میں نے یہ واقعات نہیں سنے تھے میں کچھ اور ہی خواب دیکھ رہا تھا۔ مگر اب صورتِ معاملہ بالکل دوسری تھی۔ آپ اسے میری پست فطرتی کہیں یا جو چاہے سمجھیں اس وقت بھی مجھے یہ خیال ضرور تھا کہ اگر منصور کا پتا نہ چلا (اور پتا چلنے کا امکان کم تھا) تو میں ضرور زہرہ کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اس طرح گویا زہرہ کے ساتھ میری ہمدردیاں بالکل بے غرضانہ نہ تھیں۔ شاید میں نے آپ سے بیان نہیں کیا کہ زہرہ کا کل زیور اب تک بالکل محفوظ تھا جسے وہ بمبئی سے اپنے ہمراہ لے آئی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ اشرفیاں بھی اُس کے پاس تھیں اُس نے یہ سب چیزیں میرے سپرد کر دی تھیں۔ چار دن کے بعد میں پھر زہرہ سے ملا۔ اُس کی حالت پہلے سے زیادہ تباہ تھی۔ سردار نے بتلایا کہ اُس کا زیادہ وقت رونے میں کٹتا ہے۔ بہت کم کھاتی ہے۔ بہت کم سوتی ہے۔ میں نے بہت کچھ اس کی تسلّی تشفّی کی اور کہا کہ ابھی تازہ واقعہ ہے ذرا بات ٹھنڈی پڑ جائے تو میں خود فیض آباد جا کر منصور کا پتا لگاؤں گا۔ اور وہ جہاں بھی ہوگا اُسے ڈھونڈھ نکالوں گا۔ زہرہ میرے قدموں سے لپٹ گئی اور روتے روتے اُس کی ہچکی بندھ گئی۔ مگر اس نے ایک لفظ بھی زبان سے نہیں کہا۔ میں اُسے دلاسا دے کر بجے پور واپس آیا۔ اب میرا یہ معمول ہو گیا کہ میں ہفتہ میں دو بار زہرہ سے ملتا۔ چند گھنٹے اُس کے پاس ٹھہرتا اور تسلّی تشفّی کر کے چلا آتا۔ ایک مہینہ اسی طرح گذر گیا۔ خدا معلوم سیٹھ اور بڑھیا نے کیا کارروائی کی مگر زہرہ کی تلاش میں بجے پور تک کوئی نہ پہونچا۔ آخر میں اپنے وعدہ کے مطابق فیض آباد گیا۔ وہ مقام فیض آباد سے کچھ ایسا دور نہ تھا۔ حالات کی تحقیقات کی معلوم ہوا کہ گمشدگی کے چوتھے دن منصور کی لاش فیض آباد کے قریب دریا سے گھاگرا سے برآمد ہوئی۔ مجھے اس اَلم ناک حادثہ کا جہاں رنج تھا وہاں خوشی بھی تھی۔ سب مجھے

یقین تھا کہ اب زہرہ میری ہے۔ رہا منصور کا غم، تو رفتہ رفتہ بھول ہی جائے گی۔ مرنے والے کے ساتھ آخر کوئی مر نہیں جاتا۔ میں انتظار کروں گا یہاں تک کہ وہ مجھ سے مانوس ہو جائے۔ فیض آباد سے واپس آکر میں نے زہرہ کو منصور کی موت کا حال سنا دیا۔ معلوم ہوا کہ اس پر بجلی گری جس نے اُس کی روح سلب کرلی۔ نہ اُس نے آہ کی، نہ روئی، بالکل خاموش بیٹھی رہی، اُسے سکتہ سا ہوگیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں اس کے قلب کی حرکت نہ بند ہو جائے۔ وہ حیرت زدہ ہو ہو کر اِدھر اُدھر دیکھتی تھی اور بس۔ غم کی شدت نے غم کا احساس ہی مٹا دیا تھا۔ میں نے اُسے رُلانے کی بہت کوشش کی اور بہت دیر کے بعد اُس کی آنکھیں نم ناک ہوئیں۔ اب جو رونا شروع کیا تو آنسوؤں کا تار کسی طرح نہیں ٹوٹتا۔ وہ ہائے منصور کہہ کر ایک چیخ مارتی اور اپنی آنکھیں اور چہرہ اپنے ہاتھوں سے چھپا لیتی۔ ایک ذبح کئے ہوئے پرند کی مانند پھڑک رہی تھی جس میں ابھی کچھ جان باقی ہو۔ یہ رقت انگیز منظر مجھ سے دیکھا نہ گیا اور میں بھی بے اختیار رو پڑا۔ رات میں نے وہیں گذاری الفاظ میں قدرت نہیں جو زہرہ کی اُس تباہ حالی کا نقشہ کھینچ سکیں۔ صبح کو میں جے پور واپس آیا۔ زہرہ سے یہ وعدہ تھا کہ اُس کے قیام کا مناسب بندوبست کرکے دو تین دن میں اُسے جے پور لے جاؤں گا۔ چنانچہ تیسرے دن سر شام میں خانہ بدوشوں کے ڈیروں پر پہونچا۔ زہرہ اُس وقت جھونپڑے میں موجود نہ تھی۔ سردار نے کہا شاید لڑکیوں کے ساتھ کسی طرف نکل گئی ہے۔ ابھی بلواتا ہوں۔ ایک آدمی گیا، دوسرا گیا، تیسرا گیا۔ مگر زہرہ آج آتی ہے نہ کل۔ اس میں رات ہوگئی۔ میں سخت پریشان ہو رہا تھا۔ آخر سردار نے خود اُٹھا کہ میں ابھی تلاش کرکے لاتا ہوں۔ آدھے گھنٹے کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ اپنی بیوی اور سب بیٹے بیٹیوں کو ساتھ لئے چلا آتا ہے سب خاموش ہیں۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ پاس آکر اُس نے تلوار نیام سے نکالی اور

میرے ہاتھ میں دے کر نہایت غمناک لہجہ میں کہا " افسوس! ہم سے آپ کی امانت کی حفاظت نہ ہو سکی ۔ وہ ضائع ہو گئی ۔ اب اس کے بدلے ہم میں سے آپ جس کی چاہیں گردن مار دیجیے " سردار کے یہ الفاظ سُن کر میری آنکھوں تلے اندھیرا سا چھا گیا ۔ کھڑا ہوا تو میرے قدم ڈگمگانے لگے ۔ آخر میں اُس سے تفصیل کا طالب ہوا تو وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے چلا ۔ جھونپڑوں سے کوئی آدھے میل کے فاصلے پر ایک پہاڑی کے پاس گڑھے میں زہرہ کی لاش خون میں لتھڑی ہوئی پڑی تھی ۔ اُس نے پتھروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر جان دے دی تھی "

مولینا کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی ۔

True story 1

True story - سچی کہانی

سچّی کہانی

سی نوری تا

عشق! جس طرح تیری کبھی نہ بھولنے والی صورت عمر بھر سے دل پر نقش ہے اُسی طرح آج میں نے تیرا نام بھی نشتر کی نوک سے اپنے سینے پر کندہ کر لیا تاکہ اندر سے باہر تک میری روح اور جسم کا ہر ہر ذرّہ تیرے ظلم و ستم کی یاد سے لطف اندوز ہوتا رہے۔ میرے خط کو بار بار غور سے کیا دیکھتے ہو۔ یہ روشنائی نہیں دل کا خون ہے تمہیں یقین تو کیوں آنے لگا، خیر مضائقہ نہیں۔ تم جانتے ہو میں کوئی ڈاکٹر نہیں۔ میں نہیں جانتی نشتر کیسے پکڑتے ہیں، کس طرح اُسے سینے میں پیوست کرتے ہیں۔ جب تک تمہارا نام تمام ہو، ڈھیروں خون نکل گیا۔ کپڑوں پر جابجا دھبے ہیں۔ یوں کہنا چاہیے کہ دامن رنگین پھولوں سے بھرا ہے۔ کتنا خون میں نے چینی کی پیالی میں جمع کر لیا۔ اُسی سے یہ خط لکھ رہی ہوں۔ یہ میری آخری تحریر اور آخری ناکام کوشش ہے۔ تمہارے بے حس دل میں درد پیدا کرنے کی۔ اپنی دیوانگی پر خود ہنستی ہوں۔ تم اور درد کا احساس! دیوار میں چھری بھونکنے سے دیوار کو تکلیف ہو گی؟

عشق! میں نے اپنا لڑکپن، اپنی جوانی، اپنا ننگ و ناموس، اپنا بھرا گھر، اپنا

شوہر، بچے، والدین، سب کچھ تیرے لئے قربان کر ڈالا۔ مگر بے حس، بے درد، پتھر کی مورت! تو نے کبھی اپنے ہاتھ سے میرے آنسو بھی نہ پونچھے۔ بارہ برس کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے، اُس وقت سے یہ لگن میرے دل میں لگی۔ بّبا کے مُنہ سے سُنا کرتی تھی کہ عشّن بڑا شوخ ہے، بڑا باتون ہے، بڑا ذہین ہے، آواز بھلی ہے، لوگ سمجھتے تھے کہ بّبا خواہ مخواہ اپنے بیٹے کی تعریفیں کیا کرتے ہیں۔ مگر تمہاری باتیں سُن کر میرا دل خود بخود تمہاری طرف کھنچتا تھا۔ ایک دن میں نے بّبا سے کہا "تو پھر آپ عشّن کو آگرے کیوں نہیں بلواتے، ہمارا تو اُنہیں دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے"۔ اُنہوں نے جواب دیا "اب کے امتحان دے لے تو ضرور بلوائیں گے"۔ ایک برس اور گذر گیا۔ اب تمہاری آمد آمد ہوئی۔ آہ۔ کیا کہوں وہ انتظار کے دن کیسے کاٹے۔ کیسا شوق تھا، کیسی بے چینی تھی۔ اُس وقت میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ اب سمجھتی ہوں کہ مجھے بن دیکھے تجھ سے محبت ہو گئی تھی۔ تم آئے۔ ہمارے یہاں دعوت ہوئی۔ خدا جانے کیوں مجھے تمہارے سامنے ہوتے ہوئے شرم آتی تھی۔ کھانا چنا گیا، اماں نے تولیا اور صابن مجھے دیا کہ جا ہاتھ دھلا۔ میں آتی نہ تھی۔ اُنہوں نے زبردستی بھیجا۔ میں نے لوٹے سے تمہارے ہاتھوں پر پانی ڈالا۔ تم نے سر اُٹھا کر ایک عجیب انداز سے میری طرف دیکھا اور مُسکرائے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ تمہاری آنکھوں سے ایک بجلی نکلی اور میرے سینے میں در آئی۔ میرا سارا بدن تھر تھر کانپنے لگا۔ بے رحم صیّاد! تیری اس پہلی ہی نظر نے میرے دل کا کام تمام کر دیا۔ کیسی خوشی ہوتی تھی جب میں تمہیں دیکھتی، تم سے باتیں کرتی، تمہارے ہنسانے والے فقرے سنتی۔ تم مجھے بناتے، میں اس پر بھی خوش ہوتی۔ کئی مہینے اسی طرح گذر گئے۔ جب میں سُنتی کہ تمہاری شادی ہونے والی ہے تو میرا دل لرز لرز جاتا۔ میں سمجھتی کچھ نہ تھی، مگر محسوس کرتی تھی۔ تمہاری بیباکیوں اور میری بیتابیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ تم سے میرا

پردہ ہوگیا۔ اب مجھے تمہارے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ آخر تمہاری شادی کی تاریخ مقرر ہوئی۔ تم شادی کے سخت مخالف تھے، جب کوئی صورت نجات کی نہ دیکھی، تو سب سے چھپ کر آدھی رات کو بے سروسامان گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ تمہاری تلاش میں کہاں کہاں آدمی نہیں دوڑائے گئے۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں راتوں کو جاگی اور چھپ چھپ کر روئی۔ سونا چاہتی تھی اور نیند نہ آتی تھی۔ ہر ایک سے تمہارا حال پوچھتی۔ تمہاری واپسی کے لئے دعائیں مانگتی۔ وظیفے پڑھتی یہاں تک کہ لوگ تمہاری اس گم شدگی اور میرے نمایاں اضطراب میں ایک ربط سمجھنے لگے۔ بڑے چھوٹے سبھی مجھے قہر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ آخر "فرار" کے دسویں دن تم دہرہ دون سے "گرفتار" ہو کر آئے اور پھر سیدھے لکھنؤ بھیج دیئے گئے۔ سال بھر کے بعد آخر تمہاری شادی ہوگئی۔ میں ڈاک سے تمہیں خط نہیں بھیج سکتی تھی۔ بھولے تو نہ ہوگے، اس دوران میں ایک ایک خط دست بدست تم تک پہونچانے کے لئے مجھے کتنی قیمت دینی پڑی ہے۔ اور پھر تم میرے خطوں کے ساتھ جو سلوک کرتے تھے وہ بھی تمہیں یاد ہوگا۔ آہ بے درد، کبھی تو نے میری کسی تحریر کا جواب نہ دیا اور زندگی بھر میری آنکھیں تیرے ہاتھ کے لکھے ہوئے چند جملوں کے لئے ترستی رہیں۔ دو برس بعد میری بھی شادی ہوگئی۔ عقد کے گھڑی بھر بعد میرا بے ہوش ہو جانا۔ اور مدتوں صاحب فراش رہنا شاید تم نے سنا ہوگا۔ پھر صحت کے بعد بھی ڈیڑھ برس تک کسی نہ کسی حیلے سے میں نے انہیں "ان" کے تمام حقوق سے محروم رکھا۔ آخر ایک دن آیا کہ مجھے اپنا جسم ان کے حوالے کر دینا پڑا۔ مگر میری روح اور میرے قلب کو کبھی ان سے حقیقی وابستگی نہیں ہوئی۔

ہائے میری بھری جوانی اور جوانی کی آرزوئیں تیری بے التفاتی کے ہاتھوں کس طرح ملیامیٹ ہوئیں۔ ایک دفعہ تم نے کسی سے کہا تھا "جواہرات میں مجھے زمرد

بہت پسند رہے" میں نے بھی سُنا۔ اُس وقت میرے پاس نقد روپیہ موجود نہ تھا میں نے اپنے گلے کا ہار بیچ کر زمرد کے نگینے کی انگوٹھی تمہارے لیئے بنوائی اور ہزاروں التجاؤں کے ساتھ تمہارے پاس بھیجی کہ اسے اپنے سے جُدا نہ کرنا۔ میں خوش تھی کہ بلا سے میری ایک نشانی تو تمہارے پاس ہے۔ اسی بہانے کبھی نہ کبھی تمہیں میرا خیال آجاتا ہوگا۔ مگر ابھی پچھلے مہینے میں نے اختر کی دُلہن کے ہاتھ میں وہ انگوٹھی دیکھی سنّاٹے میں آگئی۔ دل سے دھوئیں اُٹھنے لگے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ تم نے انہیں شادی کے تحفہ میں دی تھی، تمہاری چیز تھی دے ڈالی اچھا کیا۔ مگر تمہیں اتنا بھی خیال نہ آیا کہ آخر اختر دُلہن آگرہ جائیں گی اور اگر میں اُن کے ہاتھ میں یہ انگشتری دیکھوں گی تو میرے دل پر کیا گذرے گی؟ میں بھی کیسی نادان ہوں۔ جیسے تمہیں میری اور میرے دل کی بڑی پروا ہے۔

شادی کے بعد سب سے پردہ چھوٹ گیا۔ فقط تم سے باقی رہا۔ بزرگوں نے اسی میں مصلحت دیکھی۔ تم کئی بار آگرہ آئے مگر میں تمہیں نہ دیکھ سکی۔ جب سُنا کہ تم آئے ہو۔ کلیجہ مسوس کر رہ گئی۔ دس برس گذر گئے۔ میں تین بچوں کی ماں ہو گئی۔ دنیا کو پچھلے واقعات فراموش ہو گئے۔ مگر کیا بد نصیب، رشیدہ بھی بھول گئی؟ نہیں، عشق! تیرے ہی سر کی قسم کہ تجھ سے زیادہ عزیز نہ مجھے زندگی میں کوئی تھا نہ ہے، میں تو کبھی دو چار دن کے لئے بھی تجھے نہ بھولی۔ وہ تیرا پہلی بار مُسکرا کر مجھے دیکھنا آج تک یاد ہے۔ ایک وہی کیا، اور کون سی بات بھولی ہوں۔ تیرا اُٹھنا، بیٹھنا، ہنسنا، بولنا، پڑھنا، گانا، ایک ایک چیز کی تفصیل اُسی طرح میرے دماغ میں محفوظ ہے۔ آج تک تیری آواز میرے کانوں میں گونجتی ہے۔ وہ ایک غزل کی نئی دھن تم نے نکالی تھی:۔

زہر دے اُس پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا

مجھے خبر نہ تھی کہ یہ الفاظ میری سرنوشت بن جائیں گے۔

جس طرح تم دوبارہ میری زندگی میں داخل ہوئے وہ بھی تمہیں یاد ہوگا۔ گرمیوں کی تعطیل میں تم آگرہ آئے ہوئے تھے۔ جمیلہ سخت بیمار تھی۔ ابّا تو اُسے دیکھنے روز آتے تھے۔ ایک دن اُن کے ساتھ تم بھی آئے۔ وہ تو اوپر آگئے۔ تم "اِن" کے پاس نیچے مطب میں ٹھہر گئے۔ ولایت جانے کا تو بہانہ ہوا۔ آزاد خیالی "اِن" کے مزاج میں پہلے ہی سے تھی۔ یہ تمہیں لئے ہوئے اوپر آگئے۔ میں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ دس برس کے بعد پھر پردہ ٹوٹا۔ خوابیدہ آرزوئیں بیدار ہوگئیں۔ آگ جو مدّت سے سُلگ رہی تھی ایک دم بھڑک اُٹھی اور اپنا حال اور مستقبل سب کچھ میں نے اُس کے شعلوں میں جھونک دیا۔ جب تک تم آگرہ رہے، برابر ہمارے یہاں آتے جاتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب سے بہت خصوصیت ہوگئی۔ شاید تمہیں یاد ہو، ایک دن جمیلہ تمہاری گود میں بیٹھی تھی۔ تم ڈاکٹر صاحب سے جمیلہ کی آنکھوں کی تعریف کرنے لگے۔ پھر تم نے کہا "مگر اس بیچاری کو آنکھوں کے سوا ماں سے اور کچھ بھی نہیں ملا" کیا اس کے یہ معنی نہیں ہوئے کہ میری شکل و صورت اگر دل فریب نہیں تو نفرت انگیز بھی نہیں۔ ایک اور واقعہ یاد دلاؤں۔ چھوٹی باجی سے تم نے میرے بالوں کی، میری آنکھوں کی، میری چال کی، اور میری آواز کی، تعریف کی تھی۔ تم شاعر ہو، شاید مبالغہ کیا ہوگا، مجھے بنانے کے لئے۔ مگر یہ بھی درست نہیں، کیونکہ بظاہر ان باتوں کے مجھ تک پہونچنے کا کوئی امکان نہ تھا، اچھا، میں نے مانا کہ میری صورت میں کوئی دلکشی نہیں، میری سیرت میں کوئی جاذبیت نہیں، مگر کیا میری قربانیاں بھی اس لائق نہ تھیں کہ تم اپنے التفات کا کوئی حصّہ بھیک کے طور پر مجھے دے دیتے۔ اس دو برس کے واقعات اور اپنی خدمتوں کو نہیں دُہراؤں گی۔ تم سب کچھ جانتے ہو۔ بس اتنا پوچھتی ہوں کہ کیا میں نے اپنا بھرا گھر تمہارے لئے خاک میں نہیں ملا دیا۔ کیا میں نے دنیا بھر کی ملامتیں اور رسوائیاں تمہاری خاطر برداشت نہیں کیں۔ کیا میں دولت

کے ڈھیر پر لات مار کر تہیں کھڑی ہو گئی۔ کیا میرے پھول سے بچے، میرے جگر کے ٹکڑے، تمہارے باعث مجھ سے نہیں چھن گئے۔ کیا میں نے ایسے شوہر سے جو مجھ پر جان چھڑکتا تھا۔ ہمیشہ کے لئے قطع تعلق نہیں کر لیا۔ فقط اتنی سی بات پر کہ وہ میری اور تمہاری یک جائی کو شک کی نظر سے دیکھتا تھا۔ بولو نا۔ چپ کیوں ہو۔ کیا اس میں کوئی بات جھوٹ ہے؟ ہاں تمہارے ہونٹ ہل رہے ہیں، نہ کہو، نہ کہو، للہ نہ کہو، جو کچھ تم کہنے والے ہو میں سمجھ گئی۔ سچ ہے تم نے مجھ سے نہیں کہا تھا کہ ایسا کرو مگر میں نے جو کچھ کیا، کیا تمہارے ہی لئے۔ اچھا اتنا بتا دو، ایسی کوئی اور مثال بھی تمہاری نظر میں ہے۔ کسی اور نے بھی تمہارے لئے یا کسی کے لئے خود کو اس طرح مٹایا ہے۔ اس طرح برباد کیا ہے۔ اس طرح جوگ لیا ہے۔ عشّن! میں کچھ اور نہیں چاہتی۔ للہ، ایک بار مجھے اپنی صورت اور دکھا دے۔ اس کے بعد میں پھر کبھی تجھے کوئی تکلیف نہ دوں گی۔ ہجرت کا ارادہ میرا پختہ ہے۔ غوث اعظم کی چوکھٹ پر جا پڑوں گی اور خدا سے دعا مانگوں گی کہ پروردگار! عشّن کے دل کو نرم کر دے۔ پھر مدینے جاؤں گی اور سبز گنبد والے کے دربار میں فریاد کروں گی۔ وہاں سے مکّہ معظمہ پہونچ کر، کعبہ کا پردہ تھام کے آنکھوں سے خون کی ندیاں بہاؤں گی، پیر، پیغمبر، خدا، کوئی تو میری سُنے گا۔ سب تیری طرح مجھ نامراد گناہگار سے بیزار نہ ہو جائیں گے ...."

یہ خط جس کا ایک حصّہ اوپر نقل کیا گیا، اس وقت میرے سامنے موجود ہے بے شک یہ خون سے لکھا ہوا ہے۔ مگر میں یقین کے ساتھ نہیں کر سکتا کہ یہ خون انسان کا ہے یا کبوتر کا۔ درا صل میں عورتوں کے بارے میں چنداں خوش گمان نہیں ہوں اس خط میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ ایک بڑی حد تک صحیح ہیں اور جو الزامات

مجھ پر لگائے گئے ہیں، وہ بھی سب غلط نہیں۔ اس تحریر کو پڑھ کر رشیدہ کی بربادیوں پر ایک اجنبی کا دل ضرور کڑھے گا اور وہ مجھے کشتنی و سوختنی سمجھے گا مگر درحقیقت میرا قصور اتنا نہیں جتنا بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ میری تمام زندگی ایک ختم نہ ہونے والی ٹریجڈی ہے۔ اس سے بڑھ کر بدنصیبی اور کیا ہو سکتی ہے کہ جس نے خود سے مجھے چاہا مجھے کبھی اُس سے دل بستگی پیدا نہیں ہوئی اور جسے میں نے چاہا میں کبھی اُسے حاصل نہ کر سکا۔ رشیدہ کی محبت میں کوئی شک نہیں۔ اُس کی قربانیاں بھی تسلیم۔ مگر میں اپنی اُفتادِ طبیعت کو کیا کروں۔ آخر محبت جبر سے نہیں ہوتی۔ رشیدہ کی پاسداری جس قدر ممکن تھی میں نے کی۔ مگر میں اپنے دل کو اس سے محبت کرنا نہ سکھا سکا۔ اس میں میرا کیا اختیار۔ واقعات جو میں آئندہ بیان کرنے والا ہوں، اُن کا رشیدہ کی ذات سے براہ راست کوئی گہرا تعلق نہیں۔ مگر یہ خط اس لئے نقل کیا گیا کہ قارئین کو بعض پیچیدہ معاملات کے سمجھنے میں اُلجھن نہ ہو اور سلسلۂ بیان مربوط رہے۔

میری زندگی کا آخری رومان بھی ٹریجڈی بن کر تمام ہوا اور اپنے ساتھ مجھے بھی تمام کر گیا۔ تین برس گذر گئے۔ سنہ ۱۹۲۸ء میں گرمیوں کی تعطیل میں حسب معمول میں آگرہ گیا۔ میرے ایک دوست ہیں محمد مبین۔ آگرہ کے رہنے والے۔ اپنے صوبہ کے کسی کالج میں پروفیسر ہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ بھی چھٹیوں میں گھر آئے ہوئے ہیں۔ مدت سے مجھ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ میں اُن کے یہاں گیا۔ دیکھا مکان مردانہ ہے۔ مجھے تعجب ہوا۔ مبین بڑے تپاک سے گلے ملے۔ بٹھایا۔ نوکر کو آواز دی کہ لیموں کا شربت بنا کر لا۔ پنکھا کھول دیا۔ میں نے بیٹھتے ہی پہلا سوال یہ کیا کہ "بھاوج کہاں ہیں؟" وہ ابھی کچھ جواب نہ دینے پائے تھے کہ انّا ایک ننھی بچی کو

گود میں لئے ہوئے سامنے سے آ گئی۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا کہ ماجرا کیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ مبین کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے ہیں۔ میں اور بھی حیران ہو گیا۔ میں نے گھبرا کر پوچھا "کیوں خیر تو ہے؟" مبین نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا طاہرہ بی ہمیشہ کے لئے ہم سے رخصت ہو گئیں، یہ کہا اور ٹپ ٹپ آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

یوں تو مرنے کو لوگ ہر روز مرتے ہیں اور جو پیدا ہوا ہے اُسے ایک دن مرنا بھی ضرور ہے۔ مگر جوانا مرگی خدا دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔ طاہرہ بی نے زندگی کی کل بیس بہاریں دیکھیں۔ اٹھارویں سال ایف، اے پاس کیا۔ اسی سال مبین سے شادی ہو گئی۔ انیسویں سال نجمہ کی ولادت ہوئی۔ بیسویں سال خود چل بسیں۔ ایسی لڑکیاں روز پیدا نہیں ہوتیں۔ اچھی صورت، اچھی سیرت، کون سی خوبی تھی جس کی ایک شوہر تمنا کر سکتا ہے اور طاہرہ بی میں موجود نہ تھی۔ مبین کا اندوہ و ملال بیجا نہ تھا۔ نجمہ کی ولادت ہی طاہرہ کی موت کا باعث ہوئی۔ اس لئے بعض جاہل عورتیں کہتی تھیں کہ بچی منحوس ہے۔ ماں کو کھا گئی۔ مگر ظاہر ہے کہ اس ننھی سی جان کو سعادت و نحوست سے کیا علاقہ جو خدا کی مرضی تھی وہ ہوا۔ نجمہ اب دس مہینے کی تھی اور خاصی تندرست تھی مبین اُسے حد سے زیادہ چاہتے تھے۔ مگر اس کی پرورش ایک دشوار مرحلہ تھا۔ مبین کی بہن کی یہ خواہش تھی کہ وہ جلد دوسری شادی کر لیں۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح مبین کا بھی غم غلط ہو جائے گا اور بچی کی پرورش میں بھی سہولت ہو گی۔ مبین کو پہلے تو انکار رہا مگر تمام مصلحتوں پر غور کرنے کے بعد آخر نیم راضی ہو گئے۔ اب لڑکی کی تلاش تھی ایسی لڑکی جو صحیح معنوں میں طاہرہ مرحومہ کا بدل ثابت ہو سکے۔ چند روز کے بعد جب دوسری ملاقات ہوئی تو مجھ سے بھی انہوں نے اس ذکر کو چھیڑا۔ حسنِ اتفاق کہئے یا سوءِ اتفاق، اسی دن شام کو رشیدہ نے مجھے بلا بھیجا۔ میں گیا۔

گرمی سخت تھی۔ رشیدہ اس وقت غسل کر رہی تھیں۔ ایک فیشن ایبل "مسماۃ" خوب بناؤ چناؤ کئے بڑے ٹھسے سے کرسی پر بیٹھی جمیلہ کو پڑھا رہی تھیں، انہوں نے مجھے دیکھ کر کہا "تشریف لائیے، جمیلہ کی اماں ابھی آتی ہیں۔ نہارہی ہیں" جمیلہ کی استانی صاحبہ بڑی "چٹاخ پٹاخ" بڑی تیز طرار تھیں۔ اتنے رشیدہ آئیں، ان سے خاصی بے تکلفی ہو گئی۔ نام پوچھا۔ کہا "نورجہاں" میں نے کہا ماشاء اللہ نام تو آپ کا بڑا رومانٹک ہے۔ کہا جی ہاں، میں تو اپنے آپ کو اس نام کے قابل نہیں سمجھتی، مگر مسٹر سلیم سے شادی کے بعد جب میں مسلمان ہوئی تو انہوں نے اپنے نام کی رعایت سے میرا نام نورجہاں رکھ دیا۔ معلوم ہوا پہلے آپ عیسائی تھیں، وینفرڈ نام تھا ہسپتال میں کام کرتی تھیں، میاں سلیم وہاں کمپاؤنڈر تھے۔ وہیں جہانگیر اور نورجہاں کے کبوتروں والے قصے کی طرح کوئی واقعہ پیش آیا اور میاں سلیم اپنی بیاہتا بیوی کو چھوڑ چھاڑ مس وینفرڈ کی غلامی میں داخل ہو گئے۔ مگر مذہب کے معاملہ میں سخت تھے ذرا کٹر اس لئے مس وینفرڈ کو نورجہاں بننا اور گرجا کو مسجد سے بدلنا پڑا۔ اس ہنگامے کے سلسلہ میں ہسپتال سے دونوں کی نوکری چھوٹ گئی۔ بیوی اب پرائیویٹ ٹیوشن کرتی تھیں اور میاں ڈاکٹر عبدالحمید رشیدہ کے شوہر کے دواخانہ میں ملازم تھے۔ ہمارے محلے میں قریب ہی کرایہ کے مکان میں رہتے تھے۔ دوران گفتگو میں متین کی شادی کا ذکر نکل آیا۔ میں نے رشیدہ سے کہا "تمہیں کوئی اچھی لڑکی معلوم ہو تو بتاؤ"۔ انہوں نے کہا "استانی جی سے پوچھئے۔ ان کی ہر جگہ پہونچ ہے۔ استانی جی سر کو جھٹکا دے کر، ساڑی کا پلو سنبھالتے ہوئے بڑے انداز سے بولیں لڑکی تو ایسی بتادوں کہ بایدوشاید۔ صورت دیکھے سے بھوک بھاگے۔ مگر مٹھائی کھلوانا ہوگی" میں نے کہا "مٹھائی کیا چیز ہے آپ کہیں تو ہم آپ کو رات بھر کے لئے

حلوائی کی دکان میں بند کرا دیں۔ اچھا آپ نے اس لڑکی کو دیکھا تو ہوگا؟" کہا "میں نے دیکھا تو نہیں۔ اپنی ایک سہیلی سے تعریف سُنی ہے۔ پورا حال بھی انہیں سے معلوم ہوگا۔ آپ کہیں تو کل انہیں اپنے ساتھ لیتی آؤں؟" میں نے کہا "سبحان اللہ! نیکی اور پوچھ پوچھ۔ میں کل مُبین کو بھی ساتھ لیتا آؤں گا۔ چنانچہ اگلے دن ہم سب رشیدہ کے ہاں جمع ہوئے اور ڈاکٹر حمید کے نشست کے کمرہ میں بیٹھے۔ نورجہاں کی سہیلی بھی ماشاء اللہ نور کی پتلی تھیں۔ آبنوسی رنگ، نوبین پالش کی طرح چمک دار، چیاں سی آنکھیں۔ سر شانوں پر رکھا ہوا۔ شاید بناتے وقت فرشتے گردن لگانا بھول گئے تھے۔ پتلی پتلی ٹانگیں۔ جیسے بانس کے ڈنڈے۔ پنڈلیوں میں خم۔ کمان کا سا انداز۔ اس پر انگریزی سایہ۔ ماشاء اللہ کیا ہی زیب دیتا تھا۔ نام آپ کا مس خان، آپ کے دادا مسلمان سے عیسائی ہوئے تھے اور لکھنؤ سے ترک وطن کرکے آگرے آ بسے تھے۔ قدرت کی ستم ظریفیاں بھی ایک سے ایک نرالی ہوتی ہیں۔ یہ صورت، یہ دھج۔ مگر اس کالی مکڑی کی زبان ایسی شُستہ، گفتگو ایسی شائستہ و شگفتہ کہ شک ہوتا تھا کہ واقعی یہ الفاظ اسی کالے پنجر میں سے نکل رہے ہیں یا اس کے پیچھے چھپا ہوا کوئی اور بول رہا ہے۔

میں نے کہا "مس خان! اُستانی جی نے آپ کو بتا ہی دیا ہوگا کہ آج کس لئے آپ کو زحمت دی گئی ہے۔ لہٰذا اب جو کچھ آپ کو معلوم ہو بیان فرمائیے۔"

مس خان نے کہا "سنیئے حضرت! مبالغہ کی میری عادت نہیں مبین صاحب کو اگر معیاری حُسن کی تلاش ہے تو اس لڑکی کا خیال بیکار ہے۔ ہاں اچھی صورت مطلوب ہے تو اس میں کوئی کمی نہیں۔ ہزاروں میں نہیں تو سیکڑوں میں انتخاب صورت، سیرت، تعلیم، تربیت، خاندانی وجاہت، خدا نے سبھی کچھ اُسے دیا ہے۔"

اس کے بعد مس خان نے ہماری ہونے والی بھاوج کی شکل و شمائل اور اطوار و

خصائل پر ایک خوبصورت اور دل چسپ پیرائے میں تبصرہ شروع کیا۔ مُبین بڑی توجہ سے سن رہے تھے میں بھی ہمہ تن گوش تھا۔ مگر میرا اشتیاق رفتہ رفتہ اضطراب میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ اپنی مذکورہ بالا ہڑبڑی کے دو برس بعد تک تو مجھے کسی بات کا ہوش ہی نہ تھا۔ مگر اب کوئی سال بھر سے یہ کیفیت تھی کہ جہاں کوئی ایسی صورت دیکھی جو کسی حد تک میری "حورا" سے مشابہ ہوئی، بس دل بے اختیار اس طرف کھنچنے لگا۔ جمال درعنائی کے ہزار دل فریب نمونے سامنے موجود ہوں مگر جب تک کسی کا کوئی انداز، کوئی ادا میری "حورا" سے نہ ملتی ہو میرے لئے اُس کی حیثیت ایک مٹی کی مورت یا بے جان تصویر سے زیادہ نہ ہوتی۔ مس خان کے بیان نے "حورا" کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے لا کر کھڑی کر دی۔ جو کچھ وہ کہتی معلوم ہوتا کہ میری "حورا" کو سامنے بٹھا کر اس کا سراپا بیان کر رہی ہے۔ میں بے چین ہو کر کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے حمید کے لکھنے کی میز کے برابر سے گذرا۔ میز پر ایک بڑا سا کاغذ لپٹا پڑا تھا۔ میں نے اُسے اُٹھا لیا۔ اور کھول کر دیکھا۔ آنِ واحد میں ایک عجیب کیفیت مجھ پر طاری ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے لئے میرے بعض حاسوں نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ اب مجھے مس خان کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ مجھے اس کاغذ کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا اور اُس کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس نہ تھا۔ خدا جانے کے منٹ تک میں اس طرح کھڑا رہا اور نہ معلوم کب تک اسی طرح مبہوت رہتا کہ کسی نے وہ کاغذ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ اور تخیل و تصوّر نے جو طلسم باندھا تھا وہ درہم برہم ہو گیا۔ اب سب کی نظریں اس کاغذ پر تھیں مس خان نے نہایت استعجاب کے لہجہ میں کہا:۔

"واللہ کمال ہے۔ بس چہرے کا بالکل یہی انداز ہے"۔ میں پھر چند لمحہ کے لئے بیرونی دُنیا سے بے خبر ہو گیا۔

یہ کاغذ دراصل جرمنی کا بنا ہوا ایک کیلنڈر تھا جو برلن کی کسی دوا فروش کمپنی نے

ڈاکٹر حمید کو بھیجا تھا۔ اس میں ایک نوجوان لیڈی کی تصویر تھی۔

میں نے مس خان سے کہا "سب کچھ تو آپ نے بتلایا۔ مگر اس نیک بخت خاتون کا نام اب تک ہم لوگوں کو معلوم نہ ہوا"

انہوں نے کہا "نام سلطان ہے"

مبین بے چارے سادگی سے بولے "سلطان! عجب مردانہ نام ہے"

مس خان نے بھنوؤں کو ایک خاص انداز سے جنبش دے کر جس سے شرارت ٹپکتی تھی، کہا:۔

"مگر میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ سلطان کے عورت ہونے میں کوئی شک نہیں اور اس میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو ایک عورت کو مرد سے ممتاز کرتی ہیں۔ رہ گیا نام تو اس میں اس خاکسار کا کوئی قصور نہیں، وہ تو ان کے والدین کا رکھا ہوا ہے اور دراصل پورا نام تو سلطان جہاں ہے۔ فرمائیے اب کیا خیال ہے؟"

مس خان کے یہ چست فقرے سن کر سب ہنس پڑے اور مبین کچھ جھینپ سے گئے مبین نے سلطان کے متعلق بہت سے سوال کئے اور مس خان نے سب کا جواب دیا۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اس وقت سلطان کا سن بائیس تئیس برس کا تھا۔ اسی سال لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔اے پاس کیا تھا۔ باپ اُن کے دلی میں اڈیشنل مجسٹریٹ تھے۔ مس خان اُن کا نام بھول گئی تھیں۔ مگر پتا یاد تھا۔ دریا گنج میں پاٹودی ہاؤس کے برابر والی کوٹھی میں قیام تھا۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ جمیلہ اندر سے آئی اور مجھ سے کہا "امی کہتی ہیں اپنے دوست کو چار کے لئے روک لیجئے" مگر مبین کو کوئی ضروری کام تھا۔ اس لئے وہ معذرت کرکے رخصت ہو گئے۔ نور جہاں، مس خان اور میں، تینوں اٹھ کر اندر چلے آئے "جلسہ" کی کارروائی "مختصر طور پر رشیدہ کے سامنے دہرائی گئی۔ میں نے دیکھا کہ رشیدہ پایا

میرے چہرے کو غور سے دیکھتی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد چائے آئی اور ہم سب نے پی۔ اس کے بعد بھی کتنی دیر تک خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ رشیدہ کو اس میں کمال حاصل تھا کہ کیسا ہی کوئی اجنبی ہو۔ پہلی ہی ملاقات میں اُن کے ساتھ کھُل جانے اور بے تکلف ہو جانے پر مجبور ہوتا تھا اور فقرے چست کرنے کی تو بادشاہ تھیں۔ چنانچہ اُن کا اس روز کا ایک فقرہ عمر بھر یاد رہے گا۔ مس خان اپنی تنگ معاشی کی کچھ شکایت کرنے لگیں۔ رشیدہ بولیں۔ "آپ ایک کام کیوں نہیں کرتیں!" مس خان نے پوچھا۔ "وہ کیا؟" کہا "آپ کے گھر میں پانی کا نل ہے؟" کہا "ہے" کہا "کپڑے اُتار کر نل کے نیچے ایک صاف ستھرے ٹب میں بیٹھ جائیے۔ نل کھول دیجئے اور پانی کی دھار اپنے سر اور جسم پر گرنے دیجئے۔ ٹب جب بھر جائے تو یہ سب پانی بوتلوں میں بھر کر "بلیو بلیک" روشنائی کے نام سے بیچ ڈالئے "سوان انک" اور "پارکر انک" سب اس کے سامنے پھیکی پڑ جائیں گی۔"

مس خان جہاں خوش گفتار تھیں وہاں خوش مزاج بھی تھیں۔ بولیں "تجویز تو اچھی ہے مگر ایک معزز اور معتبر ایجنٹ کی ضرورت ہے۔ آپ کے نزدیک ڈاکٹر حمید صاحب اس کام کے لئے کیسے رہیں گے!" اس فقرے پر سب ہنس پڑے۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ صحبت برخاست ہوئی۔ رشیدہ کے چہرے پر یکایک سنجیدگی اور آواز میں متانت پیدا ہو گئی، بولیں "عشرت! آج تم چپ چپ کیوں ہو؟"

میں نے کہا "نہیں تو"

"نہیں تو کیا معنی۔ میں گھنٹہ بھر سے دیکھ رہی ہوں۔ تم بالکل کھوئے ہوئے سے ہو خدا جانے کس اُدھیڑ بن میں لگے ہو۔"

میری حالت میں ذرا سا تغیر ہونے سے رشیدہ کو سیکڑوں شکوک، ہزاروں شبہات پیدا ہو جاتے تھے اور جب تک وہ اس تبدیلی کی حقیقت نہ جان لیتیں۔ اُنہیں چین نہ آتا۔ اُن کا اصرار جب حد سے بڑھا تو ناچار مجھے کہنا پڑا۔ میں نے وہ کیلنڈر اُن کے

سامنے رکھ کر کہا "اسے دیکھئے۔ مس خان کہتی ہیں کہ سلطان کے چہرے کا بالکل یہی انداز ہے اور جب میں اس تصویر کو دیکھتا ہوں تو بے اختیار "حورا" کی شکل میری آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ "حورا" اور سلطان کی صورتیں آپس میں بہت ملتی جلتی ہیں اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے!"

"اس کا مطلب؟" رشیدہ نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"مطلب کچھ بھی نہیں" میں نے جواب دیا۔

"حورا تو جس کے مقدر کی تھی اسے مل گئی اور تمہاری دسترس سے اسی طرح باہر ہے جس طرح میری دسترس سے تم۔ مگر کیا اب سلطان پر "طبع آزمائی" کا ارادہ ہے؟" رشیدہ نے اپنے مخصوص طنز آمیز تلخ لہجہ میں کہا۔

"حورا میری دسترس سے باہر ہے۔ مگر اس کا خیال تو میری دسترس سے باہر نہیں!"

"چلو بس باتیں نہ بناؤ۔ مجھ سے نہ اڑو۔ میں تمہیں خوب پہچانتی ہوں۔ تم کیا کرو۔ یہ کھیل کھیلنا تمہاری فطرت میں داخل ہے۔ مگر میں کہتی ہوں آخر مجھ سے کیا پردہ۔ مجھ پر اس سے کیا اثر پڑتا ہے۔ میں جہاں ہوں، وہاں ہوں، جو خیال ہے وہ ہے، نہ چھوٹ سکتا ہے نہ بدل سکتا ہے۔ عشق! میں تیرے لئے وہ کر سکتی ہوں جو دنیا میں کوئی عورت کسی امر کے لئے نہیں کر سکتی۔ ایک دفعہ آزما کر تو دیکھ۔ تم کہو تو میں خود دہلی جاؤں۔ سلطان سے ملوں، تمہاری شادی کی تحریک کروں، اُسے اور اس کے والدین کو راضی کر کے جس طرح بنے اُسے تمہارے پہلو میں لا بٹھاؤں۔ مگر مجھ پر اعتماد تو کرو، دل کا حال تو مجھ سے کہو!"

رشیدہ جس وقت یہ باتیں کہہ رہی تھیں میں ایک عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ کبھی خیال آتا تھا کہ واقعی رشیدہ سے یہ سب کچھ ممکن ہے۔ پھر کہتا دل! اے! انسانی فطرت اپنے محبوب کو حریف کے آغوش کی زینت بنانا گوارا کر سکتی ہے؟ رشیدہ کی اس

تمام گفتگو کا مقصد درحقیقت میرے جذبات کی گہرائی اور میرے تاثر کی کیفیت کا اندازہ کرنا تھا۔ اسی لئے یہ تلخی اور نرمی کی آمیزش کی تھی۔ میں ابھی کوئی جواب دینے نہ پایا تھا کہ ڈاکٹر حمید آگئے اور وہ گفتگو وہیں ختم ہوگئی۔ رشیدہ کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ کسی کو مجھ سے یا مجھے کسی سے دلچسپی پیدا نہ ہونے پائے اور اس کے لئے انہوں نے کوئی ممکن کوشش اٹھا نہ رکھی۔ ایک مرتبہ دورانِ گفتگو میں میں نے کہا کہ میں اپنی تصویر کھنچوانے والا ہوں۔ رشیدہ کو فوراً شک گذرا۔ کہا "تم تو ہمیشہ تصویر کھنچوانے سے گریز کرتے تھے۔ اب یہ کیا نیا شوق چرّایا۔" میں نے کہا شوق کے لئے نہیں بعض بیرونی دوستوں کا اصرار ہے کہ اپنی تصویر بھیجدو۔ اُن کے لئے کھنچوانا چاہتا ہوں، رشیدہ کا شک اور قوی ہوگیا کہ ضرور کچھ دال میں کالا ہے اور اس کا علاج بھی خود ہی اُن کی سمجھ میں آگیا۔ کہا ہم کھنچوا دیں گے اور یہیں گھر پر کھنچوا دیں گے۔ ایک بہت اچھا فوٹو گرافر ڈاکٹر صاحب کا دوست ہے۔ آج ہی اُسے کہلا بھیجیں گے۔ کل آجائے گا۔ میں راضی ہوگیا۔ اگلے دن تین تصویریں کھنچیں۔ دو سوٹ میں، ایک شیروانی میں۔ دو نصف ایک پوری۔ تینوں کے پروف آئے۔ تینوں میں جو سب سے بری تھی، رشیدہ نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہی سب سے بہتر تھی اور میری احمقی دیکھو کہ مجھے اس پر یقین بھی آگیا۔ کیونکہ ہمیشہ سے میرا عقیدہ یہ رہا ہے کہ اپنی تصویر کا بہترین جج انسان خود نہیں ہوسکتا۔ اس بارے میں دوسروں کی رائے کو مستند سمجھنا چاہئے۔ بہت زمانے کے بعد مجھے اس واقعہ کی حقیقت معلوم ہوئی۔ فوٹو گرافر نے کہا "مسز حمید کی ہدایت تھی کہ اگر تمہاری رائے پوچھی جائے تو اُسی تصویر کو بہتر بتانا جو سب سے بدتر تھی!!"

مس خان سے پہلی ملاقات کے بعد میں تقریباً ایک مہینہ اور آگرہ ٹھہرا۔ روز

بروز مجھے سلطان کا خیال زیادہ ہوتا جاتا تھا اور جی چاہتا تھا کہ کوئی مجھ سے سلطان کا ذکر کرے یا سنے۔ مگر کسی کو رازدار بنانا اس وقت مصلحت کے خلاف سمجھتا تھا پھر بھی کسی نہ کسی حیلے سے کئی مرتبہ اس کو طور کی بیٹی یعنی مس خان سے ملا اور اس کے شکوک کو بیدار کئے بغیر سلطان کے متعلق جس قدر گفتگو ممکن تھی کی۔

مبین اس رشتہ کے لیے آمادہ ضرور تھے۔ مگر انہیں کچھ جلدی نہ تھی۔ اس لیے اب تک انہوں نے کوئی تحریک نہیں کی تھی۔ ان کی تعطیل بھی اب ختم ہونے والی تھی اس لئے اُن کی بڑی بہن کی طرف سے کہ وہی بزرگ خاندان تھیں، سلطان کے والد کے نام "پیغام" کا خط لکھا گیا۔ مبین نے وہ خط مجھے دکھایا۔ اب میری خاموشی سے بہت سی پیچیدگیوں کے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے میں نے صاف صاف مبین کو سب حال بتا دیا۔ مبین نے کہا آپ خود ہی اس تحریک کے بانی تھے۔ اب اگر آپ کا ایسا خیال ہے تو میں نہایت خوشی کے ساتھ اس ارادے سے دست بردار ہوتا ہوں۔ طاہرہ بی کے بعد میرے دل میں رومان پیدا ہونے کی گنجائش نہیں رہی مجھے تو اب ضرورت کا پورا کرنا ہے اور اس کے لیے یہاں وہاں کی کوئی قید نہیں جہاں بھی ہو میرے لئے برابر ہے۔

تین مہینے گذر گئے۔ اس مدت میں کبھی دو چار دن کے لیے بھی سلطان کا خیال میرے دماغ سے نہیں نکلا۔ اکتوبر میں پھر ہمارے یہاں ایک مہینے کی تعطیل ہوئی اور میں خلاف معمول ایک ہزار میل کا طویل سفر طے کر کے آگرہ پہونچا۔ رشیدہ کو میرے آنے کی بے انتہا خوشی ہوئی۔ مگر میں ہر وقت رشیدہ کی طرف سے ڈرتا ہی رہتا تھا۔ دراصل میں اس مرتبہ مس خان کو اپنا رازدار اور معین کار بنانے کی غرض سے آگرہ آیا تھا۔ قدرت کی اعجوبہ کاریاں ہمارے فہم و دانش کے احاطہ میں نہیں آسکتیں۔ پہلی مرتبہ جب میں نے مس خان کو دیکھا تو مجھے خیال ہوا کہ یہ عورت یقیناً زندگی بھر کنواری رہنے کے لئے

پیدا ہوئی ہے۔ اس کلچڑی کو کون قبول کرے گا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ دنیا کے بازار میں ہر جنس کا خریدار موجود ہے۔ مس خان کو بھی ایک قدردان مل گیا اور وہ ہمیشہ کے لئے آگرہ سے ترک سکونت کر کے اپنے شوہر کے ساتھ ناگ پور چلی گئی۔ فطرت کی یہ چہل مجھے سخت ہی ناگوار گذری۔ مگر اختیار کی کیا بات تھی۔ سترہ اٹھارہ دن گذر گئے اور میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ آخر ایک تدبیر سوجھی کہ جس قیمت پر بھی ملیں نورجہاں کی "خدمات" حاصل کرنا چاہئیں۔ مگر رشیدہ کی طرف سے مجھے ہر وقت کھٹکا ہی لگا رہتا تھا کہ اگر کہیں وہ ہوا بھی پا گئیں تو پھر زندگی بھر سلطان کا سایہ بھی میں نہ دیکھ سکوں گا۔

چند ملاقاتوں کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ نورجہاں میں رازداری کی کافی اہلیت موجود ہے اور سونے چاندی کی مہریں لگا کر اس کا منہ بند رکھا جا سکتا ہے۔ آگرہ سے چلتے وقت میں نے کئی چیزیں نورجہاں کو تحفے میں دیں اور اس نے بھی مجھے ہر طرح کا اطمینان دلایا کہ میری خواہش کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ آگرہ سے واپس آنے کے پندرہ دن بعد میں نے نورجہاں کو لکھا کہ تم خود دہلی جاؤ کسی حیلہ سے سلطان سے ملو، اور تمام "ضروری باتیں" اپنی آنکھ سے دیکھ کر اور بذاتِ خود دریافت کر کے لکھو۔ خط کے ساتھ ہی چالیس روپے سفر خرچ اور دیگر مصارف کے لئے بذریعہ منی آرڈر بھیج دیئے۔ نورجہاں دہلی گئی۔ ایک ہفتہ وہاں قیام کیا اور وہاں سے آکر جو رپورٹ مجھے بھیجی، اُس کا خلاصہ یہ ہے:۔

"معلوم ہوتا ہے کہ مس خان نے دھوکا کھایا۔ کسی اور کو دیکھا اور سلطان سمجھا۔ سلطان کی عمر ستائیس اٹھائیس سال سے کم نہیں۔ شکل و صورت بہت معمولی ہے۔ سُنا ہے رنگ گورا ہے مگر پھیکا پھیکا۔ گنٹھ مالا کی مریض ہیں۔ صحت بہت خراب ہے۔ اسی لئے زیادہ تر بیمار پڑی رہتی ہیں۔ چنانچہ آج کل بھی منصوری گئی ہوئی ہیں۔ شادی کی نہ وہ خود خواہشمند ہیں نہ شاید کوئی دوسرا اس پر تیار ہوگا کہ سال دو سال کے بعد رنڈوا ہو جائے

بعض باتیں خود سلطان کی والدہ سے معلوم ہوئیں اور بعض سلطان کی ایک سہیلی سے جو اتفاق سے میری لڑکپن کی دوست نکل آئیں اور ہاں یہ بھی غلط ہے کہ وہ گریجویٹ ہیں۔!!

سلطان ایک خیال بن کر میرے دماغ میں داخل ہوئی۔ رفتہ رفتہ ایک آرزو بن کر دل میں رہنے لگی اور اس آرزو نے آغوشِ قلب میں اس طرح پرورش پائی کہ جوان ہو کر امید بن گئی مگر نور جہاں کی تحریر ایک بجلی تھی جس نے اُمید، آرزو، خیال، سب کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا میرا مستقبل جسے میرے تخیل نے سلطان کے عکس جمال سے فردوس نگاریں بنا یا تھا، ماضی سے زیادہ تاریک ہو گیا، کوثر و تسنیم کی موجیں، جلوۂ سراب اور بہار کی مست رنگینیاں شرابی کا خواب ثابت ہوئیں۔ دل کسی طرح اس پر آمادہ نہ ہوتا تھا کہ سلطان کے متعلق حسن خان سے جو کچھ سُنا تھا اُسے محض ایک رنگین افسانہ تصوّر کر کے سلطان کی جستجو سے دست بردار ہو جاؤں۔ بار بار خیال آتا تھا کہ کہیں مجھے فریب تو نہیں دیا گیا۔ مگر پھر کہتا، فریب کون دے گا، کیوں دے گا۔ نور جہاں کا تو بہر حال اس کام میں فائدہ ہی فائدہ تھا۔ اب یہ سلسلہ نہ رہا تو مفاد بھی گیا۔ کبھی اپنے دل کو اس طرح سمجھاتا کہ اس میں نئی بات کون سی ہے۔ زندگی میں کون سی تمنّا آج تک پوری ہوئی ہے جو یہ ہوتی۔ ہر تبسم کا انجام آنسوؤں پر ہوتا آیا ہے وہی اب بھی ہوا۔ اُسی زمانہ میں میں نے یہ شعر کہا تھا ؎

نہ سُنو قصّۂ ناکامِ محبّت نہ سُنو
ہے یہ وہ خواب کہ جس کی کوئی تعبیر نہیں

وقت گذرتا گیا اور سلطان کا تصوّر دھندلا ہوتا گیا۔ البتہ جب کبھی اس جرمن کیلنڈر پر نظر پڑ جاتی تو وہ ایک دن کے لئے وہی پرانی فضا پیدا ہو جاتی۔ اور میں سلطان کو ایک حقیقی مخلوق سمجھنے لگتا۔ اس طرح تقریباً تین برس گذر گئے اور اکتوبر

۱۹۳۱ء میں میں لندن پہونچ گیا۔ جیسا کہ میں مسٹر براؤن کی سرگذشت میں بیان کر چکا ہوں۔ لندن میں مسٹر فریدی کے سوا کسی ہندوستانی سے میرا ربط ضبط نہیں بڑھا فریدی بہت رنگیلے آدمی تھے۔ تقریباً ہر ہفتے کسی نہ کسی بہانے سے اُن کے یہاں اچھی صورتوں کا مجمع ہوتا۔ وہ اس بات کے بے انتہا آرزومند تھے کہ میں لطف صحبت کی خاطر صنفِ نازک میں سے کم ازکم ایک "دوست" پیدا کر لوں۔ مگر انہیں انتہا درجے مایوسی ہوئی۔ جب اُنہوں نے دیکھا کہ جس میدان کے وہ شہسوار تھے میری حیثیت اس میں ایک پیادہ سے بھی کم تھی۔ ایک دن اُنہوں نے کہا کہ "میں سمجھتا تھا کہ ایک شاعر کے لئے زندگی کے ہر دَور میں ایک "رومانس" لازمی ہے۔ مگر آپ کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ شاید میں غلطی پر تھا۔ آپ کی باتیں کوئی سُنے تو سمجھے کہ آپ ماشاءاللہ رندوں کے سرگروہ ہیں۔ مگر میری طرح جسے آپ کی اندرونی زندگی کا علم ہے اُس کے نزدیک تو آپ ایک زاہدِ خشک سے بھی کچھ زیادہ ہیں۔ پھر قیامت یہ کہ آپ شاعر ہیں اور میں آپ کو حقیقی شاعر مانتا ہوں"۔

میں نے کہا "برادر میرا ذوق مشرقی ہے اور خصوصاً ہندوستانی۔ یہ آپ کی سفید مومی پتلیاں، ان کا مصنوعی حُسن اور ان کی بے حجابی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی"۔

فریدی نے کہا "اچھا ایک ہفتہ اور ٹھہر جائیے آپ کا "علاج" ہو جائے گا"۔

میں نے پوچھا نہ اُنہوں نے بتایا کہ "علاج" سے اُن کی کیا مراد ہے اور اس کے لئے ہفتہ بھر کی قید کیوں لگائی۔ اگلے ہفتے اُنہوں نے مجھے چار پر بلایا اور بہت تاکید سے بلایا۔ کیونکہ میں اکثر اُن کی عام پارٹیوں میں شریک ہونے سے گریز کرتا تھا اور مجھے بے انتہا حیرت ہوئی جب میں نے دیکھا کہ خلافِ معمول اُن کے چند ہندوستانی دوستوں کے سوا اور وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ شام ہو رہی تھی۔ چار کا وقت گذرا جا رہا تھا۔ میں نے کہا "فریدی چائے کیوں نہیں منگواتے کیا کسی کا انتظار

ہے؟" کہا "ہاں" میں نے کہا "وہ کون ایسا محترم مہمان ہے جس کی خاطر آپ ہم سب کو سکھا رہے ہیں۔" یہ کہتے وقت میں نے اُن کے چہرہ پر ایک پرمعنی نظر ڈالی اور مُسکرایا وہ میرا منشا سمجھ گئے اور بولے "غلط، بالکل غلط" آخر ہر مرتبہ آپ کا اندازہ صحیح نہیں ہو سکتا جس کا انتظار ہے وہ ہندوستانی ہے انگریز نہیں۔ کوئی خاص سبب ہوا جو دیر ہوئی ورنہ پابندی وقت کا اُنہیں خود......"

فریدی کا جملہ ابھی تمام نہ ہوا تھا کہ ایک ٹیکسی دروازے پر آکر رُکی۔ فریدی نے کہا "لو وہ آ گئے"۔ یہ کہا اور آنے والے کی پذیرائی کے لئے کمرے سے باہر چلے گئے چار پانچ منٹ کے بعد ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا۔ آگے آگے ایک نوجوان ہندوستانی خاتون اور پیچھے پیچھے فریدی کمرے میں داخل ہوئے۔ رسم کے مطابق تعارف ہوا۔ اُن کا نام مس بیگ اور وطن الہ آباد بتایا گیا۔ لکھنؤ یونیورسٹی کی گریجویٹ تھیں اور اب سرکاری وظیفہ سے ٹیچرس ٹریننگ کے لئے سال بھر سے آکسفورڈ آئی ہوئی تھیں۔ وہ میرے مقابل کی کرسی پر آتش دان کے برابر بیٹھ گئیں۔ اکثر حضرات اُنہیں پہلے سے جانتے تھے بلکہ اس محفل میں شاید میں ہی ایک ایسا تھا جس نے پہلی پہل اُنہیں دیکھا تھا۔ فوراً چائے آئی اور سب نے پینا شروع کی۔

مس بیگ کی طرح خوش گفتار لڑکیاں مسلمانوں میں زیادہ نہیں ہوتیں۔

شوخ گفتاریاں عموماً جراُت آموز ثابت ہوتی ہیں اور اکثر اُن کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے۔ مگر مس بیگ، کے مُنہ سے جو بات نکلتی تھی وہ اپنی تمام رعنائیوں کے باوجود معصومیت کی مُنہ بولتی تصویر ہوتی تھی۔ اُن کے اور دوسروں کے درمیان جائز اور مناسب احترام کا ایک پردہ پڑا رہتا تھا جس کے اُس طرف بے تکلفی، خصوصیت، یگانگی، اخلاص، نیاز، ارادت، کوئی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ کچھ کہہ رہی تھیں، سب ہمہ تن گوش تھے میں بھی خاموش تھا۔ مگر میری اور دوسروں کی خاموشی میں فرق تھا۔ وہ کچھ سُن رہے تھے

میں کچھ سوچ رہا تھا۔ رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ مس بیگ کو میں نے کہیں دیکھا ہے۔ آنکھوں کو صورت آشنا معلوم ہوتی تھی مگر کہاں دیکھا ہے۔ کب دیکھا ہے، کچھ یاد نہیں آتا تھا پھر اپنے جی میں کہتا کہ یہ تو الہ آباد کی رہنے والی ہیں۔ میں الہ آباد کبھی گیا ہی نہیں۔ پھر دیکھا تو کہاں دیکھا۔ میں ابھی اسی اُلجھن میں مبتلا تھا کہ مس بیگ نے کوئی لطیفہ بیان کیا اور یکایک سب ہنس پڑے۔ میں بھی چونک پڑا۔ مگر اپنی محویت میں مجھے کچھ خبر نہ ہوئی کہ کیا بات تھی جس نے ایسا گدگدایا کہ سب بے اختیار سب کو ہنسی آگئی۔ میں اب بھی خاموش تھا۔ مگر اب کان اپنا کام کر رہے تھے۔ میری خاموشی نے سب کو میری طرف متوجہ کر دیا۔ فریدی نے کہا "آپ کیا سوچ رہے ہیں"! میں نے کہا "میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میں نے آپ کو (مس بیگ کی طرف اشارہ کر کے) کہاں دیکھا ہے؟"

مس بیگ فوراً بولیں "نہیں جناب آپ نے مجھے کہیں نہیں دیکھا۔ اس لئے کہ میں نے آپ کو آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا"

میں نے کہا "معاف فرمایئے آپ کی دلیل بہت بودی ہے۔ ممکن ہے آپ اسے خودستائی سمجھیں مگر واقعہ یہ ہے کہ میری نظر اکثر ایسی جگہہ پہونچ جاتی ہے جہاں عام نگاہوں کی رسائی نہیں ہوتی مگر شرط یہ ہے کہ چیز دیکھنے کے قابل ہو۔ ورنہ پیش پا اُفتادہ چیزیں بھی مجھے دکھائی نہیں دیتیں"! شاید میرے آخری فقروں نے مس بیگ کے دل میں چٹکی لی۔ اُن کے چہرے سے کیفیتِ تاثر کا اندازہ مشکل نہ تھا۔

جس وقت میں یہ باتیں کہہ رہا تھا میرا دماغ برابر اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ جو بھول گیا ہوں وہ یاد آجائے۔ آخر یکایک ایسا محسوس ہوا جیسے آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا اور میں آن واحد میں لندن سے آگرہ پہونچ گیا۔ رشید، نورجہاں، مس خان، متین، ڈاکٹر حمید کا نشست کا کمرہ، جرمن گیلنڈر، اور سلطان، سب میرے سامنے تھے۔ سلطان کی جو تصویر مس خان نے لفظوں میں کھینچی تھی اُس میں اور مس بیگ

میں بلا کی مشابہت تھی۔ چہرے کا انداز کیلنڈر والی تصویر سے بہت ملتا جلتا تھا۔ ابھی سب خاموش تھے کہ میں بولا:۔

"مس بیگ! آپ ہی کا خیال درست ہے۔ اب مجھے یاد آگیا۔ دراصل مجھے آپ پر کسی کا دھوکا ہوا"

"مگر کیا اُن کی صورت مجھ سے بہت ملتی جلتی ہے جو آپ کو مجھ پر اُن کا شبہ ہوا؟"

"بے حد" میں نے کہا۔

"اچھا! کچھ اور تفصیل؟"

میں نے کہا "صورت شکل، ناک، نقشہ، قد قامت، رنگ روپ، بالکل آپ کا سا۔ سن بھی قریب قریب اتنا ہی ہو گا۔ سلطان جہاں نام، دہلی کی رہنے والی اور لکھنؤ یونیورسٹی کی گریجویٹ ہیں"

یکایک مس بیگ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ حیرت و انتشار کی ملی جلی کیفیت اُن کی آنکھوں سے نمایاں تھی۔ مگر میرے سوا کسی کو اُن کی اس حالت کا کوئی اندازہ نہیں ہوا۔ وہ بالکل خاموش تھیں۔ کوئی دو تین منٹ کے بعد اُنہوں نے مجھ سے پوچھا:۔

"آپ سے اُن سے کہاں کی ملاقات ہے؟"

"کہیں کی نہیں"

"تو پھر آپ نے اُنہیں دیکھا کہاں؟"

"کہیں نہیں۔ اُن کے حالات کسی سے سنے تھے بس اتنی ہی واقفیت ہے۔ میرا خیال تھا کہ لکھنؤ میں وہ آپ کی کلاس فیلو یا کالج فیلو رہی ہوں گی"

"جی نہیں۔ اس نام کی کوئی خاتون میری کلاس فیلو یا کالج فیلو نہیں تھیں"

جس وقت مس بیگ یہ باتیں کہہ رہی تھیں اُن کے چہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سلطان جہاں کے متعلق ضرور کچھ جانتی ہیں اور چھپا رہی ہیں۔ مگر اُن کے

صریح انکار کے بعد اب کسی سوال کی گنجایش نہ تھی۔ پھر وہ خاموش ہوگئیں۔ معاً میرے دل میں یہ خیال آیا کہ نورجہاں نے جو کچھ لکھا تھا وہ بالکل درست تھا یعنی مس خان کو دھوکا ہوا یقیناً انہوں نے مس بیگ کو دیکھا اور سلطان سمجھا۔ میری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ زلیخا کے خواب کی طرح آج میرا خیال حقیقت بن گیا تھا!

لوگ آہستہ آہستہ آپس میں باتیں کر رہے تھے صحبت کچھ بے کیف سی ہو رہی تھی فریدی صاحب کو تو محفل گرمانے کے ہزاروں ڈھنگ یاد ہیں۔ وہ فوراً مجھ سے بولے "اچھا اب آپ کچھ سنا دیجیے" اس کے بعد مس بیگ سے مخاطب ہو کر کہا "آج کی صحبت آپ کو مدتوں یاد رہے گی۔ ہمارے.......... صاحب کا کلام سننے عمر بھر کے لئے دل پر نقش ہو جائے گا اور برسوں یہ آواز کانوں میں گونجے گی۔ انتہا ہے کہ مجھ جیسا شاعری سے بیگانہ ان کے اشعار سن کر بیخود ہو جاتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ سنے جاؤں" سب نے فریدی صاحب کے قول کی تائید کی اور اصرار کرنے لگے کہ ضرور کچھ سنائیے۔ مس بیگ اب خاموش تھیں اور ایک عجیب شان استغنا کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اپنی نظم "شالامار" شروع کی۔ میں نے دیکھا کہ رفتہ رفتہ مس بیگ کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ جب نظم تمام ہوگئی اور سب نے تالیاں بجائیں تو وہ چونک کر بولیں "کیا ختم ہوگئی" سب نے یک زبان ہو کر کہا "ایک اور، ایک اور...... صاحب ایک اور" میں مس بیگ کی آنکھوں کا مطالعہ کر رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ خود فرمایش کریں۔ مگر وہ بالکل خاموش تھیں۔ دوستوں کا اصرار حد سے بڑھا۔ میں نے حیلے تراشنے شروع کئے۔ یہاں تک کہ مس بیگ نے پہلو بدلا اور مجھے مخاطب کر کے آہستہ سے کہا:-

"......... صاحب اگر تکلیف نہ ہو تو ایک نظم اور سنا دیجیے"!

ابھی میں کچھ جواب نہ دینے پایا تھا کہ فریدی برابر سے بولے "YOU CANT REFUSE A LADY (آپ ایک خاتون کی خواہش کو رد نہیں کر سکتے) گویا یہ ایک

ایسی حجت تھی جس کے آگے سر تسلیم خم کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ میں نے کہا بہت اچھا اور اپنی نظم "جمنا" شروع کی۔ اس وقت میری آواز میں کچھ ایسا درد اور سوز پیدا ہو گیا تھا جو اس کے بعد کبھی نصیب نہیں ہوا مس بیگ انتہائی محویت کے ساتھ سن رہی تھیں۔ جب نظم تمام ہوئی اور میں نے یہ آخری شعر:۔

روح کو بیدار کرنے کے لئے سو جاؤں میں   یعنی تیری دل نواز آنکھوں میں گم ہو جاؤں میں

پڑھ کر ایک والہانہ انداز سے مس بیگ کی طرف دیکھا تو وہ کچھ شرما سی گئیں۔ مگر بہت جلد خود کو سنبھالا۔ نظم کی تعریف کی۔ پڑھنے کی تعریف کی اور حد سے زیادہ مسرت و تشکر کا اظہار کیا۔ اس کے بعد کچھ دیر تک خوش گپیاں ہوتی رہیں۔

اس مجمع میں ایک صاحب پنجاب کے رہنے والے مسٹر سعادت بھی تھے جو مس بیگ کے دیرینہ "نیاز مند" تھے۔ اس کا حال مجھے اُن کی وفات کے بعد معلوم ہوا۔ جو مس بیگ کی واپسی کے تھوڑے ہی دنوں بعد لندن میں واقع ہوئی۔ اُنہوں نے کہا کیوں ...... صاحب! آپ کی کیا رائے ہے، مجھے تو مسلمان لڑکیوں کے نام کے پہلے یہ لفظ "مس" کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا" مس بیگ نے فوراً چمک کر کہا "میں پوچھتی ہوں آخر اس لفظ میں برائی کیا ہے" فریدی بھلا ایسے موقع پر کب چپ رہنے والے تھے۔ بولے "مجھے تو اس لفظ سے للّٰہی بغض ہے۔ اس سے تو فرانسیسی لفظ "مادموازل" اچھا" سعادت مرحوم نے کہا "مولوی ممتاز علی صاحب "تہذیب نسواں" والوں نے "آنسہ" تجویز کیا ہے" میں نے کہا معاف کیجئے۔ مجھے تو آنسہ ایسا ہی عُریاں معلوم ہوتا ہے جیسا "باکرہ" مس بیگ نے پوچھا فارسی میں کیا کہتے ہیں؟" میں نے کہا "دختر خانم" وہ بولیں "مگر یہ تو "گاؤمیش" کی سی ترکیب ہے" میں نے کہا "ہاں ہے تو مجھے تو اس مفہوم کے ادا کرنے کے لئے جتنے لفظ معلوم ہیں اُن میں "سی نوری تا"[1] سب سے زیادہ پیارا، سب سے زیادہ خوش آہنگ اور سب سے

---

[1] اسپین کی زبان میں "سی نوری تا" کے وہی معنی ہیں جو انگریزی "مس" کے ہیں۔

زیادہ روما نٹک معلوم ہوتا ہے۔

خدا جانے اس لفظ میں کیا جادو تھا کہ اس نے سبھوں کے دل موہ لیے اور بالاتفاق آرا اُس وقت سے مس بیگ کا نام "سی نوری تا" مقرر ہو گیا مس بیگ نے اوّل مخالفت کی، مگر جب سب نے زور دیا تو ناچار اُنہوں نے بھی مان لیا۔ رات کے ۹½ بجے ہم لوگوں نے کھانا کھایا اور گیارہ بجے یہ خوشگوار صحبت تمام ہوئی، چلتے وقت مس بیگ نے ہر ایک سے ہاتھ ملایا اور کہا "انشاء اللہ پھر ملاقات ہو گی" مگر جب میری باری آئی تو اُن کی مسکراہٹ سنجیدگی میں تبدیل ہو گئی۔ ہاتھ ملایا۔ لطفِ صحبت پر اظہارِ مسرت اور میری "عنایت" کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ خدا حافظ کہا۔ مگر جن الفاظ کے سننے کے لیے میرے کان آرزو مند تھے افسوس کہ وہ اُن کی زبان سے نہ نکلے۔ اُنہوں نے مجھ سے یہ نہیں کہا کہ "اچھا انشاء اللہ پھر ملاقات ہو گی" اس کا مجھے بے انتہا قلق ہوا۔ آدھی رات کے قریب میں اپنے قیام گاہ پر پہنچا۔ میری وہ حالت تھی جو ایک ہارے ہوئے جواری کی یا پچھڑے ہوئے پہلوان کی یا امتحان میں فیل ہو جانے والے طالب علم کی ہوتی ہے۔ طبیعت بہت بے چین تھی۔ نیند نہ آتی تھی۔ یکایک خیال آیا کہ "سی نوری تا" کی تصویر کیوں نہ کھینچ ڈالوں۔ چنانچہ صبح تک سترہ شعر کہے۔ نظم ناتمام تھی اور ناتمام ہی رہی۔ اسی طرح پیش کرتا ہوں:۔

(منقول از بیاض خود) ۶ر دسمبر ۱۹۳۱ء۔ اتوار۔ لندن۔

بالکل اتفاقی طور پر ایک دوست کے یہاں "اُن" سے تعارف ہوا۔ کسے خبر تھی کہ تین برس پہلے ہندوستان میں جو خواب دیکھا تھا اُس کی اندوہ ناک تعبیر لندن میں ملے گی

یہ اشعار اُسی نشست کی یادگار ہیں جو اُسی شب میں کہے گئے۔

سی نوری تا

شبِ اُن کی بزم سے یہ سینکڑوں جلوے چرا لایا
خدا جانے اب اس کمبخت دل کا حشر کیا ہو گا

تمنا نے کہا دیکھیں تو کیا کیا چیز ہاتھ آئی
جب آدھی رات گذری اور ملی خاموش تنہائی

یہ سننا تھا کہ دل نے حافظے کا کھول کر تالا
نظر کے سامنے تھی شوخ، دھانی، ریشمیں ساری
اُسے پہنے ہوئے تازہ جوانی حسنِ فتّاں کی
تبسّم کی ضیا نازک لبوں پر جلوۂ رنگیں
نگہ سجدے کرے جس پر وہ پُر تنویر پیشانی
تہِ زلفِ سیہ رہ رہ کے جنبش گوشواروں کی
یہ کیفیت سنہری چوڑیوں کی خوش نمائی میں
وہ آنکھوں میں گلابی رنگ کی ہلکی جھلک پیدا
بعینہ جیسے شیشہ میں مے گلرنگ رکھی ہو
نظر بھر کر یہ جس کو دیکھ لیں مخمور ہو جائے
کبھی محفل پہ حسنِ گفتگو کے پھول برسانا
کبھی اشعار سننے کو ہمہ تن گوش ہو جانا
نوائے نغمہ سے مسرور ہو کر مسکرا دینا
کبھی وہ کہنیوں تک آستینوں کا چڑھا لینا
کبھی خود اپنے احساسات کی تصویر بن جانا

تخیّل کی مدد سے "مالِ مسروقہ" کو پرتالا
روپہلی بیل کی وہ حشر ساماں سادہ پُرکاری
قیامت جس کے ہر انداز میں قدرت نے پنہاں کی
تکلّم کی صدا، موجِ ترنّم، نغمۂ شیریں
جمالِ روئے زیبا ضامنِ تسکینِ روحانی
اندھیری رات میں چشمک زنی جیسے ستاروں کی
کہ سورج کی کرن لپٹی ہوئی گوری کلائی میں
قیامت پر قیامت ململِ شفّاف کا پردہ
مزہ کیسا ہے؟ یہ تو وہ بتائے جس نے چکھی ہو
نہ سنبھلے حشر تک ایسا نشے میں چور ہو جائے
کبھی کچھ کہتے کہتے بھول جانا اور شرمانا
کبھی وہ ہنستے ہنستے یک بیک خاموش ہو جانا
نگاہوں کا اُٹھانا پھر نہ جانے کیوں جھکا دینا
کبھی ساڑی کا دامن کھینچ کر نیچے بڑھا لینا
مرے بھولے ہوئے اک خواب کی تعبیر بن جانا

اس نظم کا سنی نوری تا تک پہونچنا اور مقبول ہونا۔ کئی مہینے کے بعد سنی نوری تا سے فریدی کے یہاں دوسری ملاقات۔ میری طرف سے اظہارِ تمنا اور رات کی سعیِ ناکام۔ سنی نوری تا کی ہندوستان کو واپسی۔ بندرگاہ لندن پر خدا حافظی اور جہاز کی روانگی۔ کئی دن کے بعد جذبات کی شورش اور سنی نوری تا کو دوبارہ دیکھنے کی آخری ناکام کوشش یعنی سنی نوری تا کے جہاز کو پکڑ لینے کی اُمید میں ریل کے ذریعے مارسیلز تک کا سفر اور بندرگاہ پر پہونچنا۔

سے دس منٹ قبل سنی نوری تا کے جہاز کا چھوٹ جانا۔ واپسی کے حادثات اور رومانس کا حسرت ناک انجام، ایسے واقعات ہیں جو ایک جداگانہ صحبت کے محتاج ہیں اور انشاء اللہ کبھی آیندہ مفصل طور پر قارئین ساقی کی خدمت میں پیش کئے جائیں گے۔ اب مجھے صرف اس قدر کہنا باقی ہے کہ سلطان جہاں کے متعلق مجھے زبردست فریب دیا گیا تھا۔ مس بیگ ہی درحقیقت سلطان جہاں ہیں۔ اُنہوں نے سچ کہا تھا کہ "اس نام کی کوئی خاتون میری کلاس فیلو یا کالج فیلو نہیں تھیں"۔ دہلی سے تعلق اُن کے والد کی ملازمت تک تھا۔ ورنہ اُن کا آبائی وطن الہ آباد ہی ہے۔ نور جہاں کی رپورٹ سفید جھوٹ کا ایک پہاڑی پلندا تھی اور بس۔ نہ اُس نے سلطان جہاں کو دیکھا۔ نہ اُن کی کسی سہیلی سے ملی۔ نہ اُن کی والدہ تک پہونچی۔ نہ صرف اس قدر بلکہ وہ میرٹھ سے دہلی گئی ہی نہیں اور میرے چالیس روپے مفت میں ہضم کر گئے۔ یہ سب کچھ رشیدہ کی "عنایت" اور حسد نسوانی کا نتیجہ تھا جس کی تفصیل مجھے ہندوستان آکر معلوم ہوئی۔

سچّی کہانی

عابد پریمی

انگلستان کے نامور افسانہ نگار رائڈر ہیگرڈ نے اپنی سب سے مشہور تصنیف "SHE" کے متعلق بیان کیا ہے کہ "جن لوگوں کی یہ سرگذشت ہے انہیں میں سے ایک نے یہ تمام واقعات لکھ کر میرے پاس بھیج دیئے تھے اور مجھ سے خواہش کی تھی کہ میں اسے شائع کر دوں اس لئے جہاں تک اس کتاب کا تعلق ہے میری حیثیت ایک ایڈیٹر سے زیادہ نہیں"

آج سے پندرہ سال پہلے جب میں نے "SHE" کا مطالعہ کیا اور اس کے مصنف کا یہ بیان پڑھا تو مجھے اس کی صداقت پر یقین نہ آیا اور میں نے خیال کیا کہ غالباً کتاب کو زیادہ جاذب توجہ بنانے کے لئے یہ حیلہ تراشا گیا ہے کیونکہ کسی کی "آپ بیتی" قدرتی طور پر پڑھنے والوں کے لئے ایک فرضی اور خیالی افسانے سے کہیں زیادہ دل کشی رکھتی ہے اس وقت مجھے خیال بھی نہ تھا کہ پندرہ برس کے بعد خود مجھے بھی ایک "سچی کہانی" کا اسی طرح پبلک سے تعارف کرانا ہوگا۔

۱۰ فروری ۱۹۳۰ء کو مجھے ایک خط ملا جس کی چند سطریں درج ذیل ہیں :-

میری اپنی زندگی کا ایک واقعہ، ایک جاں گسل اور روح فرسا داستانِ محبت، میرے

دماغ میں کھولتے ہوئے خون اور دہکتی ہوئی آگ کی طرح موجزن ہے۔ متعدد مرتبہ کوشش کی کہ اس کو تحریر کر دوں تاکہ جی کی کچھ بھڑاس نکل جائے لیکن جب لکھنے بیٹھا دل بے طرح اچھلنے لگا۔ ہاتھ کانپنے لگے اور ہر مرتبہ ناتمام ہی چھوڑنا پڑی۔ میں اتنا کر سکتا ہوں کہ خاص خاص چیزیں آپ کو تحریر کر دوں۔ کیا آپ ایک اجنبی پرستار کی خوشی کے لئے اتنی تکلیف گوارا فرمائیں گے کہ اُسے مرتب کر دیں۔ میری مدّت کی آرزو پوری ہو جائے گی اور آپ کو ایک "سچی کہانی" کے لئے ایک سچا پلاٹ مل جائے گا۔ پھر میری خاطر سے اتنی زحمت اور بھی گوارا فرمائیں کہ اپنے نام سے کسی رسالہ میں شائع کرا دیں۔ یقیناً اس میں آپ کو بہت تکلیف ہوگی لیکن مجھے آپ کے اخلاق سے اُمید ہے کہ آپ اسے گوارا فرمائیں گے .... آپ کی اس ادبیت سے جس کا میں معترف ہوں مستفید ہونا چاہتا ہوں اپنی "سی توری تا" کی قسم مجھے مایوس نہ کیجیے گا .... نیاز مند، عابد پریمی

چند روز بعد ایک خط کی شکل میں یہ افسانہ وصول ہوا۔ اس میں اشخاص کے نام فرضی ہیں۔ (پریم پجاری)

مراد آباد۔ یکم مارچ ۱۹۳۷ء

میرے محترم، حسب وعدہ اپنی پریم کہانی بھیج رہا ہوں۔ مرتب فرما کر شائع کرا دیجیے:۔

خدا جانے کیوں، افسانے پڑھنے کا شوق مجھے بچپن سے تھا چنانچہ ابّا سے چھپا چھپا کے میں نے اردو کے بیسیوں ناول پڑھ ڈالے۔ چھپا کر پڑھنے کا سبب یہ تھا کہ اگر وہ کبھی کوئی ناول میرے ہاتھ میں دیکھ پاتے تو ایسے گھبرا جاتے جیسے ایک ننھے بچے کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو دیکھ لیا اور پھر اس قدر خفا ہوتے کہ جیسے میں نے کوئی سنگین جرم کیا ہے۔ ناولوں کے وہ ایسے ہی دشمن تھے جیسے پنڈت جواہر لال نہرو سرمایہ داری کے، اور ہمارے مولوی ایمان داری کے۔ میں حیران تھا کہ اگر ناول واقعی ایسی بری

چیز ہیں تو پھر کیوں لکھے جاتے ہیں۔ کیوں چھپتے ہیں، کیوں بکتے ہیں۔ اُبا کہتے تھے کہ ناول پڑھنے سے اخلاق خراب ہو جاتے ہیں اور میں دیکھتا تھا کہ ہر شخص ناول پڑھتا ہے۔ وہ خود بھی پڑھتے تھے۔ اوروں کے متعلق اگر نہیں تو کم از کم خود اُن کی بابت مجھے یقین تھا کہ ناولوں نے اُن کے اخلاق پر کوئی بُرا اثر نہیں ڈالا۔ میں نے بارہا اُن کے دوستوں اور کاروباری لوگوں سے اُن کی خوش اخلاقی اور نیک اطواری کی تعریف سُنی تھی۔ پھر جہاں تک میں اُس وقت اندازہ کر سکتا تھا، مجھے خود اپنے اخلاق و اطوار پر بھی ناول پڑھنے کا کوئی خاص مضر اثر محسوس نہیں ہوا۔ بہرحال اُبا کی ممانعت کے باوجود میں نے یہ شغل جاری رکھا۔ جاڑوں کے زمانہ میں اکثر یہ کرتا کہ شام ہی سے کمرے میں جا لیٹتا۔ سرہانے ایک طرف اسکول کی کوئی کتاب کھلی رکھی ہے۔ دوسری طرف بستر کا کونا اُٹھا ہوا ہے اور ناول دیکھا جا رہا، جیسے ہی کسی کے پاؤں کی آہٹ سُنی، بس فوراً ناول بستر کے نیچے، اسکول کی کتاب ہاتھ میں، سبق یاد ہو رہا ہے۔ آخر یہ "چوری" بھی ایک دفعہ پکڑی گئی۔

ناولوں میں سب سے زیادہ ناقابلِ فہم چیز میرے لئے محبت تھی، ماں باپ کی محبت کو میں جانتا تھا۔ بہن بھائی کی محبت کا بھی مجھے اندازہ تھا۔ مگر جس محبت کا ناولوں میں ذکر ہوتا تھا وہ میرے لئے معما تھی۔ شرر کا مشہور ناول "حسن انجلینا" جب میں نے پڑھا تو کسی طرح یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی کہ حسن کو انجلینا سے اور انجلینا کو حسن سے کیوں محبت ہو گئی۔ میں اپنے دل میں کہتا تھا کہ یا اللہ یہ عجب قسم کے لوگ ہیں۔ نہ کوئی رشتہ نہ تعلق۔ نہ جان نہ پہچان، بالکل اجنبی، بالکل بیگانے، پھر محبت کیا معنی۔ غیروں میں صرف ایک قسم کی محبت مجھے قدرتی چیز معلوم ہوتی تھی یعنی ساتھ کے کھیلنے اور پڑھنے والے لڑکوں کو یارانہ اور سہیلیوں کا بہناپا۔ مگر حسن اور انجلینا تو نہ ساتھ کھیلے تھے نہ ساتھ پڑھے تھے پھر اُن میں محبت کیوں ہوئی اور کس لئے ہوئی، اس سے زیادہ حیرت انگیز بات میرے لئے یہ تھی کہ اچھا جب کسی کو کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو یہ والدین اور عزیز و اقارب کیوں خواہ مخواہ

ان کے درمیان میں رخنہ اندازیاں کیا کرتے ہیں۔ کیوں انہیں ملنے نہیں دیتے۔ کیوں اُن کے دشمن بن جاتے ہیں۔ کیوں ہمیشہ اُن کی جُدائی کے درپے رہتے ہیں۔ پھر ان نوجوان محبت کرنے والوں کی اس حماقت پر بھی تعجب ہوتا تھا کہ مانا محبت ہے مگر اس کے لئے اپنے کو تباہ کرنے کے کیا معنی۔ بات بات پر رونا۔ بات بات پر تڑپنا۔ آخر یہ بھی کوئی عنوان ہے۔ جب تک کوئی تکلیف نہ ہو، بچہ بھی نہیں روتا۔ یہ جوان ہو کر روتے ہیں۔ شرم نہیں آتی۔ کوئی بیماری ہو، کوئی تکلیف ہو، جب بھی خیر ایک بات ہے۔ ماشاء اللہ، تندرست، ہٹے کٹے اور بیٹھے رو رہے ہیں۔ محبت نہ ہوئی دیوانگی ہو گئی کہ جب چاہا ہنس دیئے۔ جب چاہا رو دیئے۔ سب سے زیادہ غصہ مجھے اُن لوگوں پر آتا تھا جو فراق کی برداشت نہ لا کر جان دے دیتے تھے۔ میں اپنے جی میں کہتا تھا کہ ان بے دردوں کو اپنے ماں باپ پر بھی ترس نہیں آتا۔ اپنی جان دی تو دی مگر اتنا نہ سوچا کہ بدنصیب ماں کا کیا حال ہو گا۔ بدبخت باپ پر کیا بنے گی۔ وہ تو جیتے جی مر جائیں گے۔ زندہ در گور ہو جائیں گے۔ رفتہ رفتہ میرے حاسّوں میں ایک انقلاب شروع ہوا اور خود بخود محبت کا ایک مبہم سا مفہوم میرے دماغ میں جاگزیں ہو گیا۔ مگر میں ابھی تک جنسی کشش اور صنفِ نازک کی جاذبیت سے بے خبر تھا۔ اُس وقت میری عمر پندرہ سال کی تھی۔ یہ سنہ ۱۹۳۱ء کا واقعہ ہے۔

آگرہ میں میری ننھیال ہے اور کچھ کاروباری تعلقات بھی۔ اس لئے اکثر وہاں آنا جانا رہتا ہے۔ سنہ ۱۹۳۱ء ختم ہو رہا تھا کہ میں آگرہ گیا۔ نانی کے یہاں ٹھہرا۔ رفیق اور رئیس میری دو خالائیں بھی اُس وقت وہاں موجود تھیں۔ رفیق میری ہم سن ہیں اور رئیس مجھ سے چھوٹی۔ خردی و بزرگی کا رشتہ ہوتے ہوئے بھی ہم لوگ بالکل بہن بھائیوں کی طرح تھے۔ کیوں کہ ہماری عمروں میں کچھ ایسا فرق نہ تھا۔ رفیق کی طبیعت پر شاید اُن کے نام کا اثر پڑا۔ جب دیکھو دو ایک سہیلیاں اُن کے ساتھ ہیں۔ پڑوس کے گھر کچھ اِس طرح

واقع ہوئے تھے کہ آنا جانا کچھ دشوار نہ تھا۔ صبح سے شام تک کوئی نہ کوئی اُن کی ہمجولی آتی ہی رہتی تھی۔ رئیس کی سہیلیاں اُس کی کتابیں تھیں۔ کتابوں کو وہ پڑھتی کیا تھی کھاتی تھی۔ کوئی رسالہ ہاتھ میں لیا اور گھنٹہ بھر میں ختم۔

جاڑے کے دن تھے، صبح کا وقت، میرے سر میں درد ہو رہا تھا۔ آنگن میں پلنگ بچھوا کر دھوپ میں لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں دھوپ تیز ہو گئی۔ میں نے پلنگ بیری کے سایہ میں کھینچ لیا۔ اتنے میں رفیق آ گئیں۔ میرے پاس ہی بیٹھ گئیں۔ کہنے لگیں "لا تیرا سر دبا دوں" میں نے کہا "نہیں اب ایسا درد نہیں ہے" پھر ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں جدھر میری پیٹھ تھی اُدھر سے کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ آنے والا شاید مجھے دیکھ کر جھجکا۔ رفیق نے کہا "آؤ، آؤ، کوئی نہیں عابد ہے" میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ کوئی تیرہ چودہ سال کی ایک بھولی بھالی خوبصورت لڑکی۔ وہ آئی۔ برابر ہی ایک اور پلنگ پڑا تھا۔ اُس پر بیٹھ گئی۔ یہ رفیق کی بہت ہی پیاری سہیلی نجمہ تھی۔ اوّل تو میری عمر کچھ ایسی زیادہ نہ تھی۔ پھر آگرہ میں ہمارے مرادآباد جیسا سخت پردہ ہے بھی نہیں اس کے علاوہ نجمہ کی والدہ مرحومہ سے ہماری بہت دور کی کچھ رشتہ داری بھی تھی اور نجمہ بارہا رفیق سے میرا ذکر سن چکی تھی۔ اس لئے بے جھجک سامنے آ گئی۔ رفیق اور نجمہ باتوں میں مصروف تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ کل کس گاڑی سے مرادآباد واپس جاؤں۔ یکایک مجھے ایسا محسوس ہوا کہ نجمہ دَوران گفتگو میں رفیق کی اور خود میری نظر بچا کر بار بار مجھے دیکھتی رہی، پہلے تو مجھے خیال ہوا کہ شاید اتفاقیہ طور پر اُس کی نظر میری طرف اُٹھ گئی ہو گی لیکن جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ نہیں "اتفاقیہ" کا یہاں کوئی سوال نہیں۔ آخر ایک دفعہ ہماری آنکھیں چار ہو گئیں۔ نجمہ نے فوراً نہایت بے پروائی کے ساتھ رُخ پھیر لیا اور پھر کئی منٹ تک میری طرف نہ دیکھا جس سے مجھے شبہ ہوا کہ غالباً میرا پہلا خیال ہی صحیح تھا۔ بہر حال میرے دل میں ایک عجیب قسم کی خلش سی پیدا

ہو گئی۔ نجمہ نے پھر ایک بار میری طرف دیکھا۔ پھر ہماری نگاہیں ملیں۔ پھر وہ دوسری طرف متوجہ ہو گئی۔ میری نگاہیں برابر نجمہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں میں نے دیکھا، اس کے رخساروں پر سرخی کی ایک جھلک نمودار ہوئی۔ شاید وہ اپنی "چوری" کھُل جانے کی وجہ سے جھینپ گئی تھی۔ خدا جانے کیوں خلافِ معمول اس وقت میرا دل کچھ زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ نجمہ یکایک اُٹھ کھڑی ہوئی۔ رفیق نے کسی قدر متعجب ہو کر پوچھا:۔

"کیوں! کہاں؟"

"کہیں نہیں ذرا پانی پیوں گی"

"بیٹھ، میں لاتی ہوں"

یہ کہہ کر رفیق پانی لانے چلی گئی۔ نجمہ بیٹھ گئی۔ اُس کے سر پر دھوپ آ رہی تھی۔ میرا پلنگ سایہ میں تھا۔ میں نے کہا "آپ کے اوپر دھوپ ہے، ادھر آ جایئے"۔ اب تک میں لیٹا ہوا تھا، یہ کہہ کر اُٹھ بیٹھا۔ سرہانے کی طرف نجمہ کے لئے جگہ چھوڑ دی۔ پہلے وہ کچھ جھجکی۔ ایک بار میری طرف دیکھا۔ پھر کچھ کہے بغیر میرے پلنگ پر آ کر بیٹھ گئی اتنے میں رفیق بھی آ گئیں۔ نجمہ نے پانی پیا اور پھر باتیں ہونے لگیں۔ میں بھی ان کی گفتگو میں شریک ہو گیا۔ نجمہ کی بھولی بھولی معصومانہ باتیں بے جھجک آزادانہ گفتگو الڑھ پن کے ساتھ ساتھ ایک خاص لجاہٹ، ہر شے میں میرے لئے ایک دل کشی تھی۔ نجمہ کے ساتھ باتیں کرنے سے اس وقت میرے دل کو جو خوشی ہوئی وہ زندگی میں میرا پہلا اور بالکل نیا تجربہ تھا۔ نجمہ بھی اس مختصر صحبت سے بہت مسرور معلوم ہوتی تھی۔ میری "چٹکیوں" اور "گدگدیوں" نے اُسے بہت ہنسایا تھا اور ہم ایک دوسرے سے خاصے بے تکلف ہو گئے تھے۔

نجمہ تھوڑی دیر کے بعد چلی گئی۔ اس کا گھر دیوار بیچ تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اُسے دوبارہ دیکھنے کے لئے میری آنکھیں اور میرا دل

دونوں آرزومند تھے۔ سب سے زیادہ عجیب بات یہ کہ مجھے قریب قریب یقین تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر آئے گی۔ حالانکہ اس یقین کی بظاہر کوئی وجہ نہ تھی۔ بہرحال میں منتظر تھا۔ وہ آئی اور کئی بار آئی۔ کبھی کوئی کام، کبھی کوئی پیغام، کبھی کچھ لینے کے لئے کبھی کچھ دینے کے لئے، گھر میں ذرا سی کوئی بات ہوئی اور کہنے کے لئے دوڑی آئی۔ ہر مرتبہ مجھ سے بھی ایک، دو بات کر جاتی۔ اُس وقت میں نے اسے "حُسنِ اتفاق" سے تعبیر کیا۔ مگر اب کہہ سکتا ہوں کہ یہ سب بہانے تھے۔ بار بار عابد کے دیکھنے کو جی چاہتا تھا اس لئے کوئی نہ کوئی حیلہ، کوئی نہ کوئی عذر ضروری تھا۔ شاید کوئی نفسیات کا ماہر بتا سکے، میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ بھولی نجمہ اتنی جلد اس قدر چالاک کیسے ہو گئی۔

دن ختم ہوا۔ رات آئی۔ مراد آباد جانے والی ٹرینوں کے اوقات کے بجائے اب نجمہ کا خیال میرے دماغ میں جاگزیں تھا۔ سویا تو اُس کا خیال لے کر سویا۔ جاگا تو اس کا خیال لے کر جاگا۔ صبح کو نانی اماں نے پوچھا:۔

"عابد، کس گاڑی سے جائے گا؟" میں نے کہا "میں تو ابھی نہیں جاتا" وہ بولیں "عجب لڑکا ہے۔ میں تو خود ہی کہہ رہی تھی کہ اب آیا ہے تو دو چار دن رہ جا۔ تجھی کو خدا جانے کیوں اتنی جلدی تھی۔ اچھی بات ہے۔ آج کیا دن ہے، جمعہ؟ جمعہ، سنیچر، اتوار، پیر، پیر کو جانا۔ مبارک دن ہے" میں چپ ہو رہا۔ نجمہ کل کی طرح آج بھی کتنی ہی بار آئی آج میں نے سارا دن گھر ہی میں گذار دیا۔ باتیں ہوئیں اور بہت ہوئیں۔ ہم دونوں کے لئے ایک دوسرے کی صحبت یکسر خوشی تھی۔ جاڑوں کے دن یوں بھی چھوٹے ہوتے ہیں مگر مجھے تو گھنٹوں کی طرح مختصر معلوم ہوتے تھے۔ ابھی صبح تھی، اب دوپہر ہو گئی۔ اب شام ہے۔ لو پھر دن نکل آیا۔ اور دیکھتے دیکھتے تمام ہو گیا۔ ایک ہفتہ اسی طرح گذر گیا۔ میرے جذبات و احساسات میں ایک زبردست انقلاب رونما ہو رہا تھا۔ روز میری آنکھوں سے پردے اُٹھتے جا رہے تھے۔ اب میں وہ عابد نہ تھا جو کل تک حسن

اور انجلینا کی محبت کی نوعیت سمجھنے سے قاصر تھا جس کے نزدیک چاہنے اور چاہے جانے کی لذتیں، فراق کی کاہشیں، ایک جائی کی مسرتیں معمے اور پہیلیاں تھیں۔ اب مجھ میں محبّت کی رنگین لطافتوں سے لذّت گیر ہونے کی کافی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی۔

نجمہ اب واقعی میرے لئے ایک ستارہ تھی، آسمانی ستاروں سے زیادہ تابناک زیادہ خوبصورت۔ اُس نے میرے دل کو محبت کے انوار سے بھر دیا تھا بڑی سرعت کے ساتھ ہم بالکل غیر شعوری طور پر ایک دوسرے سے نزدیک ہوتے جا رہے تھے۔ ہماری روحیں بربط کے تاروں کی طرح ہم آہنگ ہو گئی تھیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے بیتاب رہنے لگے تھے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ مجھے نجمہ سے زیادہ محبت تھی یا نجمہ کو مجھ سے۔ ایک دن نانی اماں اور رئیس کہیں پڑوس میں گئی ہوئی تھیں۔ رفیق غسل کر رہی تھیں کہ نجمہ آئی۔ گھر اکیلا دیکھ کر واپس جانے لگی۔ میں نے روکا۔ وہ ہچکچائی۔ کچھ گھبرائی۔ آخر بیٹھ گئی۔ تنہائی تھی، آزادی تھی۔ کسی قسم کا خوف نہ تھا۔ ہم نے آج ہمیشہ سے زیادہ کھل کر باتیں کیں۔ نجمہ کی آنکھیں جرأت آموز تھیں اور میں اظہارِ آرزو کے لئے بیتاب۔ قریب ہو کر میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ خدا جانے کیوں وہ باتیں کرتے کرتے یکایک چپ ہو گئی اور زمین کی طرف دیکھنے لگی میں بھی خاموش تھا۔ سینہ میں جذبات کا تلاطم برپا تھا۔ مگر زبان یاری نہیں دیتی تھی آخر بڑی مشکل سے میں نے کہا "نجمہ!" اپنا نام سن کر وہ چونک پڑی۔ میں نے اُس کے ہاتھ میں ایک لرزش سی محسوس کی۔ اُس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں پریم کا ساگر موجیں مار رہا تھا جس میں حجاب اور معصومیت کی پریوں کو میں نے نہاتے دیکھا۔ ہماری نگاہیں ملیں۔ شاید اس وقت میری تمام آرزوئیں سمٹ کر میری آنکھوں میں آ گئی تھیں۔ جبھی تو وہ میری خاموشی کے باوجود سمجھ گئی کہ میں کیا کہنا

چاہتا ہوں اور شرما کر سر جھکا لیا۔ کوئی دو منٹ تک ہم دونوں اسی طرح خاموش بیٹھے رہے۔ آخر میں نے طلسم خاموشی کو توڑا اور جو کچھ کہنا تھا بیباکانہ کہہ ڈالا۔ وہ چپ بیٹھی سنتی رہی۔ نہ سر اٹھایا نہ جنبش کی۔ اس کا ہاتھ اب بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ کوئی ایک منٹ تک ہم پھر خاموش رہے۔ اب میں نے دعوائے محبت کی تصدیق کے لئے قسمیں کھانی شروع کیں۔ کیا بتاؤں کس کس کی قسم کھائی مگر وہ اس طرح بت بنی بیٹھی تھی گویا کچھ سن ہی نہیں رہی۔ آخر میں نے کہا۔ نجمہ! جو کچھ میں نے کہا۔ اگر جھوٹ ہو تو خدا کرے میں کبھی تجھے نہ پا سکوں ——— نجمہ ان لفظوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس نے ایک جھرجھری سی لی اور ایک نہایت دلربایانہ انداز سے میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔ پھر دونوں ہاتھوں سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ یہ خاموش جواب میرے لئے بالکل کافی تھا۔ مجھے اطمینان ہو گیا کہ اسے میری محبت کا یقین آگیا۔ اس وقت کی خوشی کن الفاظ میں بیان کروں۔ میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ رفیق نہا کر آرہی تھیں۔ نجمہ فوراً کھسک کر مجھ سے ذرا دور بیٹھ گئی۔

میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں کہ نجمہ رفیق کی بہت پیاری سہیلی تھی مگر ایسا بھی خیال نہ تھا کہ وہ اس واقعہ کو بھی ان سے کہہ دیگی۔ مگر اس نے اولین فرصت میں سب کچھ انہیں بتا دیا۔ رفیق نے اس کے متعلق مجھ سے کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اب جب نجمہ آتی تو وہ کسی نہ کسی بہانے سے ادھر ادھر ہو جاتیں تاکہ ہم لوگ آپس میں ہنس بول لیں۔ میں کل تین دن کے لئے آگرہ آیا تھا مگر بارہ دن گزر گئے کسی طرح جانے کو دل نہیں چاہتا۔ والد کا خط ملا کہ پہلی ٹرین سے مرادآباد پہونچو۔ اس نادر شاہی فرمان کی تعمیل نہ کرنا میرے امکان سے باہر تھا۔ چنانچہ دوسرے دن واپسی کا تہیہ کر لیا۔ نجمہ میرے جانے کی خبر سن کر سخت مضطرب ہو گئی۔ اور روانگی سے کچھ پہلے آخری بار ملنے آئی۔ رفیق کی مہربانی سے ہمیں پھر ایک بار تنہائی میں ملنے کا موقع مل گیا۔ میں اپنی اس وقت

کی حالت کن الفاظ میں بیان کروں۔ رنج و غم کی شدت سے میرا کلیجہ نکلا پڑتا تھا۔ بے اختیار دل بھرا آرہا تھا۔ آخر ضبط نہ ہو سکا اور میری آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ شاید آپ مجھ پر ہنسیں گے اور آپ کو ہنسنے کا حق ہے۔ ہاں میں وہی عابد تھا جو سوچا کرتا تھا کہ یہ محبت کرنے والے کیا دیوانے ہوتے ہیں جو بچوں کی طرح روتے ہیں، انہیں شرم نہیں آتی۔ مجھے اشکبار دیکھ کر نجمہ سخت بے قرار ہو رہی تھی، آخر وہ اٹھی، اپنے دوپٹہ کے آنچل سے میرے آنسو پونچھنے لگی اور کہا "عابد، روؤ نہیں!" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ یا تو مجھے تسلی دے رہی تھی یا منہ پھیر کر خود بھی رونے لگی۔ میں حیران تھا کہ کیا کروں۔ روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔ آخر میں نے کہا۔ نجمہ خدا کے لئے نہ رو، میرا دم نکلا جاتا ہے۔ میں بہت جلد آگرہ آنے کی کوشش کروں گا۔ خدا کو منظور ہے تو ہم پھر یک جا ہوں گے۔ اس وقت میرے دونوں ہاتھ نجمہ کے کاندھوں پر رکھے ہوئے تھے۔ ہم دونوں کھڑے تھے۔ نجمہ نے آج تک ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہا تھا جسے اعتراف محبت کہا جا سکے لیکن آخر چوٹ کھایا ہوا دل کہاں تک برداشت کر سکتا ہے۔ اس نے کہا "عابد! میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گی!" شاید وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔ مگر جذبات کے ہیجان میں نہ کہہ سکی۔ اتنے میں رفیق خالہ نے آواز دی کہ "عابد! گاڑی کا وقت تنگ ہو رہا ہے، تانگے والا چلّا رہا ہے!" میں نے کہا "اچھا نجمہ خدا حافظ!" نجمہ خاموش کھڑی مجھے دیکھتی رہی اور کوئی جواب نہ دیا۔ میں کمرہ سے نکل کر چلا آیا۔

تھوڑی دیر کے بعد میری ٹرین بڑی تیزی کے ساتھ مجھے مراد آباد کی طرف اڑائے لئے جا رہی تھی۔ آج پیر کا دن تھا۔ وہی پیر جسے نانی اماں بہت مبارک خیال کرتی تھیں۔ مگر آج میں نے محسوس کیا کہ پیر سے زیادہ منحوس ہفتے میں کوئی دن نہیں۔ گھر پہونچ کر طبیعت کی کچھ عجیب کیفیت تھی۔ دل پر غم کے بادل چھائے ہوئے

تھے۔ کبھی کبھی آنکھیں برسنے لگتی تھیں۔ معصوم مسرتوں کی وہ خوشگوار ساعتیں جنہیں نجمہ کی دل نواز مسکراہٹوں نے میرے لئے منتہائے آرزو بنا دیا تھا رہ رہ کر یاد آتی تھیں اور مجھے بری طرح تڑپاتی تھیں۔ نجمہ کی بھولی صورت ہر وقت آنکھوں کے سامنے تھی۔ بارہا مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی آہستہ سے میرے کان میں کہہ رہا ہے "عابد" میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گی۔" چند روز بہت تکلیف سے گذرے لیکن رفتہ رفتہ اضطراب کم ہو گیا۔ گھر کے کام۔ تعلیم کا مشغلہ۔ بہت سی چیزیں تھیں جن میں توجہ بٹ گئی۔ لیکن نجمہ کو بھول جانا میرے بس کی بات نہ تھی۔ پھر ہر تیسرے چوتھے مہینے آگرہ جانا ہوتا رہا۔ نجمہ سے ہر مرتبہ ملاقات ہوئی اور محبت کے نقش جو دوری کے اثر سے کچھ دھندلے پڑ جاتے تھے چند لمحوں کی ملاقات کے بعد پہلے سے زیادہ روشن ہو جاتے۔ ہمارے ساتھ ساتھ ہماری محبت بھی شباب کی پر آشوب منزلیں طے کر رہی تھی۔ جوانی دیوانی مشہور ہے اور محبت تو اندھی ہوتی ہی ہے۔ پھر جب ان دونوں کا ایک جگہ اجتماع ہو جائے تو خدا کی پناہ۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم جو کچھ کرتے ہیں اسے نہ کوئی دیکھ سکتا ہے نہ سمجھ سکتا ہے۔ مگر سب دیکھتے تھے اور سب سمجھتے تھے۔ جب ہماری بے باکیاں چشم پوشی کی حد سے گذرنے لگیں تو پابندیاں عائد کی گئیں۔ نجمہ کا مجھ سے پردہ ہو گیا۔ مگر یہ پردہ اسی قسم کا تھا جسے اصطلاح میں کا نا پردہ کہتے ہیں۔

غرض اسی طرح زمانہ گذرتا گیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۳ء آ پہونچا۔ اس سال میں علی گڑھ نمایش دیکھنے گیا وہاں ایک دوست سے یونیورسٹی جا کر ملنا تھا۔ ان کا پورا پتہ مجھے معلوم نہ تھا۔ علی گڑھ میں اس سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ اس لئے کسی جگہ کا کوئی صحیح اندازہ نہ تھا پوچھتا پوچھتا چلا۔ ایک بڑی سی عمارت کے قریب پہونچا تو دو لڑکے جاتے ہوئے ملے۔ میں نے ان سے اپنے دوست کا پتا پوچھا۔ یا انہوں نے شرارت کی یا میں نے حماقت کی۔ بہر حال ان کے بتائے ہوئے پتے پر ایک کوٹھی میں داخل ہو گیا۔ خدا جانے

یہ کون جگہ تھی جس وقت میں نے عمارت کے برآمدے میں قدم رکھا مجھ سے کوئی دس قدم کے فاصلے پر ایک لڑکی نکلی۔ سیاہ ریشمین برقع اس کے کاندھے پر پڑا ہوا تھا۔ ایک شانِ استغنا کے ساتھ وہ میرے آگے آگے جانے لگی۔ کمرہ سے نکلتے وقت اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اب میرے پاؤں کی آہٹ سنی تو پلٹ کر دیکھا۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں اس نے برقع کھینچ کر منہ پر ڈال لیا اور تیزی سے پھر چل پڑی۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا " جیسے ہیں ہی بڑی خوبصورت "، حقیقتاً وہ بہت خوبصورت تھی مگر میں نے یہ الفاظ محض چھیڑنے کی غرض سے کہے تھے۔ وہ جھلا گئی اور پلٹ کر بولی " اپنے آپ جیسے بڑے حسین ہیں " یہ کہا اور جھٹ برابر والے کمرے میں داخل ہو گئی میں نے محسوس کیا کہ یقیناً میں کسی غلط جگہ چلا آیا یہ لڑکوں کا بورڈنگ نہیں ہو سکتا۔ لہذا جلد سے جلد اُس کوٹھی سے نکل آیا۔ جن صاحب کی تلاش تھی اُنہیں ہر چند ڈھونڈا مگر وہ نہ ملے۔

دوسرے دن میں مرادآباد واپس آگیا۔

چند ہی روز کے بعد والد صاحب نے ایک شادی میں شرکت کی غرض سے مجھے علی گڑھ بھیجا کیونکہ وہ خود نہیں جا سکتے تھے۔ میں شادی میں شریک ہوا اور شام کو آگرہ جانے کی غرض سے ہاوڑہ، دہلی ایکسپرس میں سوار ہو گیا۔ گاڑی نے سیٹی دی۔ اور آہستہ آہستہ رینگنا شروع کیا۔ اتنے میں دو برقع پوش عورتیں دوڑتی ہوئی پلیٹ فارم پر آئیں جو آگے تھی وہ بغیر کچھ دیکھے بھالے میرے ڈبے میں سوار ہو گئی۔ جو پیچھے تھی وہ نہ چڑھ سکی، رہ گئی۔ گاڑی جب تک پلیٹ فارم کے برابر چلتی رہی، میں کھڑکی سے سر نکالے باہر دیکھتا رہا۔ مگر جب اسٹیشن کافی پیچھے رہ گیا تو میں پہلو بدل کر بیٹھ گیا۔ قدرتاً ان محترمہ پر میری نظر پڑی جن اتفاق بلکہ سوءِ اتفاق سے ہم دونوں کے سوا اس درجہ میں اور کوئی مسافر نہ تھا۔ اس ظالم نے خدا جانے کیا سوچ کر برقع اُتار ڈالا۔ میں چونک پڑا۔ یہ وہی شرارت کی پتلی تھی جسے میں نے علی گڑھ میں دیکھا تھا۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ کبھی

کبھی باہر کی طرف دیکھنے لگتا۔ وہ بالکل میرے مقابل بیٹھی ہوئی تھی۔ آخر میں اُسے نہ دیکھتا تو کیا کرتا۔ اُس نے ایک لمحہ کے لئے بھی میرے چہرے سے نظر نہیں ہٹائی۔ کچھ دیر وہ چپ رہی، پھر اُس کے گلابی ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مُسکراہٹ نمودار ہوئی اور اُس نے نہایت دلربایانہ انداز سے پوچھا:۔

"آپ آگرہ جا رہے ہیں نا؟"

"جی ہاں" میں نے کسی قدر متعجب ہو کر کہا۔

"آگرہ میں شاہ گنج جائیے گا؟"

"جی ہاں" میرا تعجب اور بھی بڑھ گیا۔

"آپ مراد آباد سے آئے ہیں نا؟"

"جی ہاں" اب میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔

"آپ کا نام عابد ہے؟"

ظالم کے اس سوال نے تو مجھے مبہوت ہی کر دیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ الہام ہے یا معجزہ، یا کوئی شعبدہ، آخر میں نے گھبرا کر کہا:۔

"جی ہاں۔ مگر آپ کو کیسے معلوم؟"

اُس نے ایک زور کا قہقہہ لگایا جس سے میں خواہ مخواہ جھینپ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اُس روز علی گڑھ میں میں نے جو گستاخی کی تھی اس نے آج اچھی طرح اُس کا انتقام لے لیا۔ اور اب اپنی کامیابی پر مسرور رہے۔ اس احساس کی بنا پر میرے مزاج کا پارہ نقطۂ اعتدال سے ذرا اونچا ہو گیا۔ وہ نہایت دلچسپی کے ساتھ میرے چہرے کے تغیرات کا مطالعہ کر رہی تھی اور برابر مُسکرا رہی تھی جس سے مجھے یہ خیال ہوا کہ یقیناً وہ میری اندرونی کیفیات کو بھی سمجھ رہی ہے۔ آخر اُس نے یکایک متین صورت بنا کر کہا:۔

"میرے ہنسنے پر آپ شاید بُرا مان گئے"

"بُرا ماننے کی تو کوئی بات نہیں" میں نے نہایت رُکھائی سے جواب دیا۔

"اچھا تو اب بتا ہی دوں کہ میں آپ کو کس طرح جانتی ہوں؟" اُس نے پھر مُسکرا کر پوچھا۔

"آپ کا جی چاہے تو بتا دیجئے"

اگرچہ میرے جواب میں اظہارِ اشتیاق کا ذرا سا بھی شائبہ نہ تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں اس پُر اسرار حقیقت سے واقف ہونے کے لئے سخت بے چین ہو رہا تھا۔ میرا استغنا فقط ظاہری تھا۔ مگر خدا جانے کس طرح اُس پرکالۂ آفت نے میرے دل کی یہ چوری بھی پکڑ لی۔ اُس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا:۔

"خوب، میرا جی چاہے تو بتا دوں۔ ورنہ آپ کو تو اس سے کوئی دلچسپی نہیں"

یہ کہہ کے اُس نے میرے چہرے پر ایک پُر معنی نظر ڈالی۔ میں نے خاموشی ہی میں عافیت دیکھی اس لئے اُس کے اس طعنہ آمیز سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ایک لمحہ خاموش رہ کر بولی:۔

"اچھا تو سُنیئے، آپ کی رفیق خالہ میری دوپٹہ بدل بہن ہیں۔ میں بھی وہیں شاہ گنج میں اُن کے قریب ہی رہتی ہوں۔ رفیق سے ملنے آپ کی نانی کے یہاں اکثر جایا کرتی ہوں۔ ابھی کوئی بیس روز ہوئے۔ ایک دن میں وہیں بیٹھی ہوئی تھی کہ آپ کا خط اور آپ کی تصویر پہونچی۔ تصویر میں نے بھی دیکھی۔ میرے پوچھنے پر رفیق نے آپ کے متعلق سب باتیں مجھے بتائیں۔ اُس دن علی گڑھ میں جو آپ سے سامنا ہوا تو فوراً خیال گذرا کہ میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔ بہت سوچنے کے بعد یاد آیا کہ نہیں آپ کو تو نہیں دیکھا البتہ آپ کی تصویر دیکھی ہے"

"اور وہاں آپ تھیں کیوں؟" میں نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں، علی گڑھ میں؟ وہاں میں پڑھتی ہوں"

"کس کلاس میں؟"

"نویں میں"

میں نے اور اسی قسم کے سوال کئے، وہ سب کا جواب دیتی رہی۔ آخر میں نے اُس کے والد کا نام پوچھا۔ اس نے بتایا۔ میں اُن کا نام پہلے بھی سُن چکا تھا۔ نہ صرف نام بلکہ یہ بھی سُنا تھا کہ وہ شیعہ طبقہ کے معززین میں سے ہیں۔ اس کا اپنا نام عذرا تھا۔ باتوں باتوں میں اُس نے بیان کیا کہ "جب سے آپ کی تصویر دیکھی تھی بے اختیار جی چاہتا تھا کہ آپ کو دیکھوں"

"یہ کیوں؟"

"یہ تو خود مجھے بھی نہیں معلوم" جس وقت عذرا کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے کافور ہو گئی۔ چہرہ پر ایک ہلکی سی اُداسی دوڑ گئی، اُس کی گردن جھک گئی۔ وہ چپ ہو گئی۔ خدا جانے کیا سوچنے لگی۔ پھر یکایک بول اُٹھی:-

"آپ نے یوسف زلیخا کا قصہ پڑھا ہے؟"

میں نے کہا "پڑھا تو نہیں سُنا ہے"

"کیا سُنا ہے؟"

"یہی کہ زلیخا نے یوسف کو خواب میں دیکھا اور عاشق ہو گئی"

"کیا ایسا ممکن ہے؟"

"کیوں، ممکن کیوں نہیں"

"کیا یہ بھی ممکن ہے کہ صرف تصویر دیکھ کر کوئی کسی کو چاہنے لگے؟"

میں اُس کے اس سوال کا مقصد سمجھ گیا۔ میں نے کہا "شاید"

"شاید؟ یقیناً نہیں؟"

"مجھے کیا خبر۔ جسے اس کا تجربہ ہوا ہو وہ جانے"

اُس نے اپنا اٹیچی کیس کھول کر ایک لفافہ نکالا اور مجھ سے پوچھا:۔

"آپ جانتے ہیں اس میں کیا ہے؟"

میں نے کہا "نہیں تو"

"کھول کر دیکھئے" اُس نے لفافہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے لفافہ کھولا۔ اس میں میری وہی تصویر تھی جو میں نے رفیق کو بھیجی تھی۔

"یہ تمہارے پاس کہاں سے آئی" میں نے متعجب ہو کر پوچھا۔

"چرا کر لائی ہوں" اُس نے مسکرا کر جواب دیا۔

اتنے میں ٹونڈلہ کا اسٹیشن آگیا۔ ہم نے گاڑی بدلی۔ اتفاق سے پھر ہمیں تنہا بیٹھنے کا موقع مل گیا۔

"آپ کب واپس جائیں گے؟" اُس نے پوچھا۔

"پرسوں رات کی گاڑی سے۔ اور آپ؟"

"شاید کل"

اس کے بعد اُس نے پھر وہی قصہ چھیڑ دیا اور طرح طرح سے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ مجھے چاہتی ہے۔ شاید میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ وہ خوبصورت تھی۔ مگر صرف خوبصورت کہہ دینا اُس کے بے پناہ جمال و رعنائی کی توہین کرنا ہے کس طرح آپ کو سمجھاؤں۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ فرضی افسانوں میں خیالی حُسن و زیبائی کے جو مُرقعے پیش کیے جاتے ہیں، عذرا اُس کا ایک سچا نمونہ تھی۔ پھر بلا کی شوخ غضب کی چُلبلی۔ دل کو موہ لینے والی باتیں۔ نجمہ کی محبت اگر پہلے سے میرے قلب و روح کی انتہائی گہرائیوں میں جاگزین نہ ہو چکی ہوتی تو یقیناً میں اُس کی پرستاری کو حاصل زندگی سمجھتا۔ نجمہ اگر ایک ستارہ تھی تو عذرا کہکشاں تھی۔ نجمہ اگر ایک پھول تھی تو عذرا

ایک گلدستہ بلکہ گلستاں تھی۔ لیکن محبت کرنے والے کا دل ایک ایسا گھر ہے جس میں ایک سے زیادہ مہمان کے ٹھہرنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔

آخر اس نے سراپا اشتیاق بن کر پوچھا:۔

"آپ نے میری بات کا کچھ جواب نہ دیا"

"کس بات کا" میں نے ہنس کر کہا۔

"آپ بھی مجھ سے محبت کر سکتے ہیں۔ یا نہیں؟"

مجھے کسی افسانے کا ایک جملہ یاد تھا، وہی دھرا دیا کہ "بیوقوف، محبت کرنے کی چیز نہیں، ہو جانے والی شے ہے"

"تو آپ خود کو میری طرف راغب کیجئے۔ میری طرف ملتفت ہو جئے۔ آپ کو یقیناً محبت ہو جائے گی"

"مگر مجھے کیا خدا کی مار ہے کہ خواہ مخواہ اس بکھیڑے میں پڑوں"

ان لفظوں سے اس کے دل پر سخت چوٹ لگی۔ اُس نے نہایت دردناک اور مایوسانہ لہجہ میں کہا "بڑے بیدرد ہیں آپ"

اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے اور کوئی دو منٹ کے بعد جب ہٹائے تو میں نے دیکھا کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میں بھی بے چین ہو گیا اس لئے کہ بقول مرزا داغ کے:۔

کون یہ دیکھ سکے کوئی حسیں روتا ہے
ہو بناوٹ سے بھی رونا تو قلق ہوتا ہے

محض اُس کی خاطر میں اُٹھا اور چاہا کہ اُس کے آنسو پوچھ کر اُسے تسکیں دوں۔ اُس نے سخت لہجہ میں کہا:۔

"آپ وہیں تشریف رکھیئے۔ جو کچھ کہنا ہے، وہیں سے کہیئے"

میں بیٹھ گیا۔ اب میں کیا کہتا۔ خاموش تھا اور اس ادھیڑبن میں مبتلا کہ کیا کروں۔ جی میں کہتا تھا کہ عجیب لڑکی ہے۔ خواہ مخواہ گلے کا ہار ہوئی جاتی ہے۔ آخر اُس نے قسمیں کھا کھا کر اپنی محبت کا یقین دلانا شروع کیا۔ میں نے تنگ ہو کر کہا:۔

"فرض کرو مجھے تم سے محبت ہو گئی۔ پھر اس سے فائدہ؟"

"فائدہ؟ خوب، کسی سے محبت کر کے دیکھو۔ بس پھر یہی آرزو ہوگی کہ کسی طرح یہ بھی مجھے چاہے۔"

غرض اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ آگرہ آنے کے آثار شروع ہو گئے۔ وہ سنبھل کر برقع اوڑھ کر اترنے کے لئے تیار ہو بیٹھی۔ اُس نے میرا پتا مانگا تھا مگر میں نے یہ کہہ کر پتا دینے سے انکار کر دیا کہ میرے سب خط والد صاحب کے ہاتھ میں جاتے ہیں۔ اس لئے خط و کتابت ناممکن ہے۔ اسٹیشن سے وہ اور میں ایک ہی مقام کو الگ الگ سواریوں میں چلے گئے۔"

تیسرے دن رات کو دس بجے میں آگرہ سٹی اسٹیشن سے سوار ہوا۔ اُسی ڈبہ میں وہ پہلے سے بیٹھی ہوئی آگرہ کینٹ سے آرہی تھی، اس کے ساتھ اس کی ایک سہیلی اختری بھی تھی آج عذرا بہت افسردہ نظر آرہی تھی۔ چہرہ کملایا ہوا تھا۔ میں نے کہا "تم تو کل واپس جانے والی تھیں۔" اُس نے کہا "ہاں، مگر کل طبیعت خراب ہو گئی، نہ جا سکی۔" پھر اس نے وہی پرسوں کی سی باتیں شروع کر دیں۔ اپنی محبت کے افسانے دہراتی رہی۔ رفتہ رفتہ ہمارا موضوع گفتگو محبت سے بدل کر شادی ہو گیا۔ اس کا اصرار حد سے زیادہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے کہا "سنو عذرا، تم شیعہ میں سنّی۔ بھلا میرا تمہارا کیا جوڑ۔ تمہارے والدین کب اس رشتہ کو گوارا کر سکتے ہیں۔"

اُس نے کہا "والدین کو راضی کرنا میرا کام ہے۔ رہا شیعہ سنّی کا سوال تو مجھے افسوس ہے کہ آپ ایسی کمزور بات کہتے ہیں۔ محبت کرنے والوں کا مذہب فقط محبت ہوتا ہے۔

سُنی کیا اور شیعہ کیا سُنی شیعہ تو پھر مسلمان ہیں، محبت کے بندے تو کفر و اسلام میں بھی کوئی فرق نہیں کرتے۔ آپ نے سُنا ہوگا، دلی کے آصف علی بیرسٹر نے ایک ہندو بنگالن سے شادی کی ہے۔ لاہور کے کوئی رئیس ہیں لالہ ہرکشن لال، اُن کے بیٹے گوبا کی بیوی مسلمان ہے۔ یہ جو مسلمانوں کے بڑے مشہور لیڈر ہیں محمد علی جناح، اُن کی بیوی پارسی تھیں۔ کل ہی ابا ذکر کر رہے تھے کہ بمبئی کی کوئی بڑی معزز مسلمان خاتون ہیں عطیہ فیضی ان کے میاں یہودی ہیں۔ پھر ولایت جانے والے کتنے ہندو مسلمان، میمیں لے آتے ہیں، جو سب عیسائی ہوتی ہیں۔ تو کیا اس سے ان کی زندگی کی مسرتوں میں کوئی کمی آجاتی ہے بہر حال اگر تم اس بے معنی اختلاف کی بنا پر مجھے ٹھکرا رہے ہو تو اچھا تم اپنے گھر مجھے شیعہ مت رہنے دینا۔"

"مگر تمہارے والدین کبھی اس رشتہ پر راضی نہیں ہو سکتے۔"

"یہ آپ نے کیسے فرض کر لیا۔ آپ اُنہیں مجھ سے زیادہ جانتے ہیں؟ آپ کو کیا خبر کہ وہ مجھے کتنا چاہتے ہیں۔ نو بہن بھائیوں میں میں اکیلی بچی ہوں۔ دونوں مجھے دیکھ کر جیتے ہیں۔ آج تک میری کوئی خواہش رد نہیں کی۔ کیا میری زندگی بھر کی خوشی خاک میں ملا دیں گے؟"

"اچھا میں والدہ سے مشورہ کر کے بتلاؤں گا۔"

"خوب، شادی ہو آپ کی اور مشورہ دیں والدہ۔"

"مگر میں اُن کے مشورہ کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔"

"اچھا، خدا حافظ۔" کہہ کر وہ کھڑی ہو گئی۔ علی گڑھ کا اسٹیشن آگیا۔ ٹرین رک گئی وہ اور اختری دونوں اُتر کر چلی گئیں۔ میں نے گھر پہونچکر والدہ سے ان واقعات کا قطعی ذکر نہیں کیا۔ دراصل میں نے عذرا سے جو کچھ کہا تھا وہ سب دفع الوقتی کے لئے تھا۔ اس واقعہ کے چھ مہینے بعد میں پھر آگرہ گیا۔ عذرا کو کسی طرح خبر ہو گئی۔ اُس نے بہت منتوں سے کہلا کر بھیجا کہ "مجھ سے ملے بغیر واپس نہ جانا۔" ملاقات کا دن اور وقت

مقرر ہوا۔ مجھے اختری کا رشتہ کا بھائی بتایا گیا۔ عذرا کے والد اُن دنوں کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ میری بے انتہا خاطر مدارات کی گئی۔ عذرا بظاہر پردے میں ہی اختری سامنے آئی۔ اُس نے عذرا کے امتحان میں پاس ہونے کی خوش خبری سُنائی۔ عذرا نے پھر وہی رونا، رونا شروع کیا۔ عاجزانہ منتیں، بیکسانہ التجائیں۔ آہیں، آنسو، کون سی چیز تھی جو اُس نے پیش نہیں کی۔ میں سخت اُلجھن میں مبتلا تھا۔ آخر ٹالنے کی ایک صورت میری سمجھ میں آگئی۔ میں نے کہا "اچھا تم انٹرنس پاس کر لو۔ میں شادی کے لئے تیار ہوں"۔

تقریباً ایک سال گذر گیا۔ اس درمیان میں کئی مرتبہ آگرہ جانا ہوا۔ مگر عذرا سے صرف ایک ملاقات ہوئی۔ انٹرنس کے امتحان میں وہ فیل ہو گئی تھی۔ اس خبر سے مجھے خوشی بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ میں نے کہا "شادی کے لئے شرط امتحان پاس کرنے کی تھی۔ وہ تم نے پوری نہیں کی۔ اب مجھے الزام نہ دینا"۔ اس پر وہ بہت بگڑی۔ کہنے لگی "اچھا ایک سال اور مصیبت جھیلوں گی"۔

خدا جانے کیوں، میرے والدین اب میرے آگرہ جانے کو شک کی نظر سے دیکھنے لگے تھے۔ اس لئے وہ پہلی سی سہولتیں نہیں رہی تھیں۔ بہر حال جب موقع ملتا میں آگرہ ضرور جاتا۔ اس میں شک نہیں کہ نجمہ سے مجھے محبت تھی لیکن جب عذرا سے ملاقات ہوتی، تھوڑی دیر کے لئے میں نجمہ کو بھول جاتا۔ کچھ دن اور گذر گئے۔ والد نے ایک کام سے دہلی بھیجا۔ میں دہلی ہوتا ہوا آگرہ پہونچا۔ یہاں عذرا کے چچا کے انتقال کی خبر سنی، میں تعزیت کے لئے عذرا کے یہاں گیا۔ بہت دیر تک عذرا سے باتیں ہوئیں۔ میں نے کہا عذرا میری والدہ کسی طرح اس شادی پر راضی نہیں ہوتیں بتاؤ اب میں کیا کروں"۔

"آپ کچھ نہ کریں، صرف میرے ساتھ شادی کر لیں"۔

"اور اگر والدین نے مجھے گھر سے نکال دیا تو؟"

"تو میرا گھر موجود ہے"

"نہیں عذرا، باپ کا گھر تمہارا گھر نہیں ہو سکتا"

"شاید نہ ہو سکتا ہو۔ مگر آپ پہلے اپنا اطمینان کر لیجئے۔ ہمارا اپنا جو کچھ ہے اس کا حال تو شاید آپ کو معلوم ہی ہوگا۔ پھر چچا ابا نے بھی کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ چچی پہلے ہی مر چکی ہیں۔ اُن کے تمام ترکہ کی وارث میں اکیلی ہوں۔ جہاں تک میں نے سُنا ہے نقد و جنس سب ملا کر پچاس ہزار سے کم کی مالیت نہ ہوگی۔ میں اس کے لئے بالکل تیار ہوں کہ پہلے آپ اپنے نام جائداد لکھوا لیں۔ بعد میں شادی کریں۔ آمدنی اتنی ہے کہ اگر آپ کچھ نہ کریں تو بھی ہم عیش سے زندگی گذار سکتے ہیں"

یہ سب تفصیلات سُن کر ایک لمحہ کے لئے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ مگر جلد ہی یہ سب کچھ مجھے خوبصورت لفظوں کا ایک گھروندا معلوم ہوا اور بس۔ گھر آکر رفیق سے جو کچھ سُنا اُس سے عذرا کے حرف حرف کی تصدیق ہو گئی۔ انسان کے نفس کی کمزوریوں کا شمار شاید کوئی نہیں جانتا۔ نہ اُن کی نوعیت کا سمجھنا ممکن ہے۔ کیا قیامت ہے کہ انسان کبھی خود اپنے آپ کو بھی دھوکا دینے لگتا ہے۔ میں برابر اس امر کا مدعی تھا کہ مجھے تجمہ سے محبت ہے لیکن اس کے باوجود خیال اب بار بار ایک تصویر سامنے لاتا تھا جس میں عذرا دلہن بنی عابد کے شبستانِ راحت کی زینت نظر آتی تھی۔ مراد آباد پہونچ کر میں نے والدہ کو سب حال سُنایا اور عذرا سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی ——— اللہ اکبر! معلوم ہوتا تھا کہ کوئی تباہ کُن طوفان اُمنڈ آیا۔ یا بارود کے ڈھیر میں چنگاری جا پڑی۔ یا کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹ گیا۔ یا وہ آخری زلزلہ آگیا "جب زمین اپنے بوجھ باہر نکال پھینکے گی"! کتنا چیخیں، کتنا چلائیں، کتنا گرجیں کتنا برسیں۔ میں سخت پشیمان کہ میں نے کیوں ان سے اس بات کا تذکرہ کیا۔

عذرا میں اگر جواہرات بھی جڑے تھے تو اُن کے لئے وہ بیکار تھی، کیونکہ وہ شیعہ تھی پھر نہ اپنا کنبہ نہ خاندان، نہ ذات، نہ برادری۔ سرے سے سرے تک بیگانگی ہی بیگانگی۔ سب پر طرّہ پردیس جس لڑکی میں یہ سب خرابیاں ہوں وہ ہرگز اُن کی بہو نہیں ہو سکتی۔ اُن کا یہ فیصلہ قطعی اور اُن کا حکم آخری تھا جس میں نظرِ ثانی کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ میری جان عجب کشمکش میں مبتلا تھی۔ اُدھر عذرا کا یہ حال کہ اگر مجھ سے شادی نہ ہوئی تو مر ہی جائے گی۔ ادھر تحمینہ کی محبت رہ رہ کر دامنِ دل کھینچتی تھی۔

بہت دنوں کے بعد میں پھر آگرہ گیا۔ عذرا اس مرتبہ پھر امتحان میں فیل ہوگئی تھی میں نے اس کی ناکامیابی کا تذکرہ کیا تو رونے لگی اور اس طرح تڑپ تڑپ کر روئی کہ مجھ سے اُس کی وہ تباہ حالت کسی طرح دیکھی نہ گئی۔ کلیجہ مُنہ کو آنے لگا۔ باتیں تو گھنٹوں ہوئیں مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا میں بلیا ہوں تو دل حد درجہ افسردہ و غمگین تھا۔ عذرا سے میں ایک قسم کی لڑائی سی کر کے آیا تھا۔ مگر انسان بھی عجیب ہیولا ہے۔ ذرا سی دیر بھی کسی ایک صورت پر قایم نہیں رہتا۔ اُدھر عذرا کو صاف جواب دے دیا۔ اِدھر ہر لمحہ یہ ارادہ پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ چاہے کچھ ہو عذرا ہی کو اپنی رفیقۂ حیات بناؤں گا۔ آج شام ہی سے کھانا کھا کر لیٹ رہا۔ اور آدھی رات تک دماغ انہیں خیالات کا آماجگاہ بنا رہا۔ صبح کو تحمینہ آئی۔ اتفاق سے ہمیں تنہائی مل گئی۔ وہ سخت پریشان معلوم ہوتی تھی۔ خلافِ معمول اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر پہلے دبایا۔ پھر چوم لیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ بجلی کی ایک رَو سر سے پاؤں تک میرے جسم میں دوڑ گئی۔ میں نے انتشار کا سبب پوچھا۔ اُس نے کہا "رات میں نے ایک بہت ہی پریشان خواب دیکھا ہے۔ کیا دیکھتی ہوں کہ ایک جنگل ہے سنسان، ویران، شام ہو رہی ہے، تم میرے زانو پر سر رکھے سو رہے ہو کہ برابر کی جھاڑی سے ایک خونخوار بھیڑیا نکلا۔ اُس نے ہم پر حملہ کیا اور تمہیں اُٹھا کر لے چلا۔ تمہیں چھڑانے کی کوشش میں میں بُری طرح زخمی ہوگئی۔ مگر ناکام رہی۔ دہشت اور تکلیف کے مارے

میری چیخ نکل گئی۔ اسی سے آنکھ کھل گئی۔ جاگی ہوں تو دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، حواس بجا نہ تھے۔ ابھی خوب رات تھی۔ پھر صبح تک نیند نہ آئی۔ جب سے اب تک دل کو سخت وحشت ہو رہی ہے" میں نے کہا "واہ، یہ تو بہت اچھا خواب ہے۔ اس کی تعبیر مجھ سے سنو۔ میری موت کے معنی ہیں طولِ حیات اور تم سے جدائی کا مطلب ہے ابدی یک جائی۔ کیونکہ عورت کا خواب اُلٹا ہوتا ہے" میری اِن باتوں سے نجمہ شگفتہ ہو گئی مسرت کی چمک اُس کی آنکھوں میں نمایاں تھی۔ تبسم انبساطِ قلب کا آئینہ دار تھا۔ پھر ہم ایک دوسرے کے ساتھ محبت کی چہلوں اور چوچلوں میں مصروف ہو گئے۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے مگر واقعہ یہ ہے کہ نجمہ کی صورت دیکھ کر رات کی ساری باتیں، سارے ارادے ایک خواب بن گئے تھے۔ وہی مثل تھی کہ رات گئی بات گئی۔ عذرا کی تصویر دھندلی ہو گئی تھی اور میرے دل کے جو گوشے اُس نے نجمہ سے چھین لئے تھے پھر ایک بار نجمہ کے قبضہ میں آ گئے تھے۔ آج پھر نجمہ میری ہونے والی شریک زندگی تھی۔

اس واقعہ کے پانچ مہینے بعد یعنی ۱۹۳۵ء کے آخر میں مَیں پھر آگرہ گیا۔ نجمہ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ اپنی بہن کے یہاں بجے پور مہمان گئی ہوئی تھی۔ آگرہ میں میرا دل نہ لگا۔ دو دن رہ کر واپس چلا آیا۔ جس روز میں واپس آ رہا تھا رفیق نے برسبیل تذکرہ ایک واقعہ سنایا جس کے تصور سے اس وقت بھی میرا کلیجہ کانپ رہا ہے۔ اُنہوں نے کہا "کئی مہینے ہوئے عذرا کے والد یکایک سخت بیمار پڑ گئے۔ علالت نے کچھ ایسا طول کھینچا کہ انہیں اپنی زندگی سے مایوسی ہو گئی۔ وہ چاہتے تھے کہ جس طرح ہو ان کی کھلی آنکھوں عذرا کی شادی ہو جائے۔ عذرا کو بے یار و مددگار چھوڑ جانے کا خیال اُنہیں در بھی ہلاک کئے ڈالتا تھا۔ اتفاق سے ایک مناسب موقع بھی جلد ہی ہاتھ آ گیا۔ عذرا لبِ گور باپ کی آخری تمنا کو پورا کرنے کے لئے شادی پر آمادہ ہو گئی۔ اسی روز وہ مجھ سے ملی تھی۔ ایسی حالت تھی جیسے کوئی مہینوں کا بیمار۔ چند روز کے بعد علی گڑھ کے ایک

صاحب مسٹر جعفر بی، اے سے اُس کا عقد ہو گیا۔ اُس وقت وہ خاصی بیمار تھی۔ بیماری ہی کی حالت میں رخصت کی گئی۔ علی گڑھ جا کر اس کی طبیعت اور بھی زیادہ خراب ہو گئی جب وہاں علاج سے کچھ فائدہ نہ ہوا تو یہاں آ کر ہسپتال میں داخل ہو گئی، اُس کے آگرہ آنے کے کوئی بیس روز بعد اُس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اور وہ اُسی بیماری کی حالت میں گھر آ گئی۔ اِدھر خود اپنی طویل علالت، اُدھر باپ کی موت کا صدمہ۔ بہت نڈھال ہو گئی تھی۔ ایک دن ہمارے یہاں آئی۔ میں تو اُسے دیکھ کر ڈر گئی۔ بلکہ میں نے تو اُسی وقت سمجھ لیا تھا کہ اب یہ بھی کوئی دن کی مہمان ہے۔ اُس وقت نجمہ بھی یہیں تھی اور بھی کئی لڑکیاں میرے پاس بیٹھی تھیں۔ اُس نے آتے ہی بلا کسی تمہید کے مجھ سے تمہارا پتا دریافت کیا۔ میں نے کہا کیا کرو گی؟ کہا خط لکھوں گی، اس پر نجمہ اُسے بنانے لگی۔ شمیمہ نے کہا "شریفوں میں تو یہ دستور نہیں ہے کہ ایک سے سائی ایک سے بدھائی۔ تمہاری تو شادی ہو چکی ہے" اس پر اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ میں نے شمیمہ کو ڈانٹا۔ اب وہ میرے گلے میں باہیں ڈال کر اور بھی زار و قطار رونے لگی اور کہا "رفیق، میرا کہا سنا معاف کر دینا۔ یہ آخری ملاقات ہے" اُس کے ان لفظوں سے میرا دل دکھ گیا۔ مگر میں نے اُسے تسلی دینے کے لئے کہا کہ "دیوانی ایسی فالیں کیوں نکالتی ہے۔ چند روز میں اچھی ہو جائے گی" اُس نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور خدا حافظ کہہ کے رخصت ہوئی۔ اُسی روز ایک نوکر کو ساتھ لے رات کی گاڑی سے علی گڑھ روانہ ہو گئی۔ آدھی رات کو گھر پہونچی۔ اتفاق سے مسٹر جعفر اُس شب کو کہیں شادی میں گئے ہوئے تھے۔ صبح کو آئے تو نوکروں سے بیوی کی آمد کا حال سُنا، حیران رہ گئے، کمرے میں جا کر دیکھا تو عذرا سو رہی تھی۔ اُنہوں نے نام لے کر پکارا، مگر عذرا میں جواب دینے کی قوت ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکی تھی۔ اُس کی نیند ایسی نہ تھی کہ وہ جگانے سے جاگ اُٹھے۔

شوہر کے انتقال اور جوان بیٹی کی موت کے صدمے نے عذرا کی ماں کو دیوانہ کر دیا۔ یہاں تک حالت خراب ہوئی کہ اب شہر کے گلی کوچوں میں ماری ماری پھرتی ہے۔"

رفیق سے یہ واقعات سن کر میری جو حالت ہوئی نہیں اُسے بیان کر سکتا ہوں نہ شاید کوئی سمجھ سکتا ہے۔ بہر حال میں ایک مدہوشی کے عالم میں اسٹیشن آیا۔ تانگہ سے اُتر رہا تھا کہ مسافر خانہ کے باہر ایک عجیب عبرتناک اور رقت آور منظر دیکھا۔ ایک ادھیڑ عمر کی پاگل عورت، گندے چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی، جھاڑ جھنکاڑ کی طرح اُلجھے ہوئے بال۔ چہرے پر وحشت کے آثار "میری بیٹی، میری بیٹی" چلاتی ہوئی ایک طرف کو بھاگی جا رہی تھی۔ لڑکوں کا غول اُس کے پیچھے تھا۔ میں نے اُسے پہلی نظر میں پہچان لیا۔ یہ بد نصیب عذرا کی ماں تھی۔ میرا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ بے اختیار اُس کی طرف دوڑا۔ سامنا ہوا تو وہ مجھے دیکھ کر کچھ ٹھٹکی۔ نیچے سے اوپر تک مجھے دیکھا۔ میں ابھی کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ وہ ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگی۔ میں دم بخود تھا۔ پھر وہ چپ ہو گئی۔ پھر آپ ہی آپ کچھ باتیں کرنے لگی۔ پھر ایک زور کا قہقہہ لگایا اور ایک طرف کو دوڑی چلی گئی۔ لڑکوں کا غول اُس کے پیچھے تھا۔ اس بدنصیب عورت کو اس حال میں دیکھ کر میرا جی بھر آیا۔ بہت ضبط کیا، آنسو نہ رُکے۔ جی چاہتا تھا کہ چیخیں مار مار کے روؤں، اُس وقت پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ اس بھرے گھر کی تباہی کا باعث میں ہوں۔ عذرا کو میں نے قبر کی آغوش میں سُلایا۔ اُس کی ماں کو میں نے سودائی بنایا۔ میں ریل میں سوار ہوا۔ ایک عجیب خود فراموشی کا عالم تھا۔ کچھ خبر نہ تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور میں کہاں جا رہا ہوں۔ جی بار بار اُمنڈتا تھا۔ رات کا بیشتر حصہ رونے میں کٹا۔ گھر پہونچ کر بھی سکون نصیب نہ ہوا۔ طبیعت سخت وحشت زدہ رہی۔ کئی مہینے اسی رنج و غم میں کٹے۔ سب سے عجیب بات یہ کہ تجمہ کی یاد اب بالکل فراموش ہو چکی تھی۔ اب مجھے عذرا سے محبت تھی۔ آپ میری حماقت پر ہنسیں گے۔ یقیناً آپ کو ہنسنا چاہئے۔ عذرا مجھے

دل سے چاہتی تھی۔ مجھ پر جان قربان کرتی تھی۔ مگر میں نے جیتے جی کبھی اُس کی طرف توجہ نہیں کی۔ کبھی ایک لفظ پیار کا نہیں کہا۔ مایوسیوں نے زندگی کی ساری مسرتیں اُس سے چھین لیں۔ بدبخت عابدہ کو نہ پا سکنے کا غم اُس سے نہ اُٹھ سکا۔ آخر موت کے دامن میں اُس نے پناہ لی۔ زمین اُسے نگل گئی۔ خاک میں مل کر خاک ہو گئی اور میں ہمیشہ کے لئے اُس کی نامرادی اور اپنی بدبختی پر آنسو بہانے کے لئے زندہ رہ گیا۔

میں آپ سے بیان کر چکا ہوں عذرا بہت خوبصورت تھی۔ نجمہ سے کہیں زیادہ، پھر بھی وہ میرے دل کو رام نہ کر سکی۔ مگر جب یاس و محرومی نے اُسے موت کی گود میں ابدی نیند سُلا دیا تو میری آنکھیں کُھلیں۔ وہ جذبات جو اُس بدنصیب کی زندگی میں خوابیدہ تھے اب انگڑائیاں لے کر جاگ اُٹھے۔ جو کچھ مجھے یاد تھا سب بھول گیا اور جو کچھ بھولا ہوا تھا یاد آ گیا اب میں نے محسوس کیا کہ واقعی مرنے والی کو مجھ سے محبت تھی ایسی شدید محبت جو عام طور پر نہیں ہوتی۔ جو کام اُس کے حسن و جمال سے نہ ہو سکا تھا اس کی محبت نے کیا۔ اس کی حشر ساماں جوانی مجھ پر فتح نہ پا سکی جسن کو شکست ہو گئی لیکن اُس کی موت کے بعد جب مجھے اس کی محبت کا احساس ہوا تو میرے دل کی دنیا ہی بدل گئی میں اُس کے لئے دیوانہ ہو گیا۔ اسی خیال کو کسی نے ایک شعر میں بیان کیا ہے۔ جو اکثر میرے وردِ زباں رہتا ہے اور مرنے والی کی یاد کو تازہ رکھتا ہے۔ آپ بھی سُن لیجئے اور دو آنسو بہا کر میرے ختم نہ ہونے والے غم میں شریک ہو جائیے:۔

برقِ جمال نے تو نہ کھوئے تھے میرے ہوش
ہاں، تم نے مجھ کو چاہ کے دیوانہ کر دیا

نجمہ اب بھی مجھ سے پہلے کی طرح محبت کرتی ہے اور اس امید موہوم پر مسرور رہے کہ میں اس سے شادی کر لوں گا۔ مگر میرا دل سرد ہو چکا ہے۔ عذرا کے ساتھ مر چکا ہے۔

تاہم محض اس کی خوشی کے لئے میں اُس سے شادی کرنے پر تیار ہوں لیکن میرے والدین کسی طرح راضی نہیں ہوتے۔ سبب وہی کہ پردیس ہے۔ عذرا کا خون میری گردن پر ہے۔ اب نجمہ کی زندگی برباد کرنے کا ذمہ دار بھی یقیناً میں ہی ہوں گا۔ للہ، اب آپ ہی بتائیے کہ میں کیا کروں :۔ والسلام

آپ کا عابد پریمی

ہاں ایک چھوٹا سا واقعہ اور سن لیجئے۔ اختری کے متعلق میں بیان کر چکا ہوں کہ وہ میری عذرا کی رازدار سہیلی تھی۔ وہ اکثر عذرا کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ جہاں تک میرا خیال ہے اُس کی تعلیم کے مصارف اور دیگر اخراجات کے کفیل بھی عذرا کے والد ہی تھے اس کے متعلق مجھے اس سے زیادہ اور کچھ معلوم نہیں۔ ابھی چند روز ہوئے میرے ایک دوست بمبئی سے تشریف لائے۔ بمبئی کی نامور فلم ایکٹرسوں کا ایک البم انہوں نے تیار کیا ہے۔ مجھے بھی دکھایا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ اختری کی تصویر بھی اس میں موجود ہے۔ اب اس نے اپنا نام کنول کماری رکھ لیا ہے اختری کی تصویر دیکھ کر پرانے زخم ہرے ہو گئے۔ عذرا کی مغموم صورت اور اشک آلود آنکھیں سامنے آ گئیں اور بے اختیار میرے آنسو گرنے لگے۔ میرے دوست نے پوچھا "کیا تمہیں کنول کماری سے غائبانہ محبت ہو گئی ہے؟"

میں نے کہا "ہاں"۔ میں یہ ساری داستان انہیں کہاں تک سناتا۔ فقط

سچّی کہانی

(مسٹر براؤن)

انگریزی کی ایک مثل ہے کہ "واقعات افسانوں سے کہیں زیادہ عجیب ہوتے ہیں"۔ مجھے خود اپنی زندگی میں بارہا ایسے واقعات پیش آئے جو افسانوں میں بھی مشکل سے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر صرف ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔

میں نے اپنے تجربہ کار دوستوں کے مشورہ کے مطابق لندن پہنچ کر کسی ہندوستانی سے میل جول نہیں بڑھایا۔ مگر مسٹر فریدی اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔ اور در اصل ان سے تعلقات کا پیدا ہونا اور بڑھنا خود انہیں کی خواہش اور کوشش کا نتیجہ تھا۔ وہ ہمارے کالج یونین کے سکریٹری بھی تھے۔ اُن کی تحریک پر ایک روز میں نے اپنی سیاحتِ ایران کے متعلق یونین میں لکچر دیا۔ تقریر بہت کامیاب رہی۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد جب میں ہال سے نکلنے لگا تو پروفیسر مارکین نے دو ماں بیٹیوں سے میرا تعارف کرایا جو لکچر سننے کے لئے شہر سے آئی تھیں۔ لڑکی کو میں نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ وہ ہمارے

ہی کالج میں پڑھتی تھی، اس کا نام آیوا تھا۔ آیوا کی عمر اس وقت سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ لندن کے دو سالہ قیام اور سفر یورپ کے دوران میں جمال و رعنائی کی ایسی مکمل تصویریں میں نے دو چار سے زیادہ نہیں دیکھیں۔ جہاں آیوا موجود ہو وہاں کوئی شخص یہ سوچنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ انگریز عورتیں معیاری حسن سے عاری ہوتی ہیں۔ میں نے اکثر اسے لائبریری میں لغت کی مدد سے فارسی کی کتابیں پڑھتے دیکھا تھا۔ مجھے تعجب ہوتا تھا کہ وہ فارسی پر اتنی محنت کیوں کرتی ہے۔ مگر کوئی معقول وجہ میری سمجھ میں نہ آتی تھی۔

مسز براؤن یعنی آیوا کی والدہ گو دیکھنے میں خاصی سن رسیدہ معلوم ہوتی تھیں، مگر اُن کی عمر کل ۴۳ سال تھی۔ پروفیسر مارسین نے بیان کیا کہ ان کے شوہر کا جوانی ہی میں انتقال ہو گیا تھا اور اسی غم نے انہیں وقت سے بہت پہلے بوڑھا کر دیا تھا مسز براؤن نے تعارف کے بعد میری تقریر کی بہت تعریف کی اور اگلے اتوار کو اپنے یہاں چار کی دعوت دی۔ میں بعض وجوہ سے اس دعوت کے قبول کرنے میں پس و پیش کر رہا تھا۔ مگر فریدی نے خواہ مخواہ دخل در معقولات کرتے ہوئے مذاق کے طور پر کہا کہ "اگر آپ لوگ مجھے اجازت دیں تو میں انہیں زبردستی کھینچ کر لے آؤں۔ در اصل یہ لندن میں میرے بغیر کہیں نہیں جاتے"۔ میں نے کہا "مان نہ مان میں تیرا مہمان" اسی کو کہتے ہیں۔ بہر حال اگلے اتوار کو ہمارا مسز براؤن کے یہاں چار پر جانا طے پا گیا۔

←——— :××: ———→

فریدی کئی برس انگلینڈ میں رہ چکے تھے۔ پھر بھی پابندی وقت کے معاملہ میں پکے ہندوستانی تھے۔ بارہا تجربہ ہو چکا تھا کہ خواہ کہیں جانا ہو وہ کبھی ٹھیک وقت پر نہیں پہونچ سکتے تھے۔ عید کی نماز کے لئے وو کنگ تشریف لے گئے تو ایسے وقت پہنچے کہ نماز ہو چکی تھی۔ خیر خطبہ میں شریک ہو لئے۔ ایک روز تھیٹر جانا تھا سیٹیں ریزرو

کرالی تھیں۔ میں تھیٹر کے دروازہ پر انتظار کرتے کرتے اُکتا گیا۔ اور جب تماشا شروع ہو گیا تو اندر جا بیٹھا۔ پورے آدھے گھنٹے کے بعد آپ ہنستے ہوئے تشریف لائے اور یہ کہہ کر بیٹھ گئے کہ "یار کیا بتاؤں دیر ہو گئی"۔ مگر جس دن مسٹر براؤن کے یہاں دعوت تھی۔ دوپہر ہی سے میرے یہاں آموجود ہوئے اور جلد تیار ہو جانے کے لئے تقاضے شروع کر دیئے۔ مجھے حیرت تھی کہ فریدی اور اس قدر عجلت۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وقت سے ۱۰ منٹ پہلے ہی ہم مسٹر براؤن کے یہاں پہونچ گئے۔ دونوں ماں بیٹیوں نے ہماری بہت خاطر تواضع کی اور نہایت پُر تکلف چار پلوائی۔ جس کمرہ میں ہم بیٹھے تھے اُس کا ایک دروازہ باغیچہ میں کھلتا تھا۔ چائے پی کر فریدی، آیوا کے لگائے ہوئے پودوں اور پھولوں کی سیر کرنے آیوا کے ساتھ باغیچہ میں چلے گئے۔ فریدی کو میں نے بارہا یہ کہتے سُنا تھا کہ "انگریزی پھول کسی کام کے نہیں ہوتے جس پھول میں خوشبو نہیں وہ بھی کوئی پھول ہے۔ اصلی اور نقلی میں پھر فرق ہی کیا۔ ایسے تو کاغذ کے بھی بن سکتے ہیں"۔ مگر اس وقت فریدی کے نزدیک دنیا کی سب سے زیادہ قابلِ تعریف اگر کوئی چیز تھی تو وہ صرف انگریزی پھول تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص پھولوں کا اور خصوصاً انگریزی پھولوں کا عاشق ہے۔ ایک ایک پھول کی نزاکت، خوش رنگی، خوبصورتی اور "لطیف مہک" نیز آیوا کی خوش ذوقی کی قصیدہ خوانی میں ساری لیاقت ختم کی جا رہی تھی، میں یہ سب کچھ سُن رہا تھا اور جی میں کہتا تھا کہ واقعی کسی کا اعتماد حاصل کرنے اور کسی کو موہ لینے کے لئے اپنے ذاتی خیالات نظریوں اور رایوں کی قربانی سب سے پہلی شرط ہے۔ مگر اس کے لئے بڑا جگر چاہیئے۔ ایک ہم ہیں کہ اگر سارڈین کی بو ناپسند ہے، تو آپ کوئی کچھ کہے اور کیسا ہی سارڈین کا دلدادہ ہو جب اظہار رائے کا موقع ملے گا تو ہم یہی کہیں گے کہ سارڈین بُری اور بہت بُری۔

مسٹر براؤن مجھ سے ایران کے حالات بڑے شوق سے پوچھتی اور بہت دلچسپی

سے سنتی رہیں۔ کہنے لگیں "آپ وہاں کسی یورپین سے بھی ملے" میں نے کہا "ہاں طہران میں روسی اور فرانسیسی سفارت خانوں کے کئی آدمیوں سے ملاقات ہوئی۔ اس کے علاوہ امریکن کالج کے ایک پروفیسر موسیو فیرلین سے تو خاصے مراسم ہو گئے تھے بلا کا لسّان اور خوش گفتار آدمی تھا۔

"آپ دونوں ماں بیٹیوں کو ایران سے بہت دلچسپی ہے اور آیوا تو فارسی سیکھ بھی رہی ہیں۔ کیا اس کا کوئی خاص سبب ہے؟" میں نے ذرا تعجب کے لہجہ میں پوچھا۔ میرے اس سوال پر مسنر براؤن نے ایک دل دوز آہ کی اور "کیا بتاؤں مسٹر پریم" کہہ کر خاموش ہو گئیں۔ چہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے سینہ میں رنج والم کا ایک طوفان اُمنڈ آیا ہے۔ یہاں تک کہ آنسوؤں کے دو بڑے قطرے اُن کی آنکھوں سے ڈھلک پڑے۔ میں چاہتا تھا کہ مسنر براؤن سے اس گریۂ بے اختیار کا سبب پوچھوں مگر یہ پہلی ملاقات تھی۔ پہلے ہی سوال کا جواب کیا ملا تھا جو اس کا ملتا۔ اس لئے میں سوچنے لگا کہ کس طرح موضوعِ گفتگو کو بدلا جائے۔ اتنے میں مسنر براؤن نے مجھ ہی سے کہا:۔

"مسٹر پریم، کیا آپ ہم پر ایک عنایت کریں گے؟"

"فرمائیے"

اتنے میں آیوا اور فریدی بھی کمرہ میں آ گئے۔ فریدی میرے پاس اور آیوا اپنی ماں کے برابر صوفے پر بیٹھ گئی۔

"پروفیسر مارسین نے مجھ سے بیان کیا کہ فارسی آپ کا خاص مضمون ہے اور فارسی بولنے کا آپ کو خاص ملکہ ہے" مسنر براؤن نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "آیوا کو زمانۂ حال کی گفتاری فارسی سیکھنے کا بڑا شوق ہے۔ مگر یہاں کوئی ڈھنگ کا سکھانے والا نہیں ملتا۔ کالج جاتے بھی اسے ایک سال سے زیادہ ہو گیا۔ فارسی کچھ لکھ تو لیتی ہے مگر بول نہیں سکتی۔ اگر آپ مہربانی فرما کر اسے ہفتہ میں گھنٹہ دو گھنٹے

وقت دے دیا کریں تو یقیناً کچھ نہ کچھ سیکھ جائے گی"

مسنر براؤن جس وقت یہ باتیں کہہ رہی تھیں، فریدی کی خوشی کا عالم دیدنی تھا۔ فرط مسرت سے چہرہ تمتما رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہفت اقلیم کے خزانے اس شخص کے تصرف میں آ گئے یا کم از کم دہلی کا تخت مل گیا۔ اُن کا بس نہ تھا ورنہ وہ میری طرف سے فوراً کہہ دیتے کہ "بسر و چشم" مگر میری اور اُن کی مصلحتوں میں فرق تھا۔ اس لئے میں نے ایک دو منٹ خاموش رہنے کے بعد جواب دیا کہ:۔

"مسنر براؤن! آپ کی خواہش کے پورا کرنے میں یوں تو مجھے کوئی عذر نہیں۔ مگر آپ کو معلوم ہے کہ یہاں سے میرے قیام گاہ کا فاصلہ چودہ پندرہ میل ہے، کم از کم دو ڈھائی گھنٹے تو آمد و رفت میں لگ جائیں گے۔ میں بہت عدیم الفرصت ہوں، پابندی کے ساتھ ہفتہ میں دو مرتبہ کیا ایک مرتبہ بھی یہاں آنا میرے لئے مشکل ہوگا!"

"لیکن آپ کو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آیوا خود آپ کے یہاں چلی جایا کرے گی"، مسنر براؤن نے کہا۔

"جی ہاں جس دن آپ کو فرصت ہو میں حاضر ہو جایا کروں گی"! آیوا نے ماں کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ آیوا کا یہ کہنا تھا کہ معلوم ہوا فریدی کو جنت کی کنجیاں مل گئیں۔ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر بے ساختہ بول اُٹھے "بس تو پھر کیا دقت ہے"! مگر دقت ہنوز باقی تھی، میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ میری اور فریدی کی مصلحتوں میں فرق تھا۔ اس لئے میں پھر سوچ میں پڑ گیا کہ اب انکار کا کونسا پہلو اختیار کروں۔ میری لینڈ لیڈی مسنر باسور تھ عجیب قسم کی عورت تھی۔ نہ معلوم اُسے میرے بزرگوں اور سرپرستوں کی قایم مقامی کا حق کہاں سے حاصل ہو گیا تھا۔ وہ خود کو میرا اتالیق خیال کرتی تھی اور اسے کسی طرح گوارا نہ تھا کہ کم از کم اُس کے مکان پر کوئی نوجوان لڑکی مجھ سے ملنے آئے۔ خواہ اُس ملاقات کی غرض کچھ ہی کیوں نہ ہو اور اگر کبھی ایسا اتفاق ہوتا تو وہ مجھ سے

ناراض ہو جاتی دو دو دن تک بات نہ کرتی۔ کھانے اور آسایش کے دوسرے انتظامات میں خلل پڑ جاتا۔ میں اُسے چھوڑ بھی نہ سکتا تھا۔ جو سہولتیں اور آرام مجھے وہاں میسر تھا۔ دوسری جگہ اس کا تصور بھی محال تھا خصوصاً دو گنی ہفتہ میں۔ اب آیوا اگر میرے یہاں آتی تو مسز باسور تھ سے روز دانتا کلکل ہوتی اور میں اس "خانہ جنگی" کے لئے تیار نہ تھا۔ میں نے ابھی کوئی جواب نہ دیا تھا کہ مسز براؤن پھر بولیں :۔

"ہاں ایک بات تو میں کہنا بھول ہی گئی۔ ہم لوگ دولتمند نہیں ہیں۔ تاہم اس زحمت کا جو مناسب معاوضہ آپ تجویز فرمائیں وہ ہم بخوشی آپ کی نذر کریں گے"

فریدی میرے سکوت سے مضطرب ہو رہے تھے۔ کوئی دو منٹ خاموش رہنے کے بعد میں نے کہنا شروع کیا :۔

"بات یہ ہے مسز براؤن........" میں اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ میری کمر میں کسی کیڑے نے بڑے زور سے کاٹ کھایا اور میں اچھل پڑا۔ دراصل کیڑے نے نہیں کاٹا تھا مسٹر فریدی نے چٹکی لی تھی۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ میں انکار کرنے والا ہوں۔ لہذا قطع کلام کا یہ نرا پہلو نکالا۔ اور فوراً میرے بہت قریب ہو کر آہستہ سے اردو میں کہا "للہ منظور کر لو"

وہ اس وقت سراپا یاس بنے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کسی سنگین جرم کی پاداش میں ابھی ابھی انہیں سزائے موت کا حکم سُنایا جانے والا ہے۔ اور کچھ اسی مسترحمانہ انداز سے اُنہوں نے میری طرف دیکھا کہ میں تو خیر یوں بھی ایک کمزور دل کا آدمی ہوں میری جگہ اگر تیمور لنگ بھی ہوتا تو اُسے ترس آجاتا۔ چار و ناچار مجھے کہنا پڑا کہ "اچھی بات ہے سنیچر کے دن دو بجے آپ میرے یہاں آسکتی ہیں" یہ جملہ میں نے آیوا سے مخاطب ہو کر کہا تھا جس نے میرا شکریہ ادا کیا اور میرے قیام گاہ کا پتا اپنی نوٹ بک میں لکھ لیا۔ وقت کافی ہو چکا تھا۔ لہذا اب ہم لوگ دونوں ماں بیٹیوں کی

مہماں نوازی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پھر کسی دن ملنے کا وعدہ کر کے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

آیوا کے ساتھ ساتھ فریدی نے بھی مجھ سے فارسی پڑھنا شروع کر دی۔ ہر وقت آمدنامہ جیب میں رکھے پھرتے تھے۔ مگر اُن کی فارسی "بلے" "نہ خیر" اور "خیلے خوب" سے آگے نہ بڑھی۔ دراصل وہ اپنا زیادہ وقت اور توجہ فارسی کے بجائے آیوا کے پڑھنے میں صرف کرتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ تین ہی مہینے میں آیوا کو جیسا وہ سمجھ سکتے تھے کسی سے لئے ممکن نہ تھا۔ آیوا نے جب میرے یہاں آنا شروع کیا تو مسز باسورتھ نے بہت "غرفش" کی۔ مگر جب دیکھ لیا کہ مجھے آیوا سے کوئی "ذاتی" دلچسپی نہیں تو ناشتہ اور کھانے میں دو ہفتے تک جو کمی کی تھی اُس کا بدل کر دیا۔ اس دوران میں فریدی نے کئی مرتبہ دونوں ماں بیٹیوں کو چار اور کھانے پر بلایا اور مسز براؤن نے بھی تین مرتبہ ہم لوگوں کی دعوت کی۔ آیوا اب فریدی سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔ فریدی نے شام کو میرے ساتھ رہنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اور آیوا اب ایک ورق کے دو صفحے ہو کر رہ گئے تھے۔ جب دیکھو ساتھ ساتھ، ان کی اکثر شامیں ایک دوسرے کی صحبت میں گزرتی تھیں۔ مسز براؤن مجھ سے کافی بے تکلف ہو گئی تھیں۔ ایک دن جب کہ میں اُن کے یہاں چائے پی رہا تھا اور فریدی اور آیوا ٹینس کھیلنے کے لئے باہر جا چکے تھے۔ میں نے چار کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا "مسز براؤن! آپ کی زندگی تو سرتاپا ایک راز معلوم ہوتی ہے۔ راز کیا بلکہ معمّا جسے میں کبھی نہ سمجھ سکا اور یقیناً آپ کے بتائے بغیر کبھی نہ سمجھ سکوں گا!"

مسز براؤن کے ہونٹوں پر ایک غم آلود مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ کہنے لگیں:۔

"مسٹر بریم۔ آپ سے کچھ پردہ نہیں، مگر واقعات اس درجہ اندوہناک ہیں کہ سُنیئے گا تو خواہ مخواہ آپ کو بھی رنج ہوگا اور کچھ حاصل نہیں۔ اسی لئے میں نے کبھی اس ذکر کو نہیں چھیڑا!"

"شاید میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں!" میں نے کہا۔

"آپ کی ہمدردی کا شکریہ۔ مگر مسٹر پریم، میرا مرض علاج کی حد سے گذر چکا ہے پھول مرجھا کر کبھی از سرِ نو شگفتہ ہوا ہے؟" یہ کہہ کر مسز براؤن نے ایک دل دوز آہ کی اور آج پھر دو آنسو اُن کے رخساروں پر ڈھلک پڑے۔ مسز براؤن کی سوگوار حالت دیکھ کر ہمیشہ میری طبیعت متاثر ہوتی تھی اور اس وقت تو وہ ایک اندوہِ مجسّم بنی ہوئی تھیں۔

"مسز براؤن" میں نے ہمدردانہ لہجہ میں کہنا شروع کیا "میں فطرتاً غم دوست واقع ہوا ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ انسان کی روح کو بیدار کرنے کے لئے کشاکشِ حیات کے الم انگیز افسانے، عیش و نشاط کی داستانوں سے کہیں زیادہ موثر ہوتے ہیں۔ میں آپ کی دُکھ بھری کہانی ضرور سنوں گا۔ سُنائیے اور تفصیل سے سُنائیے۔"

مسز براؤن نے رومال سے اپنے آنسوؤں کو خشک کیا جو ابھی آنکھوں سے باہر نہیں آئے تھے۔ اس کے بعد گردن کو ایک جھٹکا دے کر، بائیں ہاتھ سے اپنے بالوں کو سنبھالتے ہوئے کہا "وہ کوئی طویل داستان نہیں، سنیئے اور سُن کر میری بدبختی پر آپ بھی دو آنسو بہا لیجئے" یہ واقعہ آغازِ بہار سنہ ۱۹۱۶ء کا ہے۔ مگر اٹھارہ برس گذر نے کے بعد بھی اُس کی یاد اسی طرح تازہ ہے جیسے کل کی بات ہیں اُس وقت جوان تھی زندگی کی چوبیسویں منزل میں قدم رکھا تھا۔ یہ کُملایا ہوا چہرہ ہمیشہ سے ایسا ہی نہ تھا۔" مسز براؤن نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پھر کہنا شروع کیا "میری بربادی کا باعث وہ شخص ہوا جو مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا اُس کا نام پرسی تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے کئی سال بڑا تھا۔ پرسی کی محبت سمندروں کی طرح اتھاہ اور طوفانوں کی طرح پُرشور تھی۔ وہ مجھے کوئی ارضی مخلوق نہیں سمجھتا تھا بلکہ اُس کے نزدیک میں ایک فردوسی حور تھی جو اُس کی زندگی کو یکسر رنگ و بو اور چاندنی بنا دینے کے لئے انسانی ہیکل میں زمین پر بھیج دی گئی تھی۔ وہ مجھے ایک دیوی کی طرح پوجتا تھا۔ مجھے دیکھ کر جیتا اور میرے اشاروں پر

جان قربان کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا۔ پرسی جوان تھا۔ خوبصورت تھا۔ برسر کار تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میرا پرستار تھا، اُس کی ظاہری اور باطنی خوبیوں کے باعث میرے والدین اُسے بیحد پسند کرتے تھے۔ مگر خدا جانے کیا بات تھی کہ مجھے کبھی اُس سے دلی لگاؤ پیدا نہیں ہوا۔ اس کی قدردانیاں اور قربانیاں دیکھ دیکھ کر مجھے ترس بھی آتا تھا مجھے اُس سے بے انتہا ہمدردی تھی اور میں حتیٰ المقدور اس کے جذبات کا احترام بھی کرتی تھی۔ مگر جب مجھے اُس سے اتنی محبت بھی نہ تھی جتنی ایک چرواہے کو اپنے گلّہ کے پاسبان کتے سے ہوتی ہے۔ اُس نے کئی بار مجھ سے شادی کی درخواست کی۔ مگر میں نے ہمیشہ یہی کہہ کر انکار کر دیا کہ "افسوس پرسی مجھے تم سے محبت نہیں اور میں تمہیں دھوکا دینا نہیں چاہتی"۔ پرسی میری صاف گوئی سے کبھی بددل نہیں ہوا۔ اس کی محبت کی سرگرمیوں میں کوئی کمی نہیں آئی، وہ سمجھتا تھا کہ رفتہ رفتہ میرے خیالات بدل جائیں گے اور ایک دن میں اُس کی شریک زندگی بن کر رہوں گی۔ میں خود بھی جانتی تھی کہ پرسی جیسا محبت کرنے والا قدردان شوہر اگر چراغ لے کر ڈھونڈوں گی تو مجھے نہ ملے گا مگر میں اپنے دل کو اُس کے ساتھ محبت کرنا نہیں سکھا سکتی تھی۔

ایک شب کو پرسی مجھے ایک جگہ ڈانس (رقص) میں لے گیا۔ تھوڑی دیر ڈانس کرنے کے بعد جب ہم چاء پینے کے لئے بیٹھے تو میری نظر ایک نوجوان پر جا پڑی جو کچھ دور بیٹھا ہوا بڑے غور سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ پرسی کی اُس طرف پیٹھ تھی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک خاص کشش تھی۔ اُس کی صورت دیکھنا اور دیکھتے رہنا آنکھوں کو اچھا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ہی ہماری نگاہیں ملیں بہ یک وقت ہم دونوں کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی مگر فوراً ہی مجھے خیال آیا کہ میں کیا کر رہی ہوں اور میں نے ایک شانِ استغنا کے ساتھ سر جھکا لیا۔ مگر درحقیقت میری یہ بے نیازی مصنوعی تھی، آنکھوں سے زیادہ دل اور دل سے زیادہ آنکھیں اُس ناآشنا کو دوبارہ دیکھنے کے لئے آرزومند تھیں میں نے

پھر سر اُٹھایا اور وہ نوجوان جادوگر ابھی تک ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہا تھا۔ خیال جو اس طرف مصروف ہوا تو میں کچھ کھوسی گئی اور اس بےخودی میں چاء کی پیالی میرے ہاتھ سے اُلٹ گئی جس نے مجھے چونکا دیا اور وہ طلسم ٹوٹ گیا۔ ابھی میں اور پرسی میز کو درست ہی کر رہے تھے کہ برابر سے آواز آئی :۔

"ہیلو پرسی" ہم دونوں نے چونک کر سر اُٹھایا۔ وہی مقناطیسی آنکھوں والا اجنبی ہمارے برابر کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"ہیلو ایڈی" پرسی نے فوراً جواب دیا اور گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ ملا کر مجھ سے تعارف کرایا اور اپنے برابر بٹھا لیا۔ ایڈی، پرسی کا ہم سن، بچپن کا دوست اور اسکول فیلو تھا۔ ملازمت کے سلسلہ میں مانچسٹر سے تبدیل ہو کر کل ہی لندن آیا تھا حسن اتفاق بلکہ سوئے اتفاق کہنا چاہیے کہ وہ شام کی تنہائی سے گھبرا کر یہاں ناچ گھر چلا آیا تھا۔

ہم کوئی گھنٹہ بھر وہاں اور ٹھہرے اور اس اثنا میں میں نے ایڈی کے ساتھ بھی کئی مرتبہ رقص کیا۔ رقص میں یہ کیفیتِ سرور مجھے کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی، ایک بےخودی سی میرے حواس پر چھائی جاتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ میں ہوا میں اُڑ رہی ہوں۔ ایڈی کا مضبوط ہاتھ میری کمر کے گرد مجھے ایک پھول کی طرح سنبھالے ہوئے تھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکتا تھا۔ اور بار بار جسم میں ایک سنسنی سی پیدا ہوتی تھی، اثنائے رقص میں جب وہ یکایک مجھے بھینچ لیتا تو میرے سارے بدن میں بجلی کی ایک رَو سی دوڑ جاتی۔ قلب میں اس قسم کی سرور انگیز خلش میں نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ پرسی کے ساتھ میں نے سیکڑوں مرتبہ رقص کیا تھا۔ مگر بالکل مشین کی طرح۔ جذبات کو اُس میں ذرا سا بھی دخل نہ ہوتا تھا۔ مگر اُس وقت...... بس کیا بتاؤں کیا کیفیت تھی۔ یہی جی چاہتا تھا کہ زندگی تمام ہو جائے اور یہ رقص کبھی تمام نہ ہو۔

اُس رات کو میں نے کئی مرتبہ آیڈی کو خواب میں دیکھا۔ کبھی اس طرح کہ ہم دونوں ایک ہی جہاز کے مسافر ہیں اور امریکہ جا رہے ہیں، کبھی اس طرح کہ میں پیرس روانہ کر رہی ہوں اور آیڈی بھی میرے ساتھ ہے، پھر وہ یکایک کُہر میں غائب ہوگیا۔ آیڈی سے چند ہی ملاقاتوں کے بعد یہ حالت ہوگئی کہ گویا وہ اور میں برسوں کے دوست ہیں۔ پرسی کو ہمارا یہ بڑھتا ہوا ارتباط ناگوار تھا۔ وہ ہمارا یہ رنگ دیکھ دیکھ کر سہما جاتا تھا کہ کہیں آیڈی مجھے اُس سے چھین نہ لے۔ مگر اُس بیچارے کو یہ معلوم نہ تھا کہ میں تو پہلی ہی ملاقات میں آیڈی کی ہو چکی تھی۔ وہ ہمارے درمیان حائل ہونا چاہتا تھا۔ مگر سیلاب کہیں تنکوں سے رکتا ہے۔ ایک دن صبح کو وہ ہمارے یہاں آیا، میں حسبِ معمول ڈرائنگ روم میں اکیلی بیٹھی وائیولن بجا رہی تھی، اس کے آنے پر میں نے وائیولن ایک طرف رکھ دیا اور کھڑی ہوگئی۔ صاحب سلامت کے بعد ہم دونوں ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ خلافِ معمول آج پرسی کی آنکھیں سُرخ اور سوجی ہوئی تھیں، شاید وہ تمام رات نہیں سویا تھا، یا شاید رویا تھا، کئی منٹ تک ہم دونوں بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ پرسی کھسک کر میرے بالکل قریب آگیا۔ اُس نے اپنی باہیں میرے گلے میں ڈال دیں اور ایک نہایت بیکسانہ انداز سے مجھے دیکھنے لگا۔ اُس کی ساری آرزوئیں سمٹ کر اُس کی آنکھوں میں آگئی تھیں۔ اس کی حالت بالکل مجنونوں کی سی تھی۔ اب بھی وہ خاموش تھا۔ میں بھی خاموش تھی۔ یکایک اُس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ میں نے سر جھکا لیا۔ اب بھی وہ خاموش تھا۔ میں بھی خاموش تھی۔ اُس نے اپنے ہاتھ میری گردن سے نکال کر میرے دونوں ہاتھ تھام لیئے اور میرے شانے پر سر رکھ کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ مگر وہ آگ جو آیڈی سے پہلی ملاقات کے بعد میرے سینہ میں لگی تھی اب دور تک پھیل چکی تھی اور یہ چھینٹے اُسے بجھانے کے لئے بالکل ناکافی تھے۔ میں نے کہا:۔

"پرسی! آخر اس سے فائدہ؟" پرسی نے سر اُٹھایا اور پھر ایک مایوسانہ نگاہ میرے چہرہ پر ڈال کر کہا:-

"کلیرا- کیا مجھے بالکل مایوس ہو جانا چاہیئے؟"

"پرسی، مجھے بہت افسوس ہے- مگر میں بالکل مجبور ہوں" میرے یہ الفاظ سُن کر پرسی سنبھل کر بیٹھ گیا، اُس نے اپنے آنسو پونچھے، بال درست کئے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا:-

"کلیرا- اب میں تمہیں تکلیف نہ دوں گا- اچھا خدا حافظ" یہ کہا اور میرے کسی جواب کا انتظار کئے بغیر کمرہ سے باہر نکل گیا-

اس واقعہ کے تین ماہ بعد ایسٹ بورن[1] کے ایک ہوٹل میں ایک کمرہ کے دروازہ پر لکھا تھا "مسٹر اینڈ مسز براؤن" یہ کلیرا اور ایڈی تھے- جو ہنی مون منانے کے لئے یہاں آئے تھے-

"اچھا تو ایڈی مسٹر براؤن ہی کا نام تھا!" میں نے مسز براؤن کا سگرٹ سلگاتے ہوئے کہا:-

"ہاں"، مسز براؤن نے سگرٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے کہا "دراصل ان کا پورا نام ایڈورڈ براؤن تھا- مگر بے تکلف دوست ایڈی کہا کرتے تھے"

"جس وقت آپ کی شادی ہوئی کیا جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی!" میں نے مسز براؤن سے پوچھا-

"نہیں- اس بلائے آسمانی کے نازل ہونے میں ابھی دو مہینے باقی تھے اور

---

[1] ایسٹ بورن ایک چھوٹا سا ساحلی مقام ہے جو لندن سے کوئی پچاس میل کے فاصلہ پر واقع ہے- گرمی اور بہار کے موسم میں ہزاروں آدمی سیر و تفریح کے لئے یہاں آتے ہیں اور روزانہ ایک میلہ سا لگا رہتا ہے-

سچ پوچھو تو ہماری حقیقی زندگی کی کُل اتنی ہی عمر ہوئی - اُس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ ہماری خوشی اس قدر مختصر ہو گی اور مسرت کی یہ چند گھڑیاں مجھے عمر بھر خون کے آنسو رُلائیں گی - جنگ کے چھڑتے ہی انتشار و اضطراب سارے ملک پر محیط ہو گیا - مگر ہم دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر، آنے والے خطرات سے یکسر بے نیاز ہو کر، شور انگیز محبت کے ریلوں میں آنکھیں بند کئے بہتے چلے جا رہے تھے - ایڈی کے آغوشِ محبت میں میں اپنے آپ کو دنیا کے ہر خطرہ سے محفوظ خیال کرتی تھی - جنگ کی دہشتوں نے شہر کو وحشت کدہ بنا دیا تھا - مگر میں، میرا وایولن، چاندنی رات، سمندر کا کنارا اور ایڈی کا مسکراتا ہوا چہرہ، یہ ہماری چھوٹی سی دنیا ان مسرتوں سے لبریز تھی جو کائنات کی وسعتوں میں نہ سما سکیں، جدھر نظر اٹھتی تھی یہی معلوم ہوتا تھا کہ فطرت کا ذرہ ذرہ ہمیں مسرور دیکھ کر مسکرا رہا ہے - آسمان سے خوشی برس رہی ہے - زمین سے خوشی اُبل رہی ہے - فضا خوشی سے بھر گئی ہے - رنج، غم، اضطراب، دوری، مہجوری، آہیں، آنسو، ان میں سے کسی ایک لفظ کے معنی اُس وقت ہمیں معلوم نہ تھے مگر بیدرد فطرت سے ہماری یہ کامرانی دیکھی نہ گئی - رشک ہوا - رشک کیوں بلکہ حسد کہنا چاہیئے - دیکھتے دیکھتے ہماری عشرتوں کا گہوارہ حسرتوں کا تابوت بن گیا - صبح تک سب کچھ تھا، شام ہوتے کچھ نہ تھا - ایڈی مجھ سے ہمیشہ کے لئے چھن گیا - آہ، کیا کہوں مسٹر پریم، کہی نہیں جاتی اپنی بربادی کی ....!!

مسز براؤن کی آواز گلوگیر ہو گئی اور نا تمام جملہ نا تمام ہی رہ گیا - آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور رخساروں پر ڈھلک ڈھلک کر موتیوں کی طرح اُن کی گود میں گرنے لگے "!

"مسز براؤن، رنج و غم سے مغلوب ہو جانا رنج و غم کا علاج نہیں، دل کو سنبھالیئے!" میں نے تسلی آمیز لہجہ میں کہا - دراصل اس وقت مسز براؤن کی یہ الم انگیز حالت دیکھ کر

میرا دل خود بھر آیا تھا، مگر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اٹھ کر مسنز براؤن کے برابر جا بیٹھا۔ اپنے رومال سے اُن کے آنسو پونچھے۔ دوسرے کمرے سے لا کر لیمن سکواش کا ایک گلاس پلایا اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ باقی واقعات پھر کسی وقت سُن لوں گا موضوع گفتگو کو بدلنے کے لئے میں نے پوچھا "کیا آیوا اور فریدی آج سینما جا رہے ہیں؟"

"غالباً"۔

"پھر ہم لوگ بھی کیوں ساتھ نہ چلیں؟"

"جیسی آپ کی خوشی"۔

"تو پھر اُٹھیے، تیار ہو جائیے" یہ کہہ کر میں کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھیے۔ ابھی جلدی کیا ہے، میں بات تو ختم کر لوں" مسنز براؤن نے سگرٹ کیس میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں پھر مسنز براؤن کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور مسنز براؤن نے کہنا شروع کیا:۔

"داستان کا رنگین حصّہ آپ سن چکے۔ غمناک ٹکڑا باقی ہے۔ مگر آپ سُنتے سُنتے اُکتا تو نہیں گئے؟"

"اُکتا تو نہیں گیا۔ خوب۔ یہ اُکتانے کی بھی آپ نے ایک ہی کہی۔ مسنز براؤن شاید آپ کو یاد ہو، میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں فطرتاً غم دوست واقع ہوا ہوں۔ المناک افسانوں سے کبھی میری سیری نہیں ہوتی۔ آپ کے سے واقعات تو گھنٹوں کیا بلکہ ساری رات اگر کوئی سُنائے جائے تو میں سُنے جاؤں"۔

"اچھا تو سُنیئے" مسنز براؤن نے کہا "پرسی سے آخری ملاقات کو تقریباً پانچ چھ مہینے گذر چکے تھے۔ اس اثنا میں میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا۔ سُنا تھا کہ وہ اُسی روز لندن سے کہیں چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ مجھ سے ملنے غالباً اب وہ کبھی نہ آئے گا۔ ایک روز دفتر سے واپسی کے بعد ایڈی نے مجھ سے پوچھا کہ "پرسی کی بھی کچھ خبر ہے" میں نے

کہا "نہ معلوم بے چارہ کہاں ہے۔ مجھے تو کچھ علم نہیں۔ کیوں، اس وقت تمہیں بیٹھے بیٹھے ہرسی کا خیال کیسے آگیا"۔ کہا "کچھ نہیں، میں نے یونہیں پوچھا"۔ مگر میں نے دیکھا کہ ایڈی کے چہرہ پر کچھ رنج اور غصہ کے آثار نمودار ہوئے۔ اور اس کی آواز میں بھی میں نے ایک تغیر محسوس کیا۔ مگر بات کی تہ کو نہ پہونچ سکی۔ ایڈی اپنی تمام خوبیوں کے باوجود محبت کے معاملات میں بہت زیادہ شکی واقع ہوا تھا اور یہ اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی جس نے مجھے اور اسے دونوں کو برباد کیا۔ آپ نے ایک روز بیان کیا تھا کہ ہندوستانی مسلمان، عورتوں کے معاملہ میں بے انتہا غیرت مند ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس بارے میں ایڈی، ہندوستانی مسلمانوں سے بھی کچھ بڑھ چڑھ کر تھا۔ دوسرے دن وہ خلافِ معمول وقت سے ایک گھنٹہ پہلے ہی دفتر سے واپس آگیا۔ اس کا مزاج بگڑا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا "آج جلد کیسے آگئے؟" کہا "کیا اس سے تمہارا کوئی پروگرام غلط ہوگیا"۔ اس بے تکے جواب سے مجھے سخت کوفت ہوئی۔ اس کے بعد بھی میں نے جو بات کی اوندھا ہی جواب ملا۔ مجھے اس آزردگی بے سبب سے بے انتہا ملال ہوا، اور غصہ بھی آیا۔ یہاں تک کہ رات کو میں اسے اخبار پڑھتا چھوڑ "شب بخیر" کہے بغیر ہی جاکر سو رہی۔ رات میں آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ایڈی پلنگ پر موجود نہیں۔ پہلے تو میں نے سمجھا کہ شاید کسی ضرورت سے نیچے گیا ہوگا، مگر جب بہت دیر ہوگئی اور وہ واپس نہ آیا تو مجھے تشویش ہوئی گھڑی دیکھی، دو بجنے والے تھے، میں نیچے اتر کر پہلے اسی کمرہ میں آئی۔ دیکھا کہ یہ سامنے والا دروازہ کھلا ہوا ہے اور ایڈی باغیچہ میں ٹہل رہا ہے، چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ میں اس کے پاس گئی، دیکھا تو اس کی عجیب حالت تھی۔ بال بکھرے ہوئے آنکھیں بھاری، چہرہ پر وحشت، میں یہ صورت دیکھ کر سہم گئی اور گھبرا کر پوچھا،

"ایڈی خیر تو ہے؟"

اُس نے کچھ جواب نہ دیا، اُسی طرح آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا باغیچہ کے اُس کنارے تک چلا گیا اور وہیں ٹھہر گیا۔ میں نے پاس جا کر اپنے دونوں ہاتھ اُس کے کاندھوں پر رکھ دیئے اور پوچھا "خدا کے لئے بتاؤ تو آخر بات کیا ہے؟"

"کچھ نہیں" اُس نے غصّہ سے جواب دیا۔

"یا اللہ۔ مجھ سے بھی پردہ ہے" میں نے پھر منت سے کہا اور اُس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

"تنگ نہ کرو کلیرا۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو" اُس نے نہایت سرد مہری سے جواب دیا اور میری باہیں اپنی گردن سے علیٰحدہ کر کے پھر ٹہلنا شروع کر دیا۔ اُس وقت کا میرا اضطراب اور صدمہ بس کیا بتاؤں مسٹر پریم۔ میں خود دیوانی ہوئی جا رہی تھی، دنیا میری آنکھوں میں اندھیر تھی۔ دل بیٹھا جاتا تھا میں نے پھر دوڑ کر اُس کے ہاتھ پکڑ لئے اور کہا "تمہیں بتانا پڑے گا"

"بس الگ رہو" اُس نے نہایت حقارت اور نفرت کے لہجہ میں کہا اور جھٹکا دے کر اپنے ہاتھ مجھ سے چھڑا لئے۔ میں یوں ہی بے حال ہو رہی تھی۔ اچانک جھٹکا کھا کر گر پڑی۔ بے ساختہ میرے مُنہ سے نکلا "بیدرد" اور بے اختیار میرے آنسو بہنے لگے۔ مگر ایڈی نے کوئی اعتنا نہ کی اور ٹہلتا ہوا پھر اُس طرف چلا گیا۔ شاید جاں کنی کے وقت انسان کو ایسی ہی تکلیف ہوتی ہوگی جو مجھے ایڈی کے اس بیدردانہ سلوک سے اس وقت ہوئی۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ میں اُٹھی مگر ابھی کھڑی بھی نہ ہونے پائی تھی کہ چکّر آ گیا اور پھر گر پڑی۔ مگر ایڈی، ہائے سنگدل ایڈی نے پروا بھی نہ کی۔ وہ اُسی مجنونانہ حالت میں ٹہلتا رہا۔ آخر تھوڑی دیر کے بعد میرے حواس کچھ بجا ہوئے تو میں سنبھل کر اُٹھی اور اپنے بستر پر پہونچ کر جس قدر رویا گیا خوب روئی۔ یہ حالت تھی جیسے کوئی کلیجہ مسلے ڈالتا ہے۔ دیر تک یوں ہی تڑپتی رہی آخر روتے روتے اور تڑپتے

تڑپتے تھک کر چور ہو گئی اور اسی حالت میں میری آنکھ لگ گئی۔ جاگی تو صبح کے سات بج چکے تھے۔ اُٹھی، نیچے آئی، آیڈی میرے بیدار ہونے سے پہلے ہی ناشتہ کئے بغیر جا چکا تھا۔ آج جمعرات تھی۔ جمعرات کو وہ عموماً صبح ہی چلا جاتا تھا اور دوپہر کو واپس آتا تھا۔ آدھے دن کی چھٹی ہوتی تھی۔ باقی دنوں میں دفتر سے واپسی کا وقت شام کے پانچ بجے تھا۔ البتہ جن دنوں کام زیادہ ہوتا تو اُسے گھر پہونچتے پہونچتے چھ بج جایا کرتے تھے۔ میں پھر آکر پلنگ پر لیٹ گئی۔ نیند تو اب کیا آتی۔ یوں ہی کروٹیں بدلتی رہی آیڈی کے رات کے بیدردانہ سلوک کا خیال آتا تو دل اُلٹنے لگتا۔ کہتی تھی۔ ہائے یہ کیا ہو گیا۔ دو ہی دن میں آیڈی کیسا بدل گیا۔ کیسی آنکھیں پھیر لیں۔ کل تک میری صورت دیکھ کر جیتا تھا۔ آج میرے سایہ سے نفرت کرتا ہے۔ آخر میری خطا، میرا قصور، کس جرم کی پاداشں میں یہ سزا مجھے دی گئی۔ مجھے اسی طرح بستر پر پڑے پڑے دس بج گئے۔ آج میں نے بھی ناشتہ نہیں کیا تھا۔ اور بھوک بھی نہ تھی۔ بہرحال اُٹھی، مُنہ ہاتھ دھویا، کپڑے بدلے، ڈرائنگ روم میں آئی تو ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔ میں اپنا وایولن اُٹھا کر بجانے لگی۔ اتنے میں دروازہ پر کسی نے کھٹکا کیا۔ پہلے تو میں سمجھی کہ آیڈی ہو گا پھر خیال آیا کہ آیڈی کھٹکا کیوں کرتا اُس کے پاس تو خود دروازہ کی کنجی موجود ہے۔ بہرحال دروازہ کھولا تو آنے والے کو دیکھ کر میں کچھ گھبرا سی گئی۔ آپ سمجھے یہ کون تھا؟" مسز براؤن نے مجھ سے پوچھا۔

"نہیں"

"یہ پرسی تھا"

"پرسی!"

"ہاں پرسی۔ اسے دیکھ کر ایک مبہم سا خوف مجھ پر طاری ہو گیا۔ اگرچہ ڈرنے کی بظاہر کوئی وجہ نہ تھی مختصر رسمی گفتگو کے بعد اُس نے کہا:

«کلیرا۔ مجھے لندن آئے آج چار دن ہوئے اور میں صرف تم سے ملنے ہی کے لئے لندن آیا ہوں۔ پرسوں شام کے ۵ بجے میں اس طرف آیا۔ لیکن گلی کے موڑ تک آکر میرا ارادہ بدل گیا اور میں تم سے بغیر ملے واپس چلا گیا۔ سڑک پر میں نے ایڈی کو گھر آتے دیکھا۔ غالباً اس نے بھی مجھے دیکھا ہوگا۔ مگر پہچانا نہیں۔ کل دوپہر کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ جو کچھ ہو میں تم سے ایک بار ضرور ملوں۔ چنانچہ اسی ارادے سے اس طرف آیا۔ اس وقت چار بجے تھے، میں قصداً اس وقت آیا تھا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ ایڈی چھ بجے گھر آتا ہے۔ مگر پرسوں معلوم ہوا کہ پانچ ہی بجے واپس آجاتا ہے۔ میں بالکل تنہائی میں تم سے ملنا چاہتا تھا۔ کوچہ میں داخل ہوا ہی تھا کہ میرے پیچھے ایک دھماکے کی آواز ہوئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک شخص کی سائیکل پھسل گئی تھی اور وہ گر پڑا تھا۔ اسی وقت دور سے مجھے ایڈی بھی سڑک پر آتا دکھائی دیا۔ جیسا میں نے ابھی کہا میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کی موجودگی میں تم سے ملوں، اس لئے میں اُلٹے پیروں واپس ہوا۔ میرا خیال ہے کہ گلی سے نکلتے کل بھی اس نے مجھے دیکھ لیا۔ بہرحال میں واپس چلا گیا۔ صبح پھر خیال آیا کہ آخر جانے سے فائدہ کیا۔ مگر یہ کمبخت دل نہ مانا، اور اس وقت یہ بھی اطمینان تھا کہ تم بالکل اکیلی ہوگی۔ کلیرا سچ کہنا، اس چھ مہینے کی مدت میں کبھی تمہیں بھی میرا خیال آیا؟»

«جس وقت پرسی یہ واقعات بیان کر رہا تھا، میں اپنی ہی اُدھیڑ بن میں لگی ہوئی تھی۔ ایڈی کی مجنونانہ برہمی کا سبب اب میری سمجھ میں آگیا تھا۔ اس نے دو مرتبہ پرسی کو ہماری گلی سے نکلتے دیکھا تھا۔ غالباً اس نے یہ سمجھا کہ پرسی پوشیدہ طور پر مجھ سے ملنے آتا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ روئی میں آگ لگ گئی۔ اس کے نزدیک یہ اتنا بڑا جرم بلکہ گناہ تھا۔ جو کسی طرح معاف نہیں کیا جا سکتا تھا اور جس کی کم سے کم سزا دائمی جدائی تھی۔ افسوس اس کی تنگی اور رنگین طبیعت نے واقعات کو جانچنے کی اجازت نہ دی اور مجھے

صفائی کا موقع دئیے بغیر خود ہی جو سمجھ میں آیا فیصلہ کر لیا۔ میں ان ہی خیالات میں غلطاں پیچاں بیٹھی تھی۔ مجھے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ پرسی نے مجھ سے کیا سوال کیا۔"

"کلیرا۔ تم نے میری بات کا کچھ جواب نہ دیا۔" اُس نے اپنی کرسی میرے قریب کھسکاتے ہوئے کہا۔

"جواب؟ کس بات کا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"خوب" پرسی نے طنز آمیز لہجہ میں کہا۔ "کلیرا۔ تم نے میری زندگی کی ساری خوشیاں مجھ سے چھین کر ایڈی کے حوالہ کر دیں۔ خیر۔ اچھا کیا۔ مگر یاد رکھو ایڈی کی مسرتیں بھی شفق کی روشنی سے زیادہ پائیدار ثابت نہ ہوں گی۔ وہ میرا دوست تھا اُس نے دوست کے ساتھ دغا کی۔ مجھے لوٹ لیا۔ میری زندگی مجھ سے چھین لی۔ مگر مکافاتِ عمل سے کوئی شخص بچ نہیں سکتا۔ یہ قدرت کا قانون ہے جو کبھی نہیں ٹلتا۔ ایڈی کو بھی دوست کشی کا ثمرہ ضرور ملے گا اور جلد ملے گا۔"

پرسی کو اس وقت طیش آگیا تھا، وہ بڑے جوش کے ساتھ تقریر کر رہا تھا۔ اس کی یہ دہشت ناک پیشین گوئی سن کر میرا دل لرز گیا۔ رات کے واقعات میرے سامنے تھے اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی بڑی تباہی آنے والی ہے۔ ایڈی کے وحشیانہ سلوک کے باوجود میرے دل کا کوئی گوشہ ابھی تک اُس کی محبت سے خالی نہیں ہوا تھا۔ اور میں یہ کسی طرح گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ میرے سامنے کوئی ایڈی کو کچھ کہے۔

"بس پرسی بس۔ میں اس قسم کی باتوں کی روادار نہیں۔ اب اگر تم نے ایڈی کا نام بھی لیا تو میں اُٹھ کر چلی جاؤں گی۔" میں نے جھلا کر کہا۔

"یہی تمہارا انصاف ہے، غدار کو غدار نہ کہوں۔ کیا اُس نے دوستی کے پردہ میں مجھ سے دغا نہیں کی؟" پرسی نے جھلا کر جواب دیا۔

اب میرے لئے اُس کمرہ میں ٹھہرنا ناممکن تھا۔ میں جبا سنے کے ارادہ سے اُٹھی

اور دروازہ کا رُخ کیا۔ پرسی نے دوڑ کر میرے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ اُس کا غصّہ یکایک دھیما پڑ گیا اور اس نے بڑی درد بھری آواز سے کہا۔

"کلیرا پیاری۔ مرنے والے سے اس طرح نہیں روٹھتے۔ میں فوج میں بھرتی ہو گیا ہوں۔ پیر کے دن ہماری پلٹن فرانس چلی جائے گی۔ اس وقت جنگ اور موت کے ایک ہی معنی ہیں۔ زندہ بچ کر آنے کی کوئی اُمید نہیں اور نہ زندہ رہنے کی اب تمنّا بھی نہیں، اسی لئے یہ راستہ اختیار کیا ہے۔ دل نے مجبور کیا کہ موت کے آغوش میں جانے سے پہلے ایک بار تمہیں اور دیکھ لوں۔ پھر کوئی حسرت نہ رہے گی۔ آرام سے جان نکلے گی۔ بات میں بات نکل آئی۔ ورنہ میں تو صرف آخری دیدار کے لئے آیا تھا۔ معاف کر دے کلیرا پیاری۔ مجھ سے قصور ہوا!" یہ کہہ کر پرسی میرے قدموں میں دوزانو ہو گیا۔ وہ اس وقت سراپا حسرت بنا ہوا تھا۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر اور واقعات سُن کر میرا بھی جی دُکھ گیا!"

"ہیں، ہیں، یہ کیا کرتے ہو پرسی!" میں یہ کہتی ہوئی اُسے اُٹھانے کے لئے جھکی۔ اتنے میں کمرہ کا دروازہ آہستہ سے کُھلا اور ایڈی اندر آیا۔ ہمیں اس حال میں دیکھ کر ایڈی نے کہا:۔

"معاف کرنا مجھے معلوم نہ تھا!" یہ کہہ کر وہ فوراً کمرہ سے باہر نکل گیا۔ میں بالکل ہکّا بکّا رہ گئی، پرسی خاموشی کے ساتھ "خدا حافظ" کہہ کر کمرہ سے باہر نکل گیا۔ میری یہ حالت تھی جیسے مجھ پر بجلی گر پڑی۔ حواس بالکل مختل ہو گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہوں، کچھ خبر نہ تھی کہ کہاں ہوں۔ پھر یکایک کچھ خیال اور آیا اور میں دیوانوں کی طرح دوڑتی ہوئی برابر والے کمرہ میں گئی۔ ایڈی وہاں موجود نہ تھا پھر چھت پر پہونچی۔ بیڈ روم بھی خالی تھا۔ اس کے بعد ایک ایک کمرہ اور گھر کا کونا کونا دیکھ ڈالا۔ مگر ایڈی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ گھر سے باہر نکل کر آئی۔ گلی کے موڑ پر اخبار والے

کی دُکان تھی اُس سے پوچھا کہ تم نے تو ایڈی کو نہیں دیکھا۔ اُس نے کہا "ہاں تھوڑی دیر ہوئی میں نے ایڈی کو ٹرام پر سوار ہوتے دیکھا تھا" اب میرے لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ گھر واپس جاؤں اور ایڈی کی واپسی کا انتظار کروں، دوپہر سے شام اور شام سے رات ہو گئی، مگر ایڈی واپس نہ آیا۔ وہ رات اور اس کے بعد والی بہت سی راتیں جس بیکلی اور اذیت کے ساتھ بسر ہوئیں خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ دنوں سے ہفتے اور ہفتوں سے مہینے ہو گئے مگر ایڈی نہ آیا۔ نہ اس کی کوئی خبر ملی۔ اسی طرح دن گذرتے چلے گئے۔ ایڈی کی گم شدگی کے چھ ماہ بعد آیوا کی ولادت ہوئی۔ ایوا کی شکل اپنے باپ سے بہت ملتی جلتی ہے۔ خصوصاً آنکھیں تو بالکل ایڈی ہی کی سی ہیں۔ میری زندگی کے ویرانے میں یہ ننھا سا دل رُبا پھول قدرت نے شاید اس لئے کھلایا تھا کہ اس کی مسکراہٹوں سے پیدا ہونے والی معصوم مسرتیں میرے نہ بھولنے والے غموں پر چھا جائیں اور میرے دل کا ناسور رستا بند ہو جائے۔ اٹھارہ برس گذرنے کے بعد بھی ایڈی کی نہ بھولنے والی یاد اور زندہ رہنے والی محبّت تو آج بھی اسی طرح میری زندگی کا سہارا ہے جس طرح ایڈی کی موجودگی میں تھی اور دل کا کوئی ایک زخم بھی مندمل نہیں ہوا مگر ایوا کی ولادت سے میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ وہ میرے لئے گم شدہ ایڈی کی زندہ یادگار اور میری بھٹکتی پھرنے والی محبت کا ٹھکانا بن گئی۔ وہ میرے لئے آیوا بھی ہے اور ایڈی بھی........ میں ایڈی کو اپنی زندگی کہا کرتی تھی، اب آیوا میری زندگی ہے۔ غالباً آپ کو معلوم ہو گا کہ آیوا "زندگی" کو کہتے ہیں۔ اسی لئے میں نے اس کا نام آیوا رکھا ہے"!

"تو کیا گم شدگی کے بعد پھر کبھی آپ کو ایڈی کی کوئی خیر خبر نہ ملی ؟" میں نے ناشپاتی چھیلتے ہوئے پوچھا۔

"ملی کیوں نہیں۔ مگر اس کا حاصل اس کے سوا اور کچھ نہ ہوا کہ سینہ میں چند داغ

اور دل میں چند زخم اور بڑھ گئے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد ۱۹۱۸ء میں جب افریقہ سے ہماری فوجیں واپس آئیں تو میری ایک سہیلی کے بھائی والٹر نے بیان کیا کہ اس نے ایڈی کو دارالسلام میں دیکھا تھا۔ جرمن ایسٹ افریقہ فتح ہونے سے پہلے ایڈی وہاں برطانوی جاسوس کی حیثیت سے بھیجا گیا تھا۔ وہاں اس نے اپنا نام ڈکنسن رکھ لیا تھا اور والٹر کے سوا وہاں کوئی اس کے اصلی نام سے واقف نہ تھا۔ نہ معلوم کیا صورت ہوئی کہ اس سے اپنے ایک افسر سے بگاڑ ہو گیا اور ایڈی نے اسے قتل کر ڈالا۔ جس دن والٹر دارالسلام سے لندن کے لئے روانہ ہوا اسی دن ایڈی کو فوجی عدالت سے سزائے موت کا حکم سنایا گیا تھا۔ جب میں نے یہ خبر سنی تو میری حالت اور بھی تباہ ہو گئی۔ ہفتوں نہیں، بلکہ مہینوں یہ کیفیت رہی کہ شاید ہی کوئی دن ایسا گذرتا ہو جو دو چار دفعہ رو نہ لیتی ہوں۔ روتے روتے آنکھیں بے نور ہو گئیں۔ پھر وہ زمانہ بھی گذر گیا۔ ناز و نعمت کے گہواروں میں عورت نہایت کمزور مخلوق معلوم ہوتی ہے۔ مگر جب مصیبت آ کر پڑتی ہے تو بڑی بڑی کڑیاں جھیل جاتی ہے۔ والٹر کی چشم دید شہادت کے بعد کوئی وجہ نہ تھی کہ میں ایڈی کو مردہ نہ سمجھتی، مگر خدا جانے کیوں میرا دل کبھی اس پر آمادہ نہیں ہوا کہ میں اسے مردہ تصور کر لوں اور آج بھی وہی کیفیت ہے، امید کا کوئی پہلو باقی نہیں۔ مگر مجھے ہمیشہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایڈی ایک دن ضرور واپس آئے گا۔ اور میری زندگی میں آئے گا۔ مرنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر اس کا مسکراتا ہوا چہرہ اور جادوگر آنکھیں مجھے پہلی ملاقات کی طرح مسحور کر دیں گی"!

یہاں تک کہنے کے بعد مسز براؤن یکایک خاموش ہو گئیں اور صوفے کی پشت پر سر رکھ کر آنکھیں آدھی بند کر لیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہیں۔ نہایت شیریں خواب۔ ان کے ہونٹوں پر ایک دل نواز مسکراہٹ اور چہرہ پر قلبی سرور کی ایک نہ بیان ہو سکنے والی کیفیت نمایاں تھی۔ میں بھی خاموش بیٹھا ہوا ان کی

اس کیفیت کا بڑی دل چسپی سے مطالعہ کر رہا تھا۔ پھر انہوں نے ایک لمبی سانس لی اور سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

"لیجیے کھائیے،" میں نے چھلی ہوئی ناشپاتیوں کی طشتری ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"شکریہ"

"سب واقعات سن کر بھی یہ معمّا اب تک حل نہ ہوا کہ آپ کو اور آیوا کو ایران اور فارسی زبان سے اس قدر دل چسپی کیوں ہے؟"

"یہ معمّا بھی ابھی حل ہو جائے گا۔ ہاں تو میں کہاں تک پہونچی تھی؟"

"یہاں تک کہ آپ کو مسٹر براؤن کے واپس آنے کی آج تک امید ہے"

جی ہاں۔ صورت یہ ہے کہ میری ایک رشتہ کی بھانجی ہے "آئی لین" جس زمانہ میں میری شادی ہوئی وہ اپنے والدین کے ساتھ ریڈنگ میں رہتی تھی۔ اس لئے اس نے ایڈی کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں جب اس کی شادی ہوگئی اور وہ لندن آکر رہی تو اکثر میرے یہاں آیا جایا کرتی تھی اور آیوا سے بہت محبت کرتی تھی۔ اسی زمانہ میں ایڈی کے مفصل حالات، گمشدگی اور افریقہ کا سارا قصہ میں نے اسے سنایا تھا اور ایڈی کی تصویریں بھی دکھائی تھیں۔ ۱۹۲۷ء میں لندن کی ایک فرم نے اس کے شوہر ولسن کو تجارتی کاروبار کے سلسلہ میں ایران بھیجا۔ آئی لین بھی ساتھ گئی۔ اور یہ لوگ کوئی تین برس وہاں رہے۔ آئی لین جب لندن واپس آئی اور مجھ سے ملی تو اس نے عجیب و غریب واقعات بیان کئے، ایران میں کوئی شہر ہے مشہد، جب آئی لین وہاں تھی تو ایک امریکن موٹر کمپنی کا ایجنٹ موسیو بوندون کاروباری سلسلہ میں ولسن سے ملنے آیا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ تعلقات دوستی کی حد تک پہونچ گئے۔ ایک دن ولسن کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ آئی لین بھی گھر پر موجود نہ تھی۔ موسیو بوندون آیا۔ ملازم نے ڈرائنگ روم

میں لے جا کر بٹھا دیا اور وہ اُن لوگوں کے آمد کا انتظار کرنے لگا۔ اتفاق سے آئی لین اسی وقت گھر واپس آئی اور ڈرائنگ روم میں گئی تو کیا دیکھا کہ موسیو بوندون ایک تصویر پر سر جھکائے بڑے غور سے اُسے دیکھ رہا ہے۔ آئی لین کو آتا دیکھ کر وہ کچھ سٹ پٹا سا گیا۔ مگر آئی لین کو اُس وقت کچھ خیال بھی نہ ہوا۔ آیندہ ملاقاتوں کے دوران میں آئی لین کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ موسیو بوندون کو اس تصویر سے کوئی خاص دلچسپی ہے۔ کیوں کہ جب تک وہ بیٹھا رہتا بیسیوں مرتبہ اُس طرف دیکھتا اور اُس سے متاثر ہوتا۔ وہ کوشش کرتا تھا کہ آئی لین یا ولسن کو اُس کے تصویر کی طرف دیکھنے کا پتا نہ چلنے پائے۔ ولسن کی ایسی جزئیات پر نظر نہیں جاتی۔ مگر آئی لین تو بلا کی تیز ہے، وہ فوراً تاڑ گئی کہ اس میں کچھ نہ کچھ بھید ضرور ہے۔ نسوانی فطرت کی کنجکاوی آپ جانتے ہیں۔ چنانچہ آئی لین کو اب یہ فکر ہوئی کہ کسی طرح اس راز کو معلوم کرنا چاہیے۔ ایک دن جب کہ موسیو بوندون اس کی نظر بچا کر تصویر کی طرف دیکھ رہا تھا، اُس نے کہا:۔

"موسیو بوندون! غالباً یہ تصویر آپ کو بہت پسند ہے" آئی لین کے اس اچانک استفسار سے موسیو بوندون کچھ گھبرا سا گیا۔ جیسے کوئی چوری کرتے ہوئے پکڑا جائے۔ مگر پھر خود کو سنبھال کر اُس نے جواب دیا "کون ایسی تصویر کو پسند نہ کرے گا"

"اور وہ تصویر تھی کس کی؟" میں نے مسٹر براؤن کا قطع کلام کرتے ہوئے سوال کیا۔

"وہ میری ہی ایک پرانی تصویر تھی جو میں نے آئی لین کو ایران جاتے وقت دی تھی"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"پھر یہ ہوا کہ موسیو بوندون کے استفسار پر آئی لین نے اُسے بتایا کہ یہ تصویر کس کی تھی اور ضمناً میری ساری رام کہانی اور ٹریجڈی کی داستان بھی سنا دی۔ موسیو بوندون تمام واقعات سن کر بے حد متاثر ہوا۔ اُس کے چہرہ پر رنج و ملال کے ساتھ ندامت و انفعال کے آثار بھی نمودار ہو گئے۔ اُس دن کے بعد آئی لین نے اُسے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ

یکایک مشہد سے غائب ہو گیا۔ ولسن نے اُسے تلاش بھی کیا مگر کچھ پتا نہ چلا۔ آئی لین کا بیان ہے کہ موسیو بوندون میں بہت سی باتیں آیڈی کی سی تھیں۔ وہی مسکراتا ہوا چہرہ، وہی شکل وصورت، وہی دل موہ لینے والی باتیں، اگرچہ وہ اپنے آپ کو فرانسیسی کہتا تھا۔ ڈاڑھی بھی اس کی فرانسیسی قطع کی تھی مگر انگریزی ایسی بولتا تھا کہ صرف ایک انگریز ہی بول سکتا ہے اور آئی لین کو بارہا یہ شبہ ہوتا تھا کہ ضرور وہ انگریز ہے۔ آئی لین نے جب یہ واقعات بیان کئے تو میرا دل بول اُٹھا کہ وہ ضرور آیڈی ہی تھا!"

"مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی!" میں نے پھر مسٹر براؤن کا قطع کلام کرتے ہوئے کہا "آئی لین کو موسیو بوندون کے انگریز ہونے کا اس لئے شبہ ہوا کہ وہ انگریزی ایک انگریز کی طرح بولتا تھا۔ مگر آئی لین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرنچ بھی یقیناً ایک فرانسیسی کی طرح بولتا تھا۔ اِسے کیا کہیئے گا؟"

"ہاں اسی بات سے تو میرے خیال کو اور تقویت ہوئی۔ دراصل آیڈی کی والدہ فرنچ تھیں۔ اسی لئے فرانسیسی اُس کی مادری زبان ہے اور وہ خود آدھا فرانسیسی ہے۔"

"آپ کا قیاس بے بنیاد نہیں!" میں نے مسٹر براؤن کی تائید کرتے ہوئے کہا!

"ہرگز نہیں"، مسٹر براؤن نے جواب دیا "میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ آیڈی تھا اور مجھے یقین ہے کہ وہ زندہ سلامت ایران کے کسی شہر میں موجود ہے اور ایک دن ضرور ہم سے آملے گا۔ آیوا نے آیڈی کو نہیں دیکھا۔ کیونکہ وہ اس کی گم شدگی کے چھ ماہ بعد پیدا ہوئی تھی۔ مگر خدا جانے کیا بات ہے کہ اُسے آیڈی سے نادیدہ محبت ہے۔ باپ کے سایۂ شفقت میں ناز و نعمت سے پلنے والی لڑکیوں کو بھی شاید باپ کی اتنی چاہت نہیں ہوتی۔ آیڈی کے ذکر سے اُس کی روح تازہ ہوتی ہے۔ جب سے آئی لین نے یہ قصہ بیان کیا ہے اُسے ایران جانے کی دھن سمائی ہے۔ کہتی ہے اُس ملک کا ایک ایک گوشہ چھانوں گی اور اپنے باپ کو ڈھونڈھ کر لاؤں گی اور اگر قانونی

مجبوریاں اس کے آنے میں سدراہ ہوں گی تو پھر ہم لوگ بھی اُس کے پاس وہیں چلے جائیں گے۔ مجھ سے زیادہ اُسے اس امر کا یقین ہے کہ ایڈی زندہ ہے اور ایران میں موجود ہے۔ کہتی ہے، میرا دل گواہی دیتا ہے اور میں اپنے دل کی گواہی پر یقین رکھتی ہوں"۔ بڑی دشواریوں سے یہ ایک برس گذرا ہے۔ ایک دن میں نے کہا۔ "کیوں آیوا۔ بوڑھی ماں کو بے سہارا چھوڑ کر چلی جاؤ گی؟" تو بولی "اماں۔ بے سہارے تو ہم اب ہیں۔ میں سہارا ڈھونڈھ کر لاؤں گی۔ میں نے اُسے یہ بہلا دے دے کر روکا ہے کہ ابھی تم بہت کم سن ہو۔ ابھی کم از کم دو تین سال اور توقف کرو۔ اس دوران میں اُس ملک کی زبان بھی اچھی طرح سیکھ لو۔ تاکہ اپنی کہہ سکو دوسرے کی سمجھ سکو، اور کیا عجب ہے کہ اسی اثنا میں ہمیں ایڈی کی کچھ خیر خبر مل جائے یا وہ خود واپس آجائے۔ خدا بڑا کارساز ہے۔ غالباً اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ مجھے اور آیوا کو ایران اور فارسی زبان سے اس قدر دلچسپی کیوں ہے!"

"ہاں اب یہ معمہ حل ہو گیا" میں اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ آیوا اور فریدی ٹینس کھیل کر واپس آگئے اور دس منٹ کے اندر ہم چاروں سینما دیکھنے چلے گئے۔

آیوا اور فریدی کے مراسم روز بروز زیادہ ہوتے جا رہے تھے اور اب فریدی سنیچر کے دن دوپہر کا کھانا لازمی طور پر مسز براؤن ہی کے یہاں کھاتے تھے۔ کبھی کبھی میں بھی شریک ہوتا تھا۔ جنوری ۱۹۳۳ء کی ساتویں تاریخ سنیچر کا دن غالباً مجھے زندگی بھر یاد رہے گا۔ کوئی ڈیڑھ بجے کا وقت تھا۔ ہم لوگوں کو کھانے سے فارغ ہوئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی۔ فریدی اپنا سگرٹ سلگا رہے تھے۔ آیوا ریڈیو پر س اسٹیشن ملا رہی تھی اور مسز براؤن ایک کراس ورڈ پزل، حل کر رہے تھے کہ اتنے میں دروازہ پر کسی نے کھٹکا کیا۔ آیوا ریڈیو چھوڑ دوڑتی ہوئی گئی اور یہ خبر لائی کہ مسٹر ڈیکھارن،

مسٹر براؤن سے ملنے آئے ہیں۔ مسٹر براؤن کے یہاں آنے جانے والے گنتی کے لوگ تھے اور اُن سب کو میں جانتا تھا۔ مسٹر وگیھارن کو نہ کبھی دیکھا تھا نہ ان کا نام سنا تھا۔ اس لئے میں نے ذرا تعجب سے پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ مسٹر براؤن نے جواب دیا کہ میں خود نہیں جانتی۔ فریدی نے کہا پھر یہیں بلا لو۔ مسٹر براؤن نے کہا نہیں میں برابر والے کمرہ میں بات چیت کر لوں گی تم لوگ اپنا شغل جاری رکھو۔ یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئیں اور ہم سب بدستور اپنے اپنے شغل میں مصروف ہو گئے۔ مشکل سے تین چار منٹ گذرے ہونگے کہ ایک دھماکے کی سی آواز ہوئی جیسے کوئی کھڑے سے گر پڑا۔ ساتھ ہی مسٹر وگیھارن کی آواز سُنائی دی کہ جلد آئیے۔ ہم تینوں دوڑتے ہوئے دوسرے کمرہ میں پہونچے۔ آیوا آگے آگے تھی۔ اُس نے ایک چیخ ماری۔ ہم دونوں بھی ڈر گئے۔ مسز براؤن فرش پر بے ہوش پڑی تھیں اور مسٹر وگیھارن انہیں زمین سے اُٹھا کر صوفے پر لٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اُنہوں نے کہا پانی لائیے۔ فریدی پانی لانے کو دوڑے۔ میں آگے بڑھا کہ مسز براؤن کے اُٹھانے میں مسٹر وگیھارن کی مدد کروں۔ اب تک میں نے مسٹر وگیھارن کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ کیونکہ دروازہ کی طرف اُن کی پیٹھ تھی۔ جیسے ہی میری نظر اُن کے چہرہ پر پڑی اور انہوں نے مجھے دیکھا ایک ساتھ بے ساختہ ہماری زبان سے نکلا "موسیو فیرلین!"

"مسٹر ہریم"

ہر شخص اپنی اپنی جگہ حیران تھا۔ آیوا نے حیرت سے ایک بار موسیو فیرلین کو دیکھا فریدی بھی اس معمے کو بالکل نہ سمجھ سکے۔ مسز براؤن کو صوفے پر لٹانے کے بعد ان کے چہرہ پر پانی کے چھینٹے دئے گئے۔ آیوا اُن کے بکھرے ہوئے بال درست کرنے لگی۔ دو تین منٹ کے بعد مسز براؤن نے آنکھیں کھولیں اور کمزور آواز میں کہا:-

"ایڈی۔ میرے پیارے!" موسیو فیرلین آگے بڑھ کر مسز براؤن پر جھک گئے۔

اور مسٹر براؤن نے اُن کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اُن کا سر اپنے سینہ سے لگا لیا۔ آیوا اپنی ماں کی زبان سے اَیڈی کا نام سُنتے ہی اُچھل پڑی۔ اُس نے حیرت اور انتہا سے مسرت سے ایک چیخ ماری اور "پیارے اَبّا" کہہ کر مونسیئو فیرلین سے چمٹ گئی۔ میری اور فریدی کی زبان سے بیک وقت نکلا "مسٹر براؤن!"

سچی کہانی

(مسٹر براؤن)

تھوڑی دیر کے بعد پھر ہم سب ڈرائنگ روم میں تھے، ایک طرف مسز براؤن ایک طرف آیوا۔ درمیان میں مسٹر براؤن۔ یہ تینوں ایک صوفے پر، ادھر میں اور فریدی ان کے مقابل کرسیوں پر بیٹھے تھے۔

"مسٹر براؤن، مسٹر ونجیارن، مسٹر ڈکنسن اور موسیو فیرلین یہ سب آپ ہی کے نام ہیں؟" میں نے ہنستے ہوئے مسٹر براؤن سے سوال کیا۔

"جی ہاں" مسٹر براؤن نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"اور موسیو بوندون؟" آیوا نے پوچھا۔

"موسیو بوندون بھی؟" مسٹر براؤن نے آیوا کی پیشانی کا بوسہ لیتے ہوئے کہا۔

اپنے اپنے تعلق کے مطابق ہم سب لوگوں کو اس وقت جو خوشی تھی اس کا صرف ایک دھندلا سا تصور کیا جا سکتا ہے بیان تو ممکن ہی نہیں۔ فریدی البتہ ذرا کسمسا رہے تھے کہ آیوا کے ساتھ ان کا آج شام کا پروگرام گاؤخوردہ ہو گیا، خوشی کا جوش جب ذرا

کم ہوا تو خیال آیا کہ ارے اب تک مسٹر براؤن سے فریدی کا تعارف تو ہوا ہی نہیں، خیر یہ رسم بھی ادا کی گئی، اس کے بعد سب نے مسٹر براؤن سے خواہش کی کہ آپ اپنی روداد تو سنائیے اور یہ بتائیے کہ اس طرح لندن چلے آنے میں آپ کے لئے کوئی خطرہ تو نہیں۔

"میں بالکل محفوظ ہوں" مسٹر براؤن نے جواب دیا "والٹر نے افریقہ سے آکر جو کچھ بیان کیا وہ صحیح بھی ہے اور غلط بھی، صحیح اس لئے کہ والٹر نے خود کوئی غلط بیانی نہیں کی۔ اور غلط اس طرح کہ حقیقت واقعہ اُس بیان کے خلاف ہے۔ میرا آفیسر قتل ضرور ہوا، مگر میرے ہاتھ سے نہیں، دوسرے کے ہاتھ سے جس نے اپنا الزام میرے سر تھوپ دیا، مجھے سزائے موت کا حکم سُنا دیا گیا اور اگلا دن اس حکم کی تعمیل کے لئے مقرر ہوا، اسی رات کچھ جرمن قیدیوں نے بغاوت کی، جیل خانہ توڑ ڈالا اور اکثر محافظوں کو قتل کر کے صاف نکل گئے۔ یہی ہنگامہ میری رہائی اور نجات کا باعث ہوا۔ دیس دیس کی خاک چھانتا۔ زنگا زنگ کے مصائب جھیلتا۔ مصر، شام، ٹرکی اور عراق ہوتا ہوا ایران کے پایہ تخت طہران پہنچا، یہاں ایک امریکن مشنری ڈاکٹر ڈے وِس سے دوستی ہو گئی، میں نے بنی نوع کے ایسے ہمدرد اور نیک نفس انسان زندگی میں نہیں دیکھے، طہران میں دول یورپ کے اکثر سفیروں، ممالک خارجہ کی بڑی بڑی کمپنیوں کے مالکوں اور خود ایران کے بہت سے اعیان واکابر سے اُن کے بڑے اچھے تعلقات ہیں، ان کی وساطت سے مجھے مشہد میں ایک امریکن موٹر فرم کی ایجنسی مل گئی، مشہد میں آئی لین سے ملنے اور تمام حالات سننے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ قصور اگر تھا تو میرے فہم کا۔ کلیرا کا دامن مقدس مریم کی طرح آلودگی سے پاک ہے، اس انکشاف کے بعد ایران میں ایک لمحہ کا قیام میرے لئے سوہانِ روح تھا، اپنی غلطی پر احساس ندامت اور کلیرا کو رنج پہنچانے کا ملال مجھے مارے ڈالتا تھا۔ اس وقت لندن آنا میرے

لئے ایسا ہی خطرناک تھا جیسے پٹرول کے حوض میں کھڑے ہو کر اس میں آگ لگا دینا۔ لیکن نتائج کی طرف سے آنکھ بند کر کے میں نے فوراً انگلستان آنے کا تہیہ کر لیا۔ کمپنی کے صدر دفتر میں حسابات سمجھانے اور کاغذات حوالہ کرنے کے لئے میں طہران گیا۔ خدا حافظی کے لئے اپنے محسن ڈاکٹر ڈے وس سے ملنا بھی ضروری تھا۔ ڈاکٹر ڈے وس میرے رازدار تھے۔" انہیں جب میرے ارادوں کا علم ہوا تو بڑی شدّت سے مخالفت کی۔ پہلے بہت سمجھایا جب میں نے نہ مانا تو ڈرایا جب اس سے بھی کام نہ چلا تو یہ لالچ دلایا کہ آیندہ سال ایران کا نیا سفیر لندن جائے گا، میں کوشش کرکے تمہیں ایک رکن سفارت کی حیثیت سے اُس کے ہمراہ بھجوا دوں گا۔ اور اس طرح تم بہت سے خطرات سے محفوظ رہو گے، بہت سے نشیب و فراز سوچ کر میں نے اُن کے اس وعدے کے بھروسے پر ایک سال کے لئے اپنا آنا ملتوی کر دیا مشہد سے میرا جی اُچاٹ ہو گیا تھا اور اب میں وہاں جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے ڈاکٹر ڈے وس نے مجھے امریکن کالج میں انگریزی کا پروفیسر مقرر کرا دیا اور اپنا مستقل مہمان بنا لیا، ایک سال گذر گیا۔ دوسرا شروع ہو گیا۔ مگر حکومت کی مصلحتوں نے نئے سفیر کو انگلستان بھیجنے کی اجازت نہ دی۔ آج کل، آج کل میں ایک سال اور نکل گیا۔ اب میرے صبر کا پیمانہ بالکل لبریز ہو چکا تھا۔ کلیرا کی جدائی کے مقابلہ میں اب مجھے پھانسی کا پھندا کہیں زیادہ پسند تھا۔ چنانچہ ایک دن میں نے ڈاکٹر ڈے وِس سے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر آپ مجھے خوشی سے جانے کی اجازت نہ دیں گے تو چھپ کر نکل جاؤں گا۔ انجام چاہے کچھ بھی ہو۔ ڈاکٹر ڈے وِس میرے مزاج سے اچھی طرح واقف ہو گئے تھے، اُنہیں یقین تھا کہ میں جو کچھ کہتا ہوں وہی کروں گا۔"

اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ اچھا صرف ایک مہینہ اور ٹھہر جاؤ شاید خدا کوئی صورت پیدا کر دے، اس کے بعد تمہیں اختیار ہے، چار و ناچار مجھے ماننا پڑا۔ انگریزی کی ایک

مثل ہے کہ "واقعات افسانوں سے کہیں زیادہ عجیب ہوتے ہیں۔" اس اٹھارہ برس کی جہاں نوردی میں ایسے واقعات مجھے بارہا پیش آئے اور اب جو بات میں بیان کرنے والا ہوں وہ خود اسی قسم کی ہے، ڈاکٹر ڈےوِس اور مسز ڈےوِس دونوں امریکن ہیں۔ مسز ڈےوس کے ایک بڑے بھائی مسٹر گلبرٹ، جنگ عظیم سے قبل سیاحت کے سلسلہ میں لندن آئے تھے، یہاں انہیں کلیر اجیبی کوئی موہنی مورت مل گئی۔ اور وہ یہیں کے ہو رہے، ڈاکٹر ڈےوِس سے جس دن مذکورۂ بالا گفتگو ہوئی اُس کے اگلے دن شام کو دونوں میاں بیوی میرے کمرہ میں آئے اور مجھ سے کہا کہ آپ بخوشی لندن تشریف لے جا سکتے ہیں۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا کہ ان کا مطلب کیا ہے۔ دونوں مسرور معلوم ہوتے تھے۔ خوشی کے مارے اُن کے چہرے دمک رہے تھے، مجھے حیران دیکھ کر ڈاکٹر ڈےوِس نے ایک خط اپنی جیب سے نکال کر میرے سامنے ڈال دیا اور کہا اسے پڑھو۔ یہ خط مسٹر ڈےوس کے نام تھا، لندن سے اُن کے بھائی مسٹر گلبرٹ نے بھیجا تھا۔ لکھا تھا کہ میں ان دنوں کچھ ایسے ترددات میں مبتلا رہا کہ تمہیں خط نہ لکھ سکا ایک مہینہ ہوا جیک کا انتقال ہو گیا، گریس، (مسز گلبرٹ) کی صحت تو مدتوں سے اچھی نہیں ہے، اب بھائی کی موت کے صدمہ نے اور بھی حالت خراب کر دی ہے، جیک نے مرتے وقت ایک عجیب و غریب راز کا انکشاف کیا۔ اُس نے ہم سب کے سامنے پادری سے اقرار کیا کہ سیکرٹ سروس کے آفیسر مسٹر جیکسن کو میں نے قتل کیا تھا اور الزام اُس کے ماتحت مسٹر رچی پر لگا دیا تھا۔"

"آپ سمجھے یہ مسٹر رچی کون تھا؟" مسٹر براؤن نے ہم لوگوں سے سوال کیا۔

"نہیں"، ہم سب نے ایک ساتھ سر ہلا کر کہا۔

"مسٹر رچی کو آپ سب لوگ جانتے ہیں۔" مسٹر براؤن نے سنجیدگی سے کہا۔

"کم از کم میں تو نہیں جانتا۔" میں نے جواب دیا۔

"مسٹر رچی آپ کے سامنے موجود ہے اور آپ سے باتیں کر رہا ہے" مسٹر براؤن نے مسکرا کر کہا۔ ہم سب حیرت اور مسرت کی تصویر بن گئے۔

"خوب تو مسٹر رچی بھی آپ کا نام ہے" میں نے کہا۔

"ابا آپ کے کتنے نام ہیں؟" ایوا نے الڑھ پن سے پوچھا۔

"اب تو مجھے خود بھی یاد نہیں" مسٹر براؤن نے جواب دیا "دراصل سیکرٹ سروس میں داخل ہونے کے بعد مجھے وقتاً فوقتاً کئی نام بدلنے پڑے"

"ٹھیک ہے۔ اس لئے کہ والٹر نے آپ کا نام ڈکنسن بتایا تھا" میں نے کہا "مگر یہ تو کہئے، ایران میں آپ کو دو فرانسیسی ناموں کی کیا ضرورت پیش آئی تھی"

"میں امریکہ اور فرانس کے بعض اخبارات میں ایران کے متعلق مضامین لکھا کرتا تھا اور بہ غرض احتیاط "فیرلین" کے فرضی نام سے شائع کرایا کرتا تھا۔ پھر جب حالات بدل گئے اور کچھ اندیشہ نہ رہا تو میں نے ظاہر کر دیا کہ موسیو فیرلین اور موسیو بوندون ایک ہی شخص کے دو نام ہیں۔ اُس وقت سے اکثر لوگ مجھے موسیو فیرلین ہی کہنے لگے"

"لان شیپی کو لوگ سو شکلوں والا آدمی کہا کرتے تھے، آیڈی کو سو ناموں والا آدمی کہنا چاہیئے" مسز براؤن نے مسٹر براؤن کے کاندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

اگلے ہفتہ پھر ہم سب لوگ مسز براؤن کے یہاں جمع ہوئے۔ فریدی کو آیوا کے سوا اور کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ لہٰذا وہ کھانا کھا کر اور کوئی گھنٹہ بھر ہم لوگوں کے ساتھ برج کھیلنے کے بعد آیوا کو ساتھ لے ٹینس کھیلنے چلے گئے۔ مسز براؤن کو آج اپنے بال ترشوانے کے لئے جانا تھا۔ لہٰذا وہ بھی گھنٹہ بھر میں واپس آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوئیں۔ میں اور مسٹر براؤن کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے، اس کے بعد میری خواہش پر انہوں نے اپنی سرگذشت اِس طرح بیان کرنی شروع کی:۔

"دیوانگی کی حدیں معین کرنا ناممکن ہے۔ مشاعر و حواس کا اختلال صرف اسی شخص میں نہیں پایا جاتا جسے ہم عرف عام میں دیوانہ کہتے ہیں۔ بلکہ ہر انسان کبھی کبھی حوادث کے طمانچوں اور مصائب کی ٹھوکروں سے چکنا چور ہو کر کچھ مدت کے لئے اسی سطح پر آجاتا ہے جو خود ساختہ داناؤں نے دیوانوں کے لئے مقرر کی ہے، مدتِ جنون کی کمی بیشی سے اگر قطع نظر کر لی جائے تو ہم سب کے سب یکساں طور پر دیوانے ہیں اور ہمارے کسی فعل کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی" یہ ہیں وہ خیالات جن کا میں ایک مدت سے قائل ہوں اور جنھوں نے مجھے بارہا خطرناک یا باصطلاح قانون "مجرمانہ" اقدامات سے باز رکھا اور آج آپ مجھے اپنے سامنے زندہ دیکھ رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جذبات کے طوفان میں استوار عقیدے اور مسلّم نظریے کمزور تنکوں کی طرح بہہ جاتے ہیں لیکن ہنگامی جوش فرو ہو جانے کے بعد پھر ایک بار انسان حقیقت پر غور کرنے اور اسے سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے، آپ ابھی جوان ہیں۔ اس لئے بوڑھوں سے زیادہ اس بات کے سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں کہ محبت کے معاملات میں ادنیٰ سی تحریک سے رشک و رقابت کے جذبات کا بھڑک اٹھنا اور بدگمانی سے عقل کا مغلوب ہو جانا بالکل ایک قدرتی بات ہے، میں نے دو مرتبہ پرسی کو چوروں کی طرح دبے پاؤں اپنی گلی سے نکلتے دیکھا تھا، مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ پرسی اور کلیرا دونوں ایک دوسرے کے دوست رہے تھے، پرسی، کلیرا پر جان دیتا تھا اور کلیرا کو بھی اس کا پاس خاطر منظور تھا اور اگر میں یکایک اُن کے درمیان میں حائل نہ ہو گیا ہوتا تو غالباً پرسی، کلیرا کو اپنی رفیقۂ حیات بنانے میں کامیاب ہو جاتا۔ پھر انسانی فطرت اور خصوصاً نسوانی فطرت کا تلوّن ایک ایسا معمّا ہے جو کبھی کسی کی سمجھ میں نہیں آیا، ہر کلیہ یہاں ٹوٹ جاتا ہے، ہر ناممکن بات ممکن ہو جاتی ہے۔ ان آنکھوں نے کیا کیا نہیں دیکھا۔ بیگانوں میں تعارف ہوا کسی کی صورت نے جذب کیا، کسی کی سیرت

نے کھینچا۔ دلچسپی بڑھی۔ ارتباط قائم ہوا۔ طرفین نے درمیانی فاصلہ کو سرعت کے ساتھ طے کرنا شروع کیا، قریب ہوتے گئے، قریب ہوتے گئے، اُنس محبت میں تبدیل ہو گیا آخر اس طرح مل گئے جیسے سمندر کے کنارے آسمان سے، اور ازدواج کی بظاہر نہ ٹوٹنے والی زنجیر نے ہمیشہ کے لئے انہیں ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا۔ کہو اب اُنہیں کون جدا کر سکتا ہے؟ کوئی نہیں، مگر انسانی فطرت کا تلوّن۔ ابھی چار دن نہ گذرے تھے کہ ایک نے یا دوسرے نے برسوں کی کمائی بلکہ حاصلِ زندگی کو انتہائے خوں سری کے ساتھ ضائع کر دیا اور خوشی خوشی پھول کو کانٹے سے اور ہیرے کو ٹھیکری سے بدل لیا پھر یہ بھی دیکھا کہ برسوں انتہائے لطف کے ساتھ ازدواجی زندگی گذارنے کے بعد یکایک شوہر نے یا بیوی نے یا دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ خیانت شروع کر دی جس کا نتیجہ دائمی جدائی ہوا۔

بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ مدتوں ایک دوسرے کی پرستاری کے بعد، جب پیمانِ محبت کی تکمیل کا وقت قریب آیا اور منزلِ مقصود (ازدواج) بالکل سامنے نظر آنے لگی، تو یکایک ایک بیگانے کے ظہور نے سارا کھیل درہم برہم کر دیا یا شکست خوردہ حریف کی اَن تھک کوششوں نے ہاری ہوئی بازی پھر جیت لی۔ میرا ذاتی عقیدہ اور تجربہ بھی یہی ہے کہ عورت خواہ کسی مزاج اور کسی طبقہ کی کیوں نہ ہو، اگر تم اُسے یہ یقین دلا دو کہ تم اُسے چاہتے ہو اور پھر اس کی بے اعتنائی بلکہ بدسلوکی کے باوجود اُس کا "تعاقب" کئے جاؤ تو وہ آخر تمہاری محبت کا جواب محبت سے دینے کے لئے سوسائٹی اور مذہب کے ہر قانون کو پامال کرنے پر آمادہ ہو جائے گی۔ ممکن ہے کہ بعض اوقات ایک دوشیزہ پر یہ جادو نہ چلے مگر ایک شادی شدہ عورت کے لئے یہ عمل ایک بے پناہ حربہ ہے ہاں اس تک رسائی اور اظہارِ خیالات و جذبات کا موقع ملنا ضروری ہے۔

یہ تمام خیالات بلکہ واقعات نظر کے سامنے تھے۔ پرنسی کے مشتبہ طرزِ عمل نے

میرے رگ و پے میں آگ بھر دی تھی اور میں ساعت بساعت دیوانگی کے قریب ہوتا جا رہا تھا، خدارا تمہیں انصاف کرو کہ ان حالات میں جب میں نے پرسی کو کلیرا کے قدموں میں دو زانو، اور کلیرا کو اس پر جھکے ہوئے دیکھا تو مجھ پر کیا گذری ہوگی۔ مسٹر پریم! میں اسی لمحہ دیوانہ ہوگیا تھا۔ میری بینائی گم ہوگئی تھی مجھے کوئی چیز صاف دکھائی نہ دیتی تھی، میرے جسم کی طاقت سرعت کے ساتھ زائل ہو رہی تھی، اگر آپ مجھ سے یہ پوچھیں کہ میں اس وقت ان لوگوں کو اس حال میں چھوڑ کر کس ارادہ سے باہر چلا گیا تھا تو مجھے خود بھی معلوم نہیں، ایک اضطراری حرکت تھی جو بلا ارادہ عمل میں آئی۔ سڑک پر پہنچا تو ٹرام کھڑی تھی، بغیر کچھ سوچے سمجھے اس میں سوار ہوگیا۔ اس وقت مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ٹرام کہاں جا رہی ہے کئی مرتبہ دو، دو، تین، تین، پینی کا ٹکٹ خریدا، آخر ٹرام اپنے ٹرمنس پر پہنچ کر خالی ہوگئی۔ میں نے دیکھا کہ اب کوئی مسافر نہیں، میں ہی اکیلا بیٹھا ہوں، آخر میں بھی اتر پڑا، یہ علاقہ بہت سنسان تھا، قریب کے ایک پارک میں ایک درخت کے نیچے بینچ پر جا بیٹھا۔ اس تمام مدت میں ایک بے حسی کی سی کیفیت مجھ پر طاری رہی تھی، آنکھیں کھلی ہوئی تھیں مگر دیکھ نہ سکتی تھیں، کان بند نہ تھے مگر شنوائی معطل ہوگئی تھی، دل جذبات سے اور دماغ خیالات سے یکسر خالی تھا، کسی اذیت کا بھی احساس نہ تھا، رات ہو چکی تھی، یکایک میرے حواسوں میں بیداری پیدا ہوئی، دماغ نے کام کرنا شروع کیا، پہلا خیال جو آیا وہ یہ تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے، کلیرا سے مجھے جتنی محبت ہے اس سے زیادہ شاید کبھی کسی کو کسی سے ہوئی ہو۔ کلیرا کے بغیر میری زندگی بالکل بے سود تھی، پھر پاس ناموس الگ، آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ ان تمام ننگیں اور جاں گداز مناظر کو موت کی سیاہ چادر سے ڈھانک دینا چاہیئے، مرنے کا مصمم ارادہ کر کے اٹھا، کوئی قاتل حربہ میرے پاس موجود نہ تھا۔ اس لئے ٹیمس کے ایک سنسان کنارے کی طرف چلا۔ تاکہ دریا کی خاموش گہرائیوں میں دنیا کے خرخشوں سے بے نیاز ہو کر ابدی نیند سو جاؤں،

دریا قریب نہ تھا مجھے پانچ چھ میل پیدل چلنا پڑا۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ آبادی سے جتنا دور ہو جاؤں اچھا ہے۔ سرد ہوا تیزی سے چل رہی تھی، رات آدھی آچکی تھی، دریا اب سامنے تھا اور چاند کی غم آلود روشنی میں خاموشی کے ساتھ بہہ رہا تھا، دریا کا یہ کنارہ بالکل سنسان تھا۔ آبادی یہاں سے بہت دور تھی۔ نہ جانے کیا خیال آیا میں نے پلٹ کر لندن پر پھر ایک آخری نگاہ ڈالی اور بے اختیار میری زبان سے نکلا "آہ کلیرا!"

اب میں دریا سے بالکل قریب تھا، اس وقت یہاں کسی انسان کی موجودگی کا مجھے گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا، اس جگہ کنارہ پانی کی سطح سے بہت اونچا اور ناہموار تھا کنارے کے قریب کے نشیب سے یکایک مجھے ایک شخص نہایت آہستہ آہستہ اوپر کی طرف جاتا دکھائی دیا، میری طرف اس کی پیٹھ تھی، میں وہیں ٹھٹھک گیا۔ سب سے اونچی جگہ پر پہنچ کر وہ ٹھہر گیا اور کوئی دو منٹ تک خاموش کھڑا رہا۔ یکایک ایک دھماکے کی آواز ہوئی۔ آہ بدنصیب نے خود کو موجوں کی نذر کر دیا۔ میں سب کچھ بھول گیا اور بے اختیار اس کی طرف دوڑا۔ مگر وہ تہ آب ہو چکا تھا، حیرت ہے کہ اس کی نعش بھی نہ ابھری۔ نہ معلوم کون بدنصیب تھا جسے حیات کی تلخیوں سے آغوشِ مرگ کے سوا اور کہیں پناہ نہ ملی، نہ جانے کیا خیال مجھے اس نشیب کی طرف کھینچ لے گیا۔ جہاں یہ شخص نمودار ہوا تھا تھوڑے سے فاصلہ پر کاغذ کے چند چھوٹے چھوٹے پرزے پڑے نظر آئے میں نے بڑھ کر انہیں اٹھا لیا۔ ان میں سے اکثر سادہ تھے اور بعض پر پنسل سے کچھ لکھا ہوا تھا جو پڑھا نہ گیا۔ غالباً مرنے والے نے کسی کے نام آخری پیغام بھیجا تھا۔ مگر پھر شاید یہ سوچ کر کہ اسے کون پہنچائے گا یا یہ سمجھ کر کہ "بعد از مرگ من گن فیکوں شد، شدہ باشد" جب ہم نہیں تو پھر کچھ بھی ہوا کرے، کیسا نامہ اور کس کا پیغام اسے چاک کر ڈالا۔ میں ابھی انہیں الٹ پلٹ کر رہا تھا کہ قریب ہی ایک سفید چیز پر میری نظر جا پڑی جو چاندنی کی روشنی میں تیزی سے چمک رہی تھی، میں نے اسے اٹھا لیا۔ یہ چاندی کی ایک پنسل تھی جو آج

تک میرے پاس محفوظ ہے۔ اس پر "ال ئس ٹری اُس" (درخشاں) لکھا ہوا ہے۔ میں اس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ کیونکہ درخشاں کسی کا نام نہیں ہوتا۔

اس حادثہ نے تھوڑی دیر کے لئے میری توجہ کو تمام تر اپنی طرف جذب کر لیا تھا۔ مگر اب میرے خیالات پھر ایک نقطہ پر جمع ہوئے اور ایک منٹ کے بعد میں اسی بلند جگہ پر کھڑا ہوا تھا جہاں سے دریا میں کود کر ایک نامراد نے ابھی ابھی اپنی جان دی تھی میں نے پانی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مرنے والے! لے ایک اور الم نصیب تیری رفاقت کے لئے حاضر ہے" یہ کہہ کر میں نے اپنے چاروں طرف نظر ڈالی، اس سنسان فضا میں افسردہ چاندنی حد درجہ الم انگیز تھی۔ یکایک میری آنکھیں چاند کی طرف اٹھ گئیں اور نہ جانے کیوں وہی دوپہر کا منظر مجسم ہو کر سامنے آگیا "پرسی کلیرا کے قدموں پر دوزانو۔ کلیرا اس پر جھکی ہوئی" مسٹر پریم۔ کیا بتاؤں یہ معلوم ہوا کہ میرے رگ و پے میں کسی نے آگ بھر دی، جوش غضب نے میرے سینہ کو بھٹی بنا دیا۔ آنکھیں جلنے لگیں، جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ خیالات نے پلٹا کھایا، اب ایک اور جذبہ مجھ پر مسلط تھا، میرے ایک ایک رونگٹے سے انتقام کی آواز آرہی تھی، میں نے اپنے جی میں کہا "اوہ! کیسی نادانی! اس آسانی سے حریف کے لئے میدان چھوڑ دیا۔ نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ موت کا سرد ہاتھ مجھ سے پہلے پرسی کے ناپاک وجود سے دنیا کو خالی کر دے گا" میرا تمام بدن آتش انتقام سے پھنک رہا تھا۔ اب میں پھر شہر کی طرف چلا۔ آبادی ابھی دور تھی۔ گہرے بادل آسمان پر چھا گئے، چاند چھپ گیا، تھوڑی دیر میں بارش ہونے لگی۔ قیامت کی سردی تھی، میں بالکل تر ہو گیا تھا۔ سرد ہوا آندھی کی طرح چل رہی تھی، آخر آبادی آگئی، مگر اب کہاں جاؤں، کس جگہ پناہ لوں، بارش کسی طرح نہیں تھمتی، اندھیرا، سردی، آندھی، بارش، بھیگے ہوئے کپڑے، تھکا ہوا جسم، اور خون شدہ دل، اپنی اس وقت کی حالت کن الفاظ میں بیان کروں، آخر سڑک پر ایک پل نظر پڑا جس قدر جلد ممکن ہوا اُس کے

سایہ میں پناہ لی۔ دیوار سے کمر لگا کر زمین پر بیٹھ گیا اور برسی کو جلد سے جلد نابود کرنے کی تدابیر سوچنے لگا۔ سوچتے سوچتے دماغ بھی تھک گیا اور آپ کو یہ سُن کر شاید تعجب ہوگا کہ رات کے آخری حصّہ میں نیند نے مجھ پر غلبہ پایا اور تھوڑی دیر کے لئے تمام جسمانی اور روحانی اذیّتوں سے مجھے آزاد کر دیا، جس وقت آنکھ کھلی مجھے خوب بخار چڑھا ہوا تھا۔ رات ابھی کچھ باقی تھی۔ لوگ کہتے ہیں مصیبت میں خدا یاد آتا ہے، میں کہتا ہوں مصیبت میں سچّا دوست یاد آتا ہے۔ اگرچہ سچا دوست خود ایک بڑی حد تک خدا کی طرح اسم بے مسمیٰ ہے، تاہم معدوم محض نہیں، اور میرے نزدیک اس کا وجود انسان کے لئے خدا سے کہیں زیادہ مفید ہے۔ میرا بھی لندن میں ایک دوست تھا، سچا اور حقیقی دوست مخلص اور صمیمی دوست، مرحوم کا نام ڈیوڈ تھا۔

"اچھا، تو اُن کا انتقال ہو گیا؟" میں نے پوچھا۔

ہاں، ڈیوڈ نے وطن اور قوم کے لئے اپنے آپ کو قربان کر دیا۔ وہ فارن ڈیپارٹمنٹ میں ایک ممتاز عہدہ پر مامور تھا۔ مگر جنگ عظیم میں اس نے فرانسیسی محاذ جنگ پر مردانگی کے جوہر دکھا کر وطن کے سچے پرستاروں کی طرح لڑتے لڑتے جان دیدی، بہرحال اس وقت مجھے ڈیوڈ یاد آیا۔ شادی کے تھوڑے ہی دنوں بعد ڈیوڈ کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا، اُس نے دوسری شادی نہیں کی، ملازمت کے سلسلہ میں اکثر اسے ممالک متارجہ میں رہنا پڑتا تھا۔ اس لئے انتہائی یگانگی کے باوجود مدّتوں مجھ سے ملاقات نہیں ہوتی تھی، اس کا آخری خط فرانس سے آیا تھا اور اس بات کو ایک مہینہ سے زیادہ مدّت گذر چکی تھی۔ اس کے لندن میں موجود ہونے کا مجھے یقین نہ تھا۔ تاہم اس کا دروازہ ہر وقت میرے لئے کھلا ہوا تھا، ڈیوڈ کی غیر موجودگی میں گھر کی حفاظت کے لئے اُس کے باپ کے وقت کا ایک بوڑھا ملازم آسکر رہتا تھا۔ آسکر مجھے اچھی طرح جانتا تھا اور میرے اور ڈیوڈ کے تعلقات سے بھی واقف تھا۔ بہرحال میں ڈیوڈ سے ملنے کی اُمید

ہیں اور بہر صورت اُس کے مکان پر عارضی قیام کے ارادہ سے چل کھڑا ہوا۔ خوش قسمتی سے ڈیوڈ گھر پر موجود تھا۔ مگر ابھی تک سویا ہوا تھا۔ میری اور آسکر کی باتوں کی آواز سے یا پیروں کی آہٹ سے اُس کی آنکھ کھل گئی، اُس نے میری آواز پہچان لی، اور خلافِ اُمید ایسے ناوقت میرے آنے سے گھبرا کر بستر سے نکل آیا۔ میری حالت دیکھی، تمام کپڑے پانی میں شرابور۔ جابجا خاک اور مٹی لگی ہوئی۔ آنکھیں سرخ، چہرہ پر مُردنی چھائی ہوئی، ڈیوڈ کے مُنہ سے بے ساختہ نکلا "اوہ خدا" ایڈی یہ کیا ؟" اور بڑھ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ میرا تمام جسم بخار کی حرارت سے انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ ڈیوڈ سخت پریشان ہوا۔ میں نے کہا "گھبراؤ نہیں۔ سب خیریت ہے" ڈیوڈ نے مزید استفسار کے بغیر پہلا کام یہ کیا کہ میرے بھیگے ہوئے کپڑے اُتروائے اور اپنا ایک سلیپنگ سوٹ پہننے کے لئے دیا۔ اس کے بعد بیڈ روم میں آگ روشن کرائی اور مجھے اپنے بستر پر لٹا کر لحاف اُڑھا دیا۔ میں انتہا سے زیادہ خستہ ہو رہا تھا، بخار نے اور بھی نڈھال کر دیا تھا، نرم اور گرم بستر پر لیٹتے ہی پھر نیند آ گئی اور کئی گھنٹے سویا۔ اُٹھا تو دیکھا کہ ڈیوڈ مجھ پر جھکا ہوا میری نبض دیکھ رہا ہے۔ پوچھا کیا حال ہے، میں نے کہا اچھا ہوں، کہا ڈاکٹر کو بلایا ہے؛ ابھی آتا ہوگا، میں نے کہا ڈاکٹر کی ضرورت نہیں، کہا خیر! کیا مضائقہ ہے تھوڑی دیر میں ڈاکٹر آ گیا۔ نبض دیکھی، حال پوچھا، نسخہ لکھا اور بہت جلد تندرست ہو جانے کی اُمید دلا کر رخصت ہوا۔ دو روز تک مجھے بخار کی تکلیف رہی۔ تیسرے دن طبیعت سنبھل گئی۔ مگر کمزور ہو گیا۔ چار دن کے بعد ڈیوڈ نے پھر استفسار حال کیا۔ اور میں نے سب کم و کاست تمام واقعات اُسے سُنا دیئے اور اپنا ارادہ بھی بتا دیا کہ جب تک انتقام نہ لوں گا مجھے چین نہ آئے گا اور میری بربادی کی قیمت پرسی کو اپنی جان سے ادا کرنی پڑے گی۔

ڈیوڈ نے میری حالت پر بہت افسوس اور ہمدردی کا اظہار کرنے کے بعد اپنے

مخصوص متین انداز میں کہا :-

"ایڈی ! میں تمہیں تمہارے ارادوں سے باز رکھنا نہیں چاہتا۔ مگر ایک خواہش ہے اگر پورا کرنے کا وعدہ کرو تو کہوں"

"وعدہ ! خوب ! کیا وعدہ لئے بغیر تمہیں اُمید نہیں کہ میں تمہاری خواہش کو پورا کروں گا ڈیوڈ ! کیا واقعی تم مجھے اتنا ذلیل سمجھتے ہو ؟" میں نے متاسفانہ لہجہ میں کہا۔

نہیں ایڈی غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔ میرا مقصد صرف تمہیں پورے طور پر متوجہ کرنا تھا۔ اچھا، تو سنو ! بات معمولی ہے۔ خواہش صرف یہ ہے کہ جو کچھ میں اس وقت تم سے کہنا چاہتا ہوں اُسے پوری توجہ کے ساتھ سنو، اچھی طرح اس پر غور کرو اور دیکھو کہ اس میں کہاں تک صداقت ہے، اس کی اہمیّت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ فیصلہ میں عجلت خوب نہیں۔ کم سے کم ایک ہفتہ اس بارہ میں میرے ساتھ تبادلِ خیال کرو۔ اس کے بعد جس طرف تمہاری عقلِ سلیم رہنمائی کرے مختار ہو"

یہ کہہ کر ڈیوڈ خاموش ہو گیا۔ میں ڈیوڈ کی دانشمندی اور معاملہ فہمی کا ہمیشہ سے قائل تھا، اُس نے فلسفیانہ دماغ پایا تھا۔ اس کی اکثر باتیں عام مسلمات کے خلاف ہوتی تھیں مگر جس وقت وہ انہیں بیان کرتا تھا تو اس یقین و اذعان کے ساتھ گویا حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، پھر اس کی قوتِ استدلال اس قدر زبردست اور اندازِ بیان ایسا دلاویز تھا کہ سننے والے کو اس کی بات تسلیم کر لینے کے سوا چارہ ہی نہ تھا۔ میں نے کہا "اچھا تو چُپ کیوں ہو گئے۔ جو کچھ کہنا ہے کہو"

"سنو"، اُس نے پھر کہنا شروع کیا "محبت جبر سے نہیں ہوتی۔ جب کلیرا تمہاری طرف مائل ہوئی۔ پرسی کے برسوں کے تعلّقات اُسے تمہارے ساتھ وابستہ ہو جانے سے نہ روک سکے، اسی طرح اب اگر کسی وجہ سے اُس کا جی تم سے سیر ہو گیا ہے اور پرسی نے اُسے رام کر لیا تو اب دنیا کی کوئی طاقت اُس کی محبّت کو تمہاری طرف واپس

نہیں لاسکتی، پہلے تم نے خود کو ہلاک کرنے کا ارادہ کیا، وہ بھی سراسر غلط، جان دیتے ہو کس کے لئے؟ ایک خائن، غدار عورت کے لئے جس کی محبت کچے رنگ کی طرح ناپائدار ثابت ہوئی، جان دو اُس کے لئے جو تم پر جان دیتا ہو۔ جان دو اُس کے لئے جو تمہاری قربانی کی قیمت کا اندازہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ اب تم نے پرسی کی جان لینے کا فیصلہ کیا ہے، یہ بھی سرتاسر غلط۔ دیکھو، پرسی وہی پرسی ہے جسے چھوڑ کر کلیرا نے تمہارے ساتھ عقد محبت اور پیمانِ وفا باندھا، آج پرسی بدل نہیں گیا۔ اس کی کامیابی۔ اگر تم اُسے کامیابی کہہ سکتے ہو تو خود اُس کی کوششوں کا نتیجہ نہیں، کلیرا کی نسوانی کمزوری اور فطری تلون اس کا ذمہ دار ہے، پھر اگر میرا عقیدہ پوچھو تو میں کلیرا کو بھی کچھ ایسا مجرم نہیں سمجھتا۔ آخر انسان اپنی اُفتادِ طبیعت کو کیا کرے، بادی النظر میں تمہیں یہ بات بعید از عقل معلوم ہوگی مگر حقیقت یہی ہے کہ انسان اپنے کسی فعل کا مختار نہیں، وہ مجبور ہے اور مجبور محض، خواہش ارادہ، اور اختیار محض مغالطہ میں ڈالنے والے الفاظ ہیں، ان کا مفہوم جو تم سمجھتے ہو وہ ہرگز نہیں، ذرا سوچو تو سہی، تمہاری خواہش اور ارادہ کا خالق کون ہے؟ جب تک کوئی خارجی تحریک نہ ہو، جب تک بیرونی اسباب اپنا اثر نہ ڈالیں، تمہارا کوئی ارادہ وجود میں نہیں آسکتا۔ جب یہ صورت ہے تو پھر اختیار کہاں رہا، اور جب اختیار باقی نہیں، تو پھر کسی کو مجرم ٹھیرانا کہاں کا انصاف ہے، بات باریک ہے، مگر ناقابل فہم نہیں، غور کروگے تو میرے قول کی تائید کرنی پڑے گی اور تمہیں اپنے فیصلوں کی غلطی معلوم ہو جائے گی۔ بس مجھے یہی کہنا تھا"۔

آٹھ دن گذر گئے ڈیوڈ کی باتوں پر میں نے جتنا زیادہ غور کیا اُتنی ہی وہ زیادہ صحیح معلوم ہوئیں۔ میری طبیعت میں اب وہ ہیجان نہ تھا۔ مگر کلیرا کی یاد کسی طرح نہ بھولتی تھی، ڈیوڈ کو یکایک پیرس جانا پڑا۔ چار دن کے بعد واپس آیا۔ اُس روز شام کی چائے

ہم نے ساتھ پی۔ میری حالت پہلے سے بہتر تھی۔ مگر ذہنی خلفشار سے نجات نہیں ملی تھی، ایک ہی نظر میں ڈیوڈ نے میری اندرونی حالت کا مطالعہ کرلیا، اس نے نہایت محبت آمیز لہجہ میں کہنا شروع کیا:۔

بس اب اس بارہ میں سوچنا بند کردو۔ ایک بھیانک خواب تھا جو تمام ہوگیا اور اب پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ کچھ کام کرنا چاہیئے! ایسا کام جو تمہیں زندۂ جاوید بنادے انفرادی خوشی کے سنہرے جال میں پھنسے رہنا صرف پست ذہنیتوں کے لئے مخصوص ہے لیکن تمہاری سطح اس سے کہیں بلند ہے۔ قوم پر آج وقت پڑا ہے، ذاتی مسرتوں اور غموں کو فراموشی کی چادر میں لپیٹ کر قلب کی اتھاہ گہرائیوں میں دفن کردو۔ مادر وطن تمہیں مدد کے لئے پکار رہی ہے۔ اٹھو اور جواب دو۔ زبان سے نہیں عمل سے۔ میں نے تمہارے لئے ایک راہ نکالی ہے اور وہی تمہارے درد کا واحد علاج ہے کسی طرح نہ بھولنے والے غم، کسی طرح نہ بھرنے والے دل کے زخم، اور کسی طرح نہ مٹنے والی خلش کا بہترین مداوا سفر ہے۔ ایسا سفر جو منشائے ملال سے بہت دور لے جائے، ایسا سفر جس سے جلد واپسی کی اُمید نہ ہو۔ سیکرٹ سروس کے لئے ہمیں چند ایسے بلند حوصلہ اور قابل اعتماد سرفروشوں کی ضرورت ہے جو مادی معاوضہ کی خاطر نہیں بلکہ ملک وملّت کی آزادی و حرّیت کو برقرار رکھنے کے لئے جان کی بازی لگانا ایک کھیل سمجھتے ہیں۔ اور موت کا ہلاکت بار چہرہ بھی اُنہیں اپنے مقدّس مقصد کی تکمیل سے باز نہیں رکھ سکتا۔ کام نازک اور خطرناک ہے، مگر میں تمہیں ہر طرح اس کا اہل پاتا ہوں، پھر تمہارے ذاتی مصالح بھی اس کے مقتضی ہیں، اسی لئے میں نے تم سے استمزاج کئے بغیر اس خدمت کے لئے تمہارا نام، انتخاب کرنے والی کمیٹی کے سامنے پیش کردیا ہے، اُمید ہے کہ تم مجھے مایوس نہ کروگے!! یہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔ وہ میرے جواب کا منتظر تھا۔ ڈیوڈ کی تقریر، صداقت، حب الوطنی، دوست پرستی اور شرافت کے جذبات سے اس درجہ لبریز اور اثر میں اس قدر ڈوبی ہوئی تھی کہ ذرا سی دیر میں

اُس نے میرا زاویۂ نگاہ ہی بدل دیا۔ میرے اندر ایک نئی روح پھونک دی۔ خدمتِ وطن کا احساس جس سے میں آج تک بیگانہ تھا یکایک میری روح پر چھا گیا۔ میرے دل کے زخم ابھی سے بھرنے شروع ہو گئے، دل میں ایک ولولہ تھا، اُمنگ تھی، حوصلہ تھا، بالکل ایک نئی دنیا پیشِ نظر تھی۔ میں نے ڈیوڈ کا ہاتھ کھینچ کر اپنے ہونٹوں اور آنکھوں سے لگایا اور کہا:۔

"آہ! ڈیوڈ میں کس طرح تیری محبت کا شکریہ ادا کروں۔ تو نے مجھے زندہ کر دیا"

دو ہی دن کے بعد میں اپنے عہدہ کا چارج لے کر مصر روانہ ہو گیا، کچھ مدت مصر میں قیام کے بعد مجھے جرمن ایسٹ افریقہ جانا پڑا، ایک مدت تک میں نے مخبر اور جاسوس کی خدمات کامیابی کے ساتھ انجام دیں، بڑے بڑے خطرات کا سامنا ہوا اور غالباً میں اس لئے بچ گیا کہ مجھے اپنی زندگی کی کچھ بہت زیادہ پروا نہ تھی، یہ سب کچھ تھا مگر کلیرا کی یاد پھر بھی فراموش نہ ہوئی، یہ زخم نہ بھرنا تھا نہ بھرا، جب کوئی دلفریب منظر دیکھتا کلیرا کی یاد آتی، پھول اور سبزہ ہمیشہ مجھے کلیرا کی یاد دلاتے، مستانہ خرام دریا، سربفلک پہاڑ، سیمابی آبشار، تاروں بھری رات، سمندر میں ڈوبتا ہوا سورج، بادلوں میں چھپتا اور نکلتا ہوا چاند، شفق اور دھنک، حسین اور دلربا صورتیں، غرض کون سی چیز تھی جس میں کلیرا کی تصویر مجھے نظر نہیں آتی تھی، خصوصاً چاندنی راتیں مجھے اکثر رُلاتی تھیں اور میں آپ ہی اپنا رازدار تھا"

"مجھے اس وقت اپنا ایک شعر یاد آ گیا جس میں ٹھیک اسی حالت کو بیان کیا گیا ہے"
میں نے کہا۔

"کیا؟" مسٹر براؤن نے پوچھا۔

"رُلاتی ہے مجھے کیوں چاندنی رات — یہی اِک راز میری زندگی ہے"

میں نے یہ شعر پڑھا اور اس کا انگریزی ترجمہ مسٹر براؤن کو سُنایا۔

"خوب تو آپ بھی اس کا ذائقہ چکھ چکے ہیں" مسٹر براؤن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"صرف تخیل میں" میں نے ہنس کر جواب دیا۔

میں یہ کہہ ہی رہا تھا کہ مسز براؤن آگئیں اور آتے ہی کہا کہ چائے تیار ہے، میں نے کہا، آیوا اور فریدی کا بھی تھوڑی دیر انتظار کرلیں، وہ لوگ بھی اب آتے ہی ہوں گے۔

مسز براؤن نے کہا "اچھا" اس کے بعد میں نے پھر مسٹر براؤن سے کہا: -

"ہاں - آپ اپنی داستان جاری رکھیئے"

"خوب! داستان ہو رہی ہے" مسز براؤن نے آتش دان میں کوئلہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں آپ ہی کا ذکر خیر تھا" میں نے جواب دیا۔

"افریقہ پہنچنے کے بعد کا سب سے اہم واقعہ مختصر طور پر اس روز میں آپ کو سنا ہی چکا ہوں اور تمام حالات کی تفصیل کے لئے تو ایک عمر چاہیئے" مسٹر براؤن نے بظاہر اس موضوع سے گریز کرتے ہوئے کہا، میں نے اندازہ کیا تھا کہ وہ مسز براؤن کی موجودگی میں اپنے واقعات کو بیان کرنے سے پہلو تہی کرتے تھے، اس لئے میں نے بھی اس وقت اصرار نہیں کیا اور سوچا کہ پھر کبھی تنہائی میں باقی حالات سن لوں گا، بہر حال میں نے اُن سے کہا: -

"اچھا وہ پنسل تو ذرا دکھایئے"

"ابھی لاتا ہوں" یہ کہہ کر مسٹر براؤن پنسل لینے کے لئے چھت پر اپنے کمرہ میں چلے گئے۔

"کیسی پنسل؟"، مسز براؤن نے پوچھا۔ میں نے مختصر الفاظ میں مسٹر براؤن کی بیان کی ہوئی روداد دُہرا دی، اتنے میں مسٹر براؤن ایک چاندی کی پنسل ہاتھ میں لئے ہوئے آئے پنسل واقعی بہت خوبصورت تھی، اُسے دیکھ کر مسز براؤن کے منہ سے بے اختیار "اوہ" نکل گیا۔ اُنہوں نے اور کچھ نہ کہا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یکایک اُن کے قلب کو ایک دھچکا پہنچا۔ وہ کوچ پر بیٹھ گئیں اور اپنے نیچے کے ہونٹ کا سرا دانت سے دبا کر ایک لمبی ٹھنڈی سانس بھری، سردی کے باوجود اُن کی پیشانی پر پسینہ کے ننھے ننھے قطرے چمکنے لگے، میں حیران تھا کہ پنسل کو دیکھ کر مسز براؤن اس درجہ کیوں متاثر ہوگئیں، مسٹر براؤن کو معلوم نہ تھا کہ میں مسز براؤن کو پنسل کا قصہ سنا چکا ہوں اور اُنہیں معلوم بھی ہوتا تو غالبًا

میری طرح وہ بھی کچھ نہ سمجھ سکتے۔ بہرحال وہ گھبرا گئے اور ایک اضطراب کے ساتھ اُنہوں نے مسٹر براؤن سے پوچھا:۔

"کیوں۔ خیر تو ہے؟"

"ہاں میں بالکل اچھی ہوں" مسٹر براؤن نے غم انگیز لہجہ میں جواب دیا۔ اس کے بعد پھر ایک بار آہ کی اور کہا "بدنصیب پرسی!"

اب میں سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو یہ پنسل پرسی کی ہے اور اُس روز شب کو خودکشی کرنے والا یقیناً پرسی کے سوا کوئی اور نہ تھا۔

"پنسل کا قصہ میں ابھی ابھی مسٹر براؤن کو سُنا چکا ہوں" میں نے مسٹر براؤن سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

"کیا یہ پنسل پرسی کی ہے؟" مسٹر براؤن نے مسز براؤن سے پوچھا۔

مسز براؤن نے سر کی جنبش سے اشارۃً تصدیق کیا۔

"تم نے کیسے جانا؟" مسٹر براؤن نے مکرر سوال کیا۔

"میں نے ہی یہ پنسل اُس نامراد کو دی تھی" مسز براؤن نے پنسل کو میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

یہ سُن کر مسٹر براؤن ایک سناٹے میں آ گئے۔ میں نے پنسل کو اُٹھا لیا اور مسز براؤن سے خطاب کرتے ہوئے کہا:۔

"مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اس پر "ال نس ٹری اس" (درخشاں) لکھا ہے جو نہ آپ کا نام ہے نہ پرسی کا!"

"یہ مرنے والے کی جدت ہے جس وقت میں نے اُسے یہ پنسل دی رات کا وقت تھا بجلی یکایک گل ہو گئی۔ میں اندھیرے سے گھبرائی اور میں نے پرسی سے کہا "تمہیں اندھیرے سے اُلجھن نہیں ہوتی" اُس نے کہا "اندھیرے سے اُلجھن! مگر اندھیرا ہے کہاں؟ مجھے تو روشنی ہی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ کیا تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ جہاں تم موجود ہو

وہاں اندھیرا نہیں ہو سکتا ۔ تم جانتی ہو "کلیرا" کے کیا معنی ہیں ؟" میں نے کہا "نہیں تو"
وہ بولا "کلیرا کے معنی ہیں ، اِل لس ٹری اس" (درخشاں) اور "برائٹ" (تاباں)
اتنے میں روشنی آگئی ، اُس نے کہا "اگر تم اجازت دو تو میں اس پنسل پر " درخشاں ،
کھُدوا لوں ، مجھے یہ لفظ اپنے روشن مستقبل کے لئے ایک مبارک فال معلوم ہوتا ہے
میں نے کہا "تمہیں اختیار ہے"

مسز براؤن یہیں تک کہنے پائی تھیں کہ آیوا اور فریدی آ گئے ۔ دونوں کے چہروں سے کچھ رنج کچھ غصّہ کے آثار نمودار تھے معلوم ہوتا تھا کہ آپس میں جنگ ہوئی ہے ۔ فریدی نے آتے ہی کہا "پریم جلدی چلو ۔ مجھے ایک دوست سے ملنا ہے ۔ پانچ بجے کا وعدہ ہے" مسز براؤن نے کہا "چائے تو پی لو ۔ ہم لوگ تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے ، مگر فریدی کے سر پر تو اس وقت غصّہ کا بھوت سوار تھا ، کس کی سُنتے ، نہ مانے اور مجھے بھی اُٹھا لائے ۔

سچی کہانی

(پارل اور پال)

جہانگیر نگر گرلز ہائی اسکول کی جُبلی منائی جانے والی تھی۔ ہماری یونیورسٹی کے سب پروفیسروں کے نام دعوت نامے آئے تھے بعض وجوہ سے میں اس جلسہ میں شریک ہونا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اسکول کی پرنسپل مس بوس نے دعوتی کارڈ کے علاوہ ایک پرائیویٹ خط بھی مجھے لکھا اور جلسہ میں شریک ہونے کی بہت تاکید کی۔ چند سال قبل کشمیر کی سیاحت کے دوران میں وہ میری ہم سفر رہ چکی تھیں۔ میں بیمار ہو گیا تھا۔ اُنہوں نے میری تیمارداری کی تھی۔ اُن کی مہربانیاں مجھے یاد تھیں۔ ناچار اپنی خواہش کے خلاف میں جلسہ میں شریک ہوا۔

مس بوس ابھی تازہ ولایت تھیں۔ اسکول کا چارج لئے تھوڑا ہی زمانہ ہوا تھا شہرت اور ہردلعزیزی حاصل کرنے کے لئے وہ جلسہ کو بہت زیادہ شاندار اور کامیاب بنانا چاہتی تھیں۔ شہر کی کوئی ممتاز ہستی ایسی نہ تھی جسے مدعو نہ کیا گیا ہو۔ معزز حضرات و خواتین کا اتنا عظیم الشان اجتماع اسکول کی ۲۵ سالہ زندگی میں پہلا موقع تھا۔ یوں تو مس بوس کی

خوش ذوقی اور سلیقہ مندی ہر چیز سے ظاہر تھی مگر خصوصیت کے ساتھ اسٹیج بہت ہی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔

تفریحات (ENTERTAINMENTS) کا پروگرام شروع ہوا۔ گھنٹی بجی۔ پردہ اٹھا اور ایک خوب رو دوشیزہ زریں حاشیہ کی سرخ ساڑی پہنے شعلۂ جوالہ بنی ہوئی سامنے آئی۔ اسکول کی سیاہ فام میٹرن مس وہائٹ (MISS WHITE) نے حاضرین سے تعارف کرایا "مس پارل سین!" پارل نے کرسی پر بیٹھ کر بنگلہ زبان میں ایک گیت گانا شروع کیا۔ آن واحد میں فضا نغموں سے گونج رہی تھی۔ پارل کی آواز بہت ہی پیاری تھی جس وقت وہ تان لیتی، معلوم ہوتا کہ بجلی کوند گئی۔ ہال بڑا تھا۔ حاضرین کی تعداد کثیر تھی، مگر ایسا کامل سکوت طاری تھا۔ اور لوگ اس طرح بے حس و حرکت بیٹھے تھے کہ گویا کرسیوں پر بے روح سنگین مجسمے رکھے ہوئے ہیں۔ ہر شخص ہمہ تن گوش تھا حسن، جوانی، اور تندرستی کا اجتماع یوں ہی کیا کم قیامت ہوتا ہے کہ اس میں سحر نغمہ بھی شامل ہو جائے کون تھا جس کا سر نیاز اس وقت عالم خیال میں پارل کے قدموں پر جھکا ہوا نہ تھا کوئی اعتراف نہ کرے گا۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ اس وقت بہت سے دل زور زور سے دھڑک رہے تھے۔

میرے برابر والی کرسی پر مدھو پور کا نوجوان رئیس اجیت کمار سین بیٹھا ہوا تھا اور اس کے برابر اس کا سکریٹری رنجو بابو۔ اجیت کے باپ کو مرے ابھی ۶ ہی مہینے ہوئے تھے۔ شہر میں جابجا اس کی آوارگیوں کے چرچے تھے۔ آزادی، جوانی، دولت اور بری صحبت بڑی تیزی کے ساتھ اسے تباہی کی طرف کھینچے لئے جا رہی تھیں۔ خاندانی وقار اور بزرگوں کی عزت کے طفیل اسے ایسے پبلک جلسوں اور دعوتوں میں شریک کر لیا جاتا تھا۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اس کی بداطواریوں کے باعث لوگ اس سے دور ہی رہنا پسند کرتے تھے۔ مدھو پور ایک چھوٹی جگہ ہے۔ وہاں رنگ رلیوں کے سامان کہاں،

اس لیے اجیت نے کئی مہینے سے جہانگیر نگر میں ڈیرے ڈال دیئے تھے۔

پارل کے حسن و شباب اور جادو بھری آواز نے قہر کیا۔ اجیت کے جذبات شہوانی بری طرح مشتعل ہو گئے۔ وہ رہ رہ کر سسکیاں لیتا اور اپنا ہونٹ کاٹتا تھا۔ اس کی اس حالت نے بے اختیار مجھے اس کی طرف متوجہ کر دیا۔ اُف توبہ! کس بری طرح وہ پارل کو گھور رہا تھا جس طرح ایک گرسنہ درندہ اپنے شکار پر جھپٹنے کی تیاری کر رہا ہو۔ اس کا اگر بس ہوتا تو وہ اسی وقت پارل کو اسٹیج پر سے اٹھا لیجاتا۔ اور........ آخر اس نے رجو بابو کی طرف جھک کر آہستہ سے کچھ کہا۔ رجو نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ ایک شیطانی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔ پھر اس نے بھی آہستہ اجیت سے کچھ کہا۔ دو ایک لفظ میں نے بھی سنے مگر مطلب سمجھ میں نہ آیا۔ خدا جانے کیوں یکایک میرے دل میں یہ خیال آیا کہ ضرور یہ بدمعاش کوئی مجرمانہ منصوبہ گانٹھ رہے ہیں۔ پارل نے گیت ختم کیا پردہ گرا۔ تالیوں کے شور سے کتنی ہی دیر تک ہال گونجتا رہا۔ اجیت اور رجو اسی وقت جلسہ سے اٹھ کر چلے گئے۔ پارل کا وہ گیت ایسا مقبول ہوا کہ گھر گھر گایا جانے لگا۔ کبھی کبھی میں نے سڑک پر لڑکوں کو بھی وہ گیت گاتے سنا۔

اس واقعہ کو کئی مہینے گذر گئے۔ گرمیوں کی تعطیل میں شہر کے اسکول، کالج اور ہماری یونیورسٹی سب تعلیمی ادارے بند ہو گئے۔ بعض مجبوریوں سے میں اس مرتبہ وطن نہ جا سکا، چھٹیاں یہیں گذاریں۔ یونیورسٹی کھلنے میں ابھی کئی دن باقی تھے۔ ہندو بورڈنگ ہاؤس کے ایک ٹیوٹر مسٹر دت نے مجھے چاء پر بلایا۔ سرشام لوٹتے ہوئے جس وقت میں بورڈنگ ہاؤس کے کمپاؤنڈ میں سے گذر رہا تھا میں نے لڑکوں کا ایک غیر معمولی اجتماع دیکھا قریب پہونچ کر میں نے ایک لڑکے سے جسے میں اچھی طرح جانتا تھا پوچھا "کیا قصہ ہے بابو؟"

"ایک نہایت شرمناک۔ نہایت اندوہناک واقعہ جناب" اُس نے نہایت غم و غصے کے لہجہ میں جواب دیا۔ اور اپنے ایک ساتھی سے بنگلہ زبان کا ایک اخبار لے کر پڑھنا شروع کیا سب لڑکے کھڑے خاموش سُن رہے تھے۔

"ایک دوشیزہ کی بے ناموسی۔ اتوار کی رات کو پچھلے پہر، کئی مسلح نقاب پوش مسٹر تارک ناتھ سین، ہیڈ ماسٹر مدھوپور کے مکان میں داخل ہو گئے اور اُن کی جوان لڑکی کو جو گرمیوں کی تعطیل میں اسکول سے گھر آئی ہوئی تھی۔ اُس کے خواب گاہ میں سے اٹھا لے گئے ہیڈ ماسٹر سین کا ملازم ان لوگوں سے ملا ہوا تھا۔ اُس نے یا تو مکان کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا یا وقت مقررہ پر کھول دیا۔ لڑکی اپنے کمرہ میں بے خبر سوئی ہوئی تھی۔ ایسی خاموشی سے ان لوگوں نے اپنا کام انجام دیا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ علی الصباح جب مسٹر سین کی آنکھ کھلی تو مکان کا دروازہ کھلا پایا۔ گھبرا کر اُٹھے تو دیکھا لڑکی غائب اُنہوں نے کو آواز دی تو اُس کا بھی پتہ نہیں۔ خادمہ سے پوچھا اُس نے اپنی لاعلمی ظاہر کی۔ اُسی وقت تھانے میں رپٹ لکھائی۔ پولیس نے خادمہ کو حراست میں لے لیا۔ ڈرانے دھمکانے سے آخر اُس نے اقرار کر لیا کہ "رات تین بجے کئی آدمی چھرے لئے ہوئے گھر میں گھس آئے، میں جاگ رہی تھی، ایک آدمی نے چھرا میرے سینے پر رکھ دیا اور کہا کہ آواز نکالی تو مار ڈالوں گا۔ میں سہم گئی، وہ لوگ لڑکی کو اُٹھا لے گئے اور چلتے وقت مجھ سے کہہ گئے کہ اگر کسی کو کچھ حال بتایا تو کل رات کو تیرا خاتمہ کر دیں گے۔ جوتن (ملازم) بھی اُن لوگوں کے ساتھ چلا گیا۔" پولیس نے لڑکی کی تلاش شروع کی۔ آبادی سے دور ایک کسان نے لڑکی کو ایک کھیت میں بے ہوش پڑا پایا۔ اُس نے تھانے میں اطلاع کی اور پولیس کی مدد سے لڑکی نیم مردہ حالت میں اپنے گھر پہونچائی گئی۔ بدنصیب معصوم لڑکی کسی گہری سازش کا شکار ہوئی ہے جس میں کسی بڑے دولت مند کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے"

پال کی آنکھیں اور چہرہ بتا رہے تھے کہ وہ اس واقعہ سے حد درجہ متاثر ہوا ہے

اُس نے نہایت حقارت اور نفرت کے لہجہ میں کہا:۔
"پروفیسر صاحب! یہ ہیں ہمارے دولت مندوں کے کرتوت!"
میں نے کہا" افسوس! اس منحوس واقعہ سے بے چاری کی ساری زندگی تباہ ہوگئی اب کون اُس سے شادی کرنا گوارا کرے گا؟"
"مگر اس کا قصور؟" پال نے مجھ سے سوال کیا۔
"قصور ہو یا نہ ہو مگر واقعہ بہرحال واقعہ ہے۔ کیوں کوئی ایک آلودہ دامن لڑکی کو اپنا رفیق زندگی بنائے" میں نے جواب دیا۔
"تو آپ کا یہ مطلب ہے کہ مجرموں کے گناہ کی سزا ایک معصوم کو ملنی چاہئے" پال نے کسی قدر جھلا کر کہا۔
"اب جو بھی سمجھو"
"مگر یہ تو سراسر ظلم ہے"
"پال جذبات کی دنیا میں منطق کی دلیلیں کام نہیں دیتیں۔ سبب کچھ بھی ہو، مگر جو لڑکی گوہر عصمت کھو چکی وہ سوسائٹی میں کسی اعزاز و احترام کی مستحق نہیں"
پال میرے الفاظ سے کچھ اور بھی برافروختہ ہوگیا۔ وہ غصّہ کے مارے دانت پیس رہا تھا۔ اُس نے کہا:۔
"معاف فرمائیے پروفیسر صاحب! آپ نے عصمت کے معنی غلط سمجھے ہیں عصمت نام ہے گناہ سے باز رہنے کا اور انسان کا کوئی فعل گناہ نہیں ہوسکتا جب تک اس کی خواہش، اختیار، اور ارادہ کو اُس میں دخل نہ ہو عصمت کوئی گنا نہیں ہے کہ چور چرا لے جائے یا کوئی زبردستی چھین لے عصمت نام ہے نیکی کا، دل کی پاکی کا، کیا انسان کی اخلاقی صفات بھی کوئی کسی سے بجبر چھین سکتا ہے؟ پھر گوہر عصمت چھن جانے کے کیا معنی؟ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ وہ آج بھی ویسی ہی معصوم، ویسی ہی با عصمت ہے جیسی اس

منحوس حادثہ سے پہلے تھی۔"

"تم جو کچھ بھی سمجھو لیکن ہماری سوسائٹی کا قانون تو ایسا سمجھنے کی اجازت نہیں دیتا۔"

"لعنت بھیجئے سوسائٹی کے ایسی قانون پر جو ایک معصوم کو گناہ گار اور بے قصور کو مجرم گردانتا ہے۔"

"پال! سوسائٹی کے قانون پر لعنت بھیجنے سے تم سوسائٹی کے اخلاق و جذبات کو نہیں بدل سکتے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ کسی معزز اور شریف گھرانے کا کوئی باغیرت لڑکا اس بدبخت لڑکی سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جائے گا؟"

"معزز اور شریف گھرانے کا حال تو مجھے معلوم نہیں نہ میں روایتی غیرت مندی سے واقف ہوں، ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اگر اس کے باپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اس کے ساتھ شادی کرنے کو تیار ہوں۔" سب لڑکے حیران ہو کر پال کی طرف دیکھنے لگے۔ میں نے کہا:-

"پال ابھی تم جوان ہو، جذبات کے جوش میں ایسا کہہ رہے ہو، شاید کل تک تمہاری رائے بدل جائے۔"

"نہیں جناب! خوش قسمتی یا بدقسمتی سے میں اتنا "باغیرت" نہیں ہوں کہ معزز سوسائٹی کے جابرانہ آئین کی حمایت میں آنکھ بند کر کے اپنے ضمیر اور یقین دونوں کا خون کر دوں۔" پال نے نہایت پرجوش لہجہ میں جواب دیا۔

پال فلسفہ کا طالب علم تھا۔ اس کے ایم، اے کے آخری امتحان میں صرف ایک مہینہ باقی تھا۔ اس واقعہ کے دو تین دن بعد میں نے سنا کہ وہ بورڈنگ ہاؤس چھوڑ کر چلا گیا۔ پال ایک معزز خاندان کا لڑکا تھا۔ اس کے والد مسٹر این، سی پال جو حال ہی میں منصفی کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے تھے، اچھی خاصی شہرت کے مالک

تھے۔ پال سیدھا مدھو پور پہونچا اور مسٹر سین سے درخواست کی کہ میں آپ کی لڑکی سے شادی کرنی چاہتا ہوں۔ پال کے والد کچھ دنوں مدھو پور میں بھی منصف رہ چکے تھے اور مسٹر سین کو بحیثیت وکیل، بارہا اُن کی عدالت میں پیش ہونے کا اتفاق ہوا تھا جب انہیں معلوم ہوا کہ پال منصف صاحب کا اکلوتا بیٹا ہے تو انہیں بے انتہا مسرت ہوئی۔

پال کی شکل و صورت، تندرستی، تعلیم، خاندانی وجاہت کوئی چیز ایسی نہ تھی جو اُس کی درخواست کے لئے ایک زبردست سفارش نہ سمجھی جائے مگر مسٹر سین نے تین دن تک کوئی جواب نہ دیا اور کسی نہ کسی حیلہ سے ٹالتے رہے۔ آخر چوتھے دن صبح کو انہوں نے پال کو تنہا اپنے کمرے میں بلایا اور کہا:۔

"پال! میرے جواب کا انتظار کرتے کرتے تم تنگ آ گئے ہو گے۔ مجھے اس کا نہایت افسوس ہے۔ مگر میں اُس دن سے آج تک برابر اسی امر پر غور کرتا رہا ہوں کہ تمہاری بات کا کیا جواب دوں۔ یقین مانو کہ تم جیسا لائق، شریف اور سعادت مند داماد اگر مجھے مل جائے تو میں اسے اپنی انتہائی خوش قسمتی سمجھوں اور میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ تم میرے ہو جاؤ۔ مگر افسوس کہ بعض وجوہ سے میں تمہاری خواہش کو پورا نہیں کر سکتا"

پال حیران ہو کر مسٹر سین کا منہ تکنے لگا۔ اُسے یقین تھا کہ مسٹر سین بڑی خوشی سے اُس کی درخواست کو منظور کر لیں گے۔ اس انکار کے معنی اُس کی سمجھ میں نہ آئے اسے سخت مایوسی ہوئی۔ آخر اُس نے نہایت غمناک لہجہ میں کہا:۔

"میرا آپ پر کوئی زور نہیں۔ آپ مختار ہیں۔ لیکن کم سے کم مجھے اتنا تو معلوم ہو جائے کہ آخر مجھ میں ایسی کونسی برائی ہے۔ جس کی بنا پر آپ ......"

"پال میرے مفہوم کو غلط نہ سمجھو" مسٹر سین نے پال کا قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ تمہارے اندر ہرگز کوئی برائی نہیں، بلکہ خدا نے تمہیں اُن سب خوبیوں کا مالک بنایا ہے

جو ایک انسان کے لیے باعثِ افتخار ہو سکتی ہیں۔ کھوٹ جو کچھ ہے وہ ہمیں میں ہے۔ ہم ہی اس قابل نہیں کہ تمہیں اپنا بنا سکیں۔"

"میری سمجھ میں آپ کی بات نہیں آتی۔ مہربانی فرما کر صاف صاف بتائیے۔" پال نے منت سے کہا۔ مسٹر ٹین خاموش ہو گئے اور کئی منٹ تک بالکل خاموش رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر کہنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ آخر انہوں نے نہایت اندوہ ناک لہجہ میں کہنا شروع کیا:۔

"پال! بدقسمتی سے ہم کچھ ایسے حادثات کا شکار ہو گئے ہیں جنہوں نے ہمیشہ کے لئے ہمیں دنیا کی نظر میں ذلیل کر دیا۔ اگر وہ واقعات تمہیں معلوم ہوتے تو تم کبھی ہرگز یہاں آنے کی زحمت گوارا نہ کرتے مگر میں تم جیسے شریف اور نیک بخت انسان کو دھوکا نہیں دے سکتا......"

"اب میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔" پال نے مسٹر ٹین کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "آپ کو کسی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے اور سب کچھ جاننے کے باوجود میں یہ درخواست لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اسی منحوس حادثہ نے جس کی طرف آپ اشارہ کر رہے ہیں۔ مجھے اس پر آمادہ کیا ہے کہ آپ کی عزت، اور ذلت میں ہمیشہ کے لئے شریک ہو جاؤں۔ میرا یہ ایمان ہے کہ غریب لڑکی ہر قسم کی آلودگی سے پاک اور بالکل معصوم ہے۔"

پال کے الفاظ نے مسٹر ٹین پر ایک معجزانہ اثر کیا۔ ان کا افسردہ چہرہ یکایک شگفتہ ہو گیا۔ آنکھوں کی چمک سے دل کی خوشی کا اندازہ کرنا مشکل نہ تھا، وہ مسرور بھی تھے اور حیران بھی۔ آخر انہوں نے نہایت محبت بھرے لہجہ میں پال سے کہا:۔

"پال! مائی ڈیر۔ مجھے خبر نہ تھی کہ خدا نے تمہارے سینے میں ایک فرشتہ کا دل رکھ دیا ہے۔ مگر ایک بات پر شاید تم نے غور نہیں کیا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تمہارے

والد کبھی اس رشتہ کو گوارا نہ کریں گے۔"

"اس کا آپ فکر نہ کیجیے، میں انہیں راضی کر لوں گا۔"

پال اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ماں مر چکی تھی، باپ کو اس سے بے انتہا محبت تھی۔ مگر منصف صاحب ایک پرانی وضع کے بزرگ تھے انہیں اپنی خاندانی شرافت پر بڑا ناز تھا۔ پال نے جب تمام واقعات انہیں سنائے اور مسٹر سین کی لڑکی سے شادی کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ایسا معلوم ہوا جیسے اُن پر بجلی گر پڑی۔ وہ بالکل مبہوت ہو کر رہ گئے۔ آخر کچھ دیر کے بعد سنبھلے اور نہایت اندوہ ناک لہجہ میں بولے :-

"بیٹا! ہمارے بڑھاپے پر رحم کرو۔ بزرگوں کی عزت پر کلنک کا ٹیکا نہ لگاؤ، خدانخواستہ اگر تم نے ایسا کیا تو ہم دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔"

پال نے اپنی پوری قوتِ استدلال صرف کر دی۔ مگر وہ کسی طرح اس رائے سے متفق نہ ہوئے کہ اس شادی میں کوئی ذلت نہیں۔ پال کا خیال تھا کہ یہ ذلت کا احساس محض اُن کا واہمہ تھا اور اُن کا خیال تھا کہ پال کی یہ بے معنی گفتگو اس کی فلسفہ دانی کا نتیجہ تھی۔ پال نے جب زیادہ اصرار کیا تو انہیں غصہ آ گیا اور انہوں نے پال کو محروم الارث کر دینے کی دھمکی دی۔ پال نے کہا "مجھے آپ کی دولت نہیں چاہیئے صرف آپ کی محبت کا محتاج ہوں۔"

"میری محبت اگر تمہیں عزیز ہوتی تو میری عزت کو خاک میں ملانے کا سامان نہ کرتے یاد رکھو نرمندر! (پال)، بوڑھے باپ کا دل دکھا کر کبھی سرسبز نہ ہو گے۔"

باپ کی مخالفت کے باوجود پال نے مسٹر سین کی لڑکی سے شادی کر لی منصف

صاحب اس ذلّت کو برداشت نہ کر سکے۔ اُنہوں نے پال کو اپنی فرزندی سے خارج اور محروم الارث کر دیا۔ شادی کے بعد پال کو اپنی بیوی سے غیر معمولی محبت ہو گئی۔ وہ اپنے انتخاب پر نازاں تھا۔ بیوی بھی اُسے ایک بُت کی طرح پوجتی تھی۔ دونوں کو ایک دوسرے کی صحبت نے ساری دنیا سے بے نیاز کر دیا تھا۔ مگر بے درد فطرت اس معصومانہ مسرت کو برداشت نہ کر سکی۔ پال کی شادی کو ابھی تین مہینے نہ گذرے تھے، کہ مسٹر سین پر فالج گرا اور وہ صرف تین دن بیمار رہ کر دنیا کے خرخشوں سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گئے۔

مسٹر سین کوئی دولت مند آدمی نہ تھے۔ وکالت بھی معمولی تھی۔ بہر حال کام چلا جاتا تھا۔ مگر اُن کی موت نے افلاس کی بھیانک تصویر پال کے سامنے لا کر کھڑی کر دی، وہ حیران تھا کہ کیا کرے، کہاں جائے۔ باپ سے کسی ہمدردی کی توقع نہ تھی تعلیم بھی ناقص رہ گئی۔ ایم۔ اے کے امتحان میں شریک نہ ہو سکا۔ ملازمت ملنا دشوار، آمدنی مفقود۔ مصارف مستقل، مسٹر سین کا کچھ اندوختہ ابھی موجود تھا جس سے کچھ کام چل رہا تھا۔ اسی اثنا میں لوکل بورڈ کے الکشن کا زمانہ آ گیا۔ اجیت کمار سین مدھوپور کا نوجوان، آوارہ منش رئیس، جس کا ابتدا میں ذکر آ چکا ہے، اب تک لوکل بورڈ کا چیئرمین تھا اور آئندہ کے لئے اُمیدوار، مگر اس کی بداطواریوں کے باعث سارا مدھوپور اُس سے بیزار تھا۔ پال کا تو اگر بس ہوتا تو اُسے زندہ دفن کر دیتا۔ اُسے دیکھ کر پال کی آنکھوں میں خون اُتر آتا تھا۔ اُسے اب تحقیق طور پر معلوم ہو چکا تھا کہ پارل کی بے ناموسی کا باعث وہی تھا۔ چند ہی روز میں پال مدھوپور کی نوجوان پارٹی میں بہت ہر دل عزیز ہو گیا تھا۔ اجیت کے خلاف اس کی منظم کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوکل بورڈ کا چیئرمین نہ ہو سکا۔ اجیت کے لئے یہ انتہائی ذلّت تھی کہ خود اپنے علاقہ میں اس طرح شکست کھا جائے۔ وہ پال کے

خون کا پیاسا ہو گیا۔

لوکل بورڈ الیکشن کے دو ہفتے بعد پال کے یہاں چوری ہوئی۔ چور فقط روپیہ کے لالچ میں نہیں آئے تھے۔ کیونکہ وہ گھر کے اور ساز و سامان کے علاوہ کھانے پینے کے برتن تک اُٹھا لے گئے۔ پولیس نے حسبِ معمول بہت دوڑ دھوپ کی مگر چوری کا سُراغ لگانے میں کامیابی نہ ہوئی۔ پال کو یقین تھا کہ یہ حادثہ بھی اجیت کی دشمنی کا نتیجہ تھا۔ مگر ثبوت کہاں؟ اب دنیا اُس پر تنگ تھی۔ رہنے کے مکان کے سوا نقد و جنس میں سے اب کچھ بھی اُس کے پاس باقی نہ تھا۔ چند روز قرض وام سے کام چلایا پھر مکان گروی رکھ، بیوی کو ساتھ لے جہانگیر نگر چلا آیا۔ یہاں اُسے کمشنر کے دفتر میں ایک چھوٹی سی نوکری مل گئی۔ ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے لیا۔ تنگی ترشی سے گذر ہونے لگی بیوی کی رفاقت، محبت اور خدمت نے اُس کے سب غم غلط کر دیئے تھے۔ سب تکلیفیں بھلا دی تھیں، دونوں کے لئے ایک دوسرے کی صحبت دو جہان کی دولت تھی۔ وہ اپنی غریبی میں خوش اور موجودہ حالات پر قانع تھے۔

پال اور اُس کی بیوی کبھی کبھی میرے یہاں آیا کرتے تھے۔ درحقیقت پارل بہت ہی نیک طینت لڑکی تھی۔ شوہر پر اس طرح جان چھڑکنے والی بیویاں دنیا میں زیادہ نہیں ہوتیں۔ وہ میرا بے حد احترام کرتی تھی۔ پال کو اگر کوئی آرزو تھی تو صرف یہ کہ اجیت کو کسی طرح نیچا دکھائے۔ مگر ایک غریب کلرک اور ایک دولت مند زمیندار کا کیا مقابلہ، آگ آگ ہوتے ہوئے بھی دریا کو نہیں جلا سکتی۔ اِدھر پال کو تباہ کرنے کے لئے اجیت کی ریشہ دوانیاں برابر جاری تھیں۔

ایک سال اس طرح گذر گیا۔ ایک دن پارل نے مجھے بلا بھیجا۔ میں گیا۔ پال گھر پر موجود نہ تھا۔ پارل نے رو رو کر مجھ سے کہا "پروفیسر صاحب۔ خدا کے لئے آپ

"انہیں" سمجھائیے۔ خدا جانے اس دو تین مہینے میں انہیں کیا ہو گیا ہے۔ ان کی وہ طبیعت ہی نہیں رہی۔ رات کو بارہ بارہ بجے گھر آتے ہیں۔ رات مجھے اُن کے مُنہ سے شراب کی بو آرہی تھی۔ خدا جانے کس کی صحبت نے اُن کا یہ حال بنایا ہے۔ کچھ معلوم نہیں کہاں جاتے ہیں، کیا کرتے ہیں، پوچھتی ہوں تو بگڑتے ہیں، دو دو دن بات نہیں کرتے۔ دفتر سے آئے، چائے پی، اور چلے گئے۔ میں آدھی آدھی رات تک بیٹھی اُن کا انتظار کیا کرتی ہوں"

پارل کی یہ حالت دیکھ کر اور پال کے واقعات سُن کر مجھے بے انتہا صدمہ ہوا، میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ پال جیسا جوان صالح اس قسم کے افعال کا مرتکب ہو سکتا ہے، بہرحال دوسرے دن میں نے تنہائی میں پال کو بہت سمجھایا۔ وہ میرا بہت احترام کرتا تھا۔ اُس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ آئندہ کبھی اس قسم کی کوئی بات آپ میرے متعلق نہ سنیں گے، مگر افسوس کہ یہ صرف وعدہ ہی وعدہ تھا۔

اُسی زمانہ میں مَیں ولایت چلا گیا۔ تقریباً دو سال وہاں قیام رہا۔ ہندوستان واپس آنے سے کوئی چار ماہ قبل لندن میں ایک بنگالی نوجوان مسٹر بھٹا چارجی سے میری ملاقات ہوئی اور چند ہی روز میں خاصی بے تکلفی ہو گئی، وہ اجیت کمار کو اچھی طرح جانتا تھا، بلکہ ایک زمانہ تک اُس کا راز دار دوست رہ چکا تھا۔ جوشِ انتقام نے اجیت کمار کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اُس نے پارل اور پال کو تباہ کرنے کی قسم کھائی تھی، اُسے ایک مناسب آلۂ کار کی ضرورت تھی جس کی مدد سے وہ اپنے شیطانی ارادوں کی تکمیل کر سکے۔ اُس کی نظر انتخاب بھٹا چارجی پر پڑی۔ بھٹا چارجی کی اندھی جوانی اور ہوسناک فطرت ہر طرف نفس کی لذتوں کو ڈھونڈھتی تھیں۔ اجیت کمار نے اسے سب کچھ دیا اور اُس کی انسانیت، اُس کی شرافت، اُس کا ضمیر،

سب کچھ اُس سے لے لیا۔ بھٹا چارجی کو معلوم نہ تھا کہ پاؔل اور پاؔل سے میرے تعلقات اتنے گہرے تھے۔ میں نے خود بھی اس حقیقت کو اُس سے چھپایا۔ یہاں تک کہ اُس نے اپنی شرمناک سیاہ کاریوں کی داستان مجھے سُنا دی۔

بھٹا چارجی اور پاؔل ایک ہی دفتر میں ملازم تھے۔ اجیت کمار کے ایما سے اُس نے پاؔل سے دوستی کی، پھر اُسے گھر بلایا، اپنی خوبصورت اور جوان "بیوی" رینوکا سے اُسے ملایا۔ رینوکا دراصل اُس کی بیوی نہ تھی۔ اجیت کمار کی ایک داشتہ تھی، بہت خوبصورت، بلا کی طرّار، دل موہ لینے کے ہزاروں گر اُسے یاد تھے۔ پاؔل نے اوّل اوّل بہت ہمّت سے کام لیا حُسن کی بجلیاں کوندتی تھیں اور تڑپ تڑپ کر اُس پر گرتی تھیں، مگر اُس کی آنکھ تک نہ جھپکتی تھی۔ رینوکا اپنے حُسن و شباب اور نسوانیت کے تمام حربے استعمال کر رہی تھی، مگر پاؔل کی شرافت کسی طرح مغلوب نہ ہوتی تھی۔ لیکن پاؔل انسان تھا۔ فرشتہ نہ تھا۔ یوسف کی طرح معصوم فطرت لے کر پیدا نہیں ہوا تھا۔ رینوکا کی فتنہ کاریوں نے زلیخا کی عیاریوں کو مات کر دیا، پھر بھی پال سنبھلا رہا حُسن کا جادو اُس پر نہ چلا۔ لیکن رینوکا کے مسلسل آنسو آخر اُسے بہا لے گئے۔ اُس کے قدم ڈگمگا گئے۔ اُس نے لاکھ سنبھلنے کی کوشش کی۔ مگر کامیابی نہ ہوئی، وہ گرا اور بری طرح گرا۔ آہستہ آہستہ رینوکا نے اُسے شراب پر لگا لیا اور اتنی پلائی، اتنی پلائی کہ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ پاؔرل کو بھی بھول گیا۔

اب شراب اُس کی زندگی تھی یا رینوکا کے آغوش کی گرمی۔ لیکن رینوکا کا کام ہو چکا تھا۔ اُس نے ہاتھ کھینچ لیا اور پاؔل کو مفت کی شراب ملنی بند ہو گئی۔ آمدنی ناکافی، خرچ زیادہ، قرض کے سوا چارہ نہ تھا۔ بھٹا چارجی کی

معرفت بلا ضمانت روپیہ ملنے لگا۔ یہ روپیہ آجیت کمار کا تھا چند
مہینے اس طرح گذرے۔ اس کے بعد قرض کی بدولت پال جیل میں تھا
اور پارل بے یار و مددگار، بیکس و تنہا نانِ شبینہ کو محتاج اور اس کے
بعد! اس کے بعد ہی جو دولت کی زبردستی، افلاس کی بے بسی اور مرد
کی ہوسناکی نے عورت کو بارہا ...... بنایا ہے، یعنی ایک بے ناموس،
عصمت فروش، یہ تمام واقعات سُن کر مجھے جس قدر صدمہ ہوا بس میرا ہی دل
جانتا ہے، مگر میں کیا کر سکتا تھا۔

ولایت سے واپسی پر جس دن میں کلکتہ پہونچا وہاں ایک بنگالی فلم
"شبیا" (طوائف) کی بڑی دھوم تھی۔ بعض دوستوں کے اصرار سے میں بھی
دیکھنے گیا۔ اس تصویر میں یہ دکھلایا گیا تھا کہ ہوسناک امیروں کی بدولت
کس طرح بھولی بھالی شریف زادیاں طوائفیں بن جاتی ہیں۔ میری حیرت
کی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ خود پارل نے ہیروئن کا پارٹ کیا
ہے اور قصہ خود اُس کے اپنے واقعاتِ زندگی تھے۔ میں بہت ہی افسردہ
خاطر تماشا گاہ سے نکلا۔ میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، مگر مجھے یقین ہے کہ
پارل اور پال کے واقعات زندگی کے سوا اور کچھ بھی اُس وقت مجھے نظر
نہیں آرہا تھا۔ سڑک کے کنارے ہم ٹھہر گئے، ٹرام کا انتظار تھا کہ یکایک
برابر والے موٹر پر ایک چیخ کی آواز سنائی دی، کوئی شخص ایک موٹر سے
ٹکرا گیا۔ لوگ دوڑ پڑے، میں بھی لپکا، وہ آدمی بری طرح موٹر سے کچل گیا
تھا۔ اُس کے بدن سے خون کی ندی بہ رہی تھی۔ موٹر کا مالک موٹر سے
اُترا۔ اُس کے ساتھ ایک خاتون بھی تھی اُس نے جھک کر زخمی کو دیکھا،

بے اختیار ایک چیخ اُس کے مُنہ سے نکلی، اور وہ لڑکھڑا کر زخمی پر گر پڑی زخمی نے سر اُٹھایا۔ غور سے اُسے دیکھا اور بڑی دردناک کراہ کے ساتھ کہا "پازل"

میرے ہوش اُڑ گئے۔ آگے بڑھ کر میں نے اُسے دیکھا۔ یہ پاَل تھا۔ چند منٹ کے بعد اُس نے دم توڑ دیا۔

سچی کہانی

(سکینہ بی بی)

لندن میں ایک روز میں نے اپنے سب ہندوستانی دوستوں کی دعوت کی کھانے کے بعد میں نے کہا "زندگی میں ہر شخص کو ایک نہ ایک واقعہ ایسا ضرور پیش آتا ہے جس کی مثال بہترین افسانوں میں بھی نہیں مل سکتی میں چاہتا ہوں کہ آج ہر شخص اپنی آپ بیتی کا کوئی دلچسپ ٹکڑا سنائے" سب نے اس تجویز کو پسند کیا اور سب سے پہلے رشید نے یہ عبرت ناک داستان سنائی۔

"پریم پجاری"

"ہمارے ایک دوست تھے ابوالبرکات، وہ بنگال کے ایک معزز زمیندار کے بیٹے تھے۔ میں اور وہ دو برس تک علی گڑھ میں ساتھ رہے۔ ہم کلاس فیلو بھی اور روم فیلو بھی، ایف، اے پاس کرنے کے بعد وہ کلکتہ کے پریسیڈنسی کالج میں داخل ہو گئے، میں علی گڑھ ہی رہا۔ ہم دونوں نے ایک ہی سال بی، اے پاس کیا۔ ابوالبرکات نے

مجھے مبارک باد کا خط لکھا۔ اور چند روز کے لیے کلکتہ آنے کی دعوت دی، میں نے کبھی کلکتہ نہیں دیکھا تھا۔ تعریف بہت سنی تھی۔ اس موقع کو غنیمت جانا اور اولین فرصت میں کلکتہ روانہ ہو گیا۔ ابوالبرکات نے دس بارہ دن تک مجھے خوب کلکتہ کی سیر کرائی، اس کے بعد کہا کہ اب چند روز کے لیے ہمارے گھر دیبی پور چلو۔ دیبی پور ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ کلکتہ کی سیر کے بعد میرے لئے دیبی پور میں کوئی دلکشی نہ تھی مگر ابوالبرکات کی خاطر سے جانا پڑا۔

جو لوگ بنگال سے واقف نہیں انہیں یہ سن کر غالباً تعجب ہو گا کہ اتنے بڑے ملک میں صرف دو شہر ہیں۔ ایک کلکتہ، دوسرا ڈھاکہ۔ باقی ضلعوں کے صدر مقام بھی یو۔ پی کے بڑے قصبوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، تقریباً ساڑھے چار کروڑ کی کثیر آبادی کل کی کل گاؤں میں بسی ہوئی ہے اور بنگالہ کا ہر قابل ذکر شخص عموماً کسی نہ کسی گاؤں کا باشندہ ہوتا ہے۔ بارش اور دریاؤں کی کثرت، ریلوں کی قلت کا باعث ہے۔ پکی سڑکیں تو اس ملک میں اس طرح ناپید ہیں جس طرح نئی روشنی کی عورتوں میں قربانی کا مادہ۔ سفر بہر حال ناگزیر ہے اور جہاں ریل نہیں وہاں اسٹیمروں اور بادبانی کشتیوں سے کام لیا جاتا ہے۔ بارہ گھنٹے ہم نے ریل میں سفر کیا، اس کے بعد کشتی میں بیٹھے۔ دیبی پور ریل کے اسٹیشن سے چھ سات میل کے فاصلے پر دریا کے کنارے واقع ہے۔ سورج ڈوب چکا تھا شفق کی سرخ روشنی میں سپید و سیاہ بادل کے ٹکڑے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے کسی نے روئی کے ڈھیر میں آگ لگا دی ہو یا کوہ آتش فشاں شعلے اگل رہا ہو۔ ہوا موافق تھی اور دریا سبک رو، ہماری بادبانی کشتی خاصی رفتار سے چلی جا رہی تھی۔ کشتی میں ہمارے سوا تین مسافر اور تھے، ایک بوڑھا بندر والا اور دو اس کے بندر جو دم بھر کے لئے نچلے نہ بیٹھتے تھے۔ بندر والا بھی دیبی پور کا رہنے والا تھا، وہ ہمیشہ اپنے بندر لئے آس پاس کے دیہات میں گھوما

کرتا تھا۔ جب کچھ کما لیتا تو چند روز کے لئے دیبی پور آ جاتا اور جب اندوختہ ختم ہو جاتا تو پھر روزی کی تلاش میں نکل جاتا۔ ابوالبرکات اُسے پہلے سے جانتے تھے اور محض تفریح کی خاطر اسے اپنے ساتھ کشتی میں بٹھا لیا تھا۔ وہ راستے بھر نہایت دلچسپ قصے اور مزے دار لطیفے سناتا آیا۔ رات کے ۹ بجے کشتی کنارے لگی۔ دیبی پور کے سب سے بڑے زمیندار مولوی ابوالمظفر صاحب کی طرف سے دو آدمی گھاٹ پر موجود تھے جنہوں نے ہمیں اور دوسری کشتی سے اُترنے والے تمام مسافروں کو مولوی صاحب موصوف کی جانب سے رات کے کھانے کی دعوت دی۔ گاؤں کی بستی سامنے ہی تھی اور بے شمار چراغوں سے جگمگا رہی تھی۔ گانے اور باجے کی آواز آ رہی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تمام گاؤں والے کسی بڑی خوشی کی تقریب میں جشن منا رہے ہیں۔ بندر والا بھی ہمارے ساتھ ہی کشتی سے اترا اور جب اُس نے ابوالمظفر صاحب کی طرف سے دعوتِ عام کی خبر سُنی تو حیران ہو کر بولا:۔

"دعوت ہے۔ کس بات کی؟"

"موجو میاں (ابوالمظفر صاحب) کی بیٹی کی شادی کا کھانا ہے۔ سارے گاؤں کی دعوت ہے۔ اُن کی خواہش ہے کہ آج کی رات جو کوئی بھی دیبی پور آئے وہ اُن کا مہمان ہو۔" ابوالمظفر صاحب کے آدمی نے جواب دیا۔

"بی بی دوسری شادی پر راضی ہو گئی؟" بڈھے نے اور بھی زیادہ حیرت سے پوچھا۔

"دوسری شادی نہیں، دولھا میاں واپس آ گئے!"

یہ سننا تھا کہ بڈھا ہکا بکا رہ گیا۔ ابوالبرکات بھی حیران کھڑے تھے اور میں ان دونوں کی حیرانی پر متعجب تھا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ اس تمام گفتگو کا مطلب میں کچھ بھی نہیں سمجھا تھا۔ "بیٹی کی شادی کا کھانا!" میرے لئے اور بھی عجیب بات تھی، مگر دولت کے چونچلے کسی اصول کے پابند نہیں۔

"بالکل غلط۔ یہ کوئی دغا باز ہے۔" بڈھے نے نہایت جھلا کر کہا اور اپنے بندروں کی ڈوریاں کھینچتا ہوا نہایت تیزی کے ساتھ گاؤں کی طرف چل دیا۔ میں اور ابوالبرکات بھی روانہ ہوئے۔ گھاٹ سے اُن کے مکان کا فاصلہ ایک فرلانگ سے زیادہ نہ تھا۔ میرے استفسار پر ابوالبرکات نے واقعات کی تفصیل اس طرح بیان کی:-

"موجو میاں یہاں کے سب سے بڑے زمیندار ہیں۔ لکھپتی آدمی ہیں۔ ابّا سے بہت دوستی ہے۔ دونوں ساتھ کے پڑھے ہوئے ہیں۔ اُن کے صرف ایک بیٹی ہے۔ سکینہ بی بی اور کوئی اولاد نہیں۔ سکینہ بی بی کو میں نے دیکھا ہے۔ صورت شکل کی بہت اچھی ہیں۔ مگر مزاج ذرا اکڑوا ہے۔ میں بچپن میں اُن کے گھر جایا کرتا تھا۔ جس وقت اُن کی شادی ہوئی میری عمر چھ سال سے زیادہ نہ تھی۔ مگر آج اٹھارہ برس گذرنے کے بعد بھی سب واقعات مجھے اس طرح یاد ہیں جیسے کل کی بات۔ موجو میاں کو بیٹی سے بے انتہا محبت ہے۔ بچپن ہی میں ماں کا سایہ سکینہ بی بی کے سر سے اُٹھ گیا تھا۔ موجو میاں اُس وقت جوان تھے۔ دولت تو اُن کے یہاں سات پشت سے چلی آتی ہے۔ چاہتے تو ایک چھوڑ چار شادیاں کر لیتے۔ مگر بیٹی کی چاہت میں اپنی جوانی بلکہ ساری زندگی کو خاک میں ملا دیا۔ دوستوں نے لاکھ کہا مگر وہ دوسری شادی کے لئے تیار نہ ہوئے۔ ہمیشہ یہی جواب دیتے کہ "نا بھیّا! سوتیلی ماں میری بچی کو دکھ دے گی۔" ایسی حالت میں وہ کیسے گوارا کرتے کہ بیٹی کہیں پردیس میں بیاہی جائے اور ہمیشہ کے لئے اُن سے جدا ہو جائے۔ لہٰذا اُنھوں نے بہت تلاش کے بعد ایک نہایت غریب گھر کا لڑکا اپنی دامادی کے لئے انتخاب کیا۔ اُس کا نام عبدالحمید تھا۔ پانچویں پشت میں عبدالحمید کا خاندان موجو میاں کے خاندان سے جا ملتا تھا۔ عبدالحمید کے ماں باپ مر چکے تھے۔ کوئی حقیقی ہمدرد سرپرست موجود نہ تھا۔ رشتہ کے ایک چچا کے یہاں پرورش ہوتی تھی۔ دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ موجو میاں نے اُسے اپنے یہاں رکھ لیا۔ اسی سال عبدالحمید نے انٹرنس پاس کر لیا۔ موجو میاں کو بے انتہا

خوشی ہوئی اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد سکینہ بی بی سے اُس کی شادی کر دی لیکن بدقسمتی دیکھیے کہ عین شب عروسی کو ایک نہایت ہی افسوس ناک واقعہ پیش آیا۔ میں آپ سے بیان کر چکا ہوں کہ سکینہ بی بی مزاج کی ذرا تیز ہیں۔ رات کو جب دولھا دلہن یک جا ہوئے تو سکینہ بی بی کو اپنے رفیق حیات کی نہ جانے کونسی بات ناگوار گذری کہ بگڑ گئیں غریب کو افلاس کے طعنے دیئے۔ اپنے احسانات بھی جتائے۔ شانِ امارت بھی دکھائی غرض جو منہ میں آیا کہہ ڈالا۔ عبدالحمید تھا تو غریب۔ مگر اس کی خاندانی شرافت مسلم تھی۔ اس کی رگوں میں بھی وہی خون گردش کر رہا تھا جس پر سکینہ بی بی کو ناز تھا۔ منہ سے تو اُس نے کچھ نہ کہا مگر دل اُس کا پاش پاش ہو گیا۔ خاموشی کے ساتھ اُٹھا اور دروازہ کھول گھر سے نکل گیا۔ سکینہ بی بی اپنے تاؤ میں کب کسی کی پروا کرنے والی تھیں۔ مگر جب کئی گھنٹے گذر گئے اور غصہ دھیما پڑا تو گھبرائیں کہ یہ کیا ہوا۔ پھر بھی صبح تک صبر کیا اور اس اُمید میں رہیں کہ عبدالحمید شاید اب لوٹ آئے۔ شاید اب لوٹ آئے۔ مگر عبدالحمید جو گئے تو گئے۔ دنوں سے ہفتے، ہفتوں سے مہینے اور مہینوں سے برس ہو گئے مگر عبدالحمید کا کہیں پتہ نہ چلا۔ ممدو میاں نے اُن کی تلاش میں بہت خاک چھانی بہت روپیہ برباد کیا۔ مگر کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ آخر تھک کر بیٹھ رہے۔

سکینہ بی بی پر اس حادثہ کا بہت گہرا اثر پڑا لیکن اُن کی غیور طبیعت نے گوارا نہ کیا کہ اپنے قصور کا اعتراف کریں۔ لہذا کوئی دو ڈیڑھ برس تک تو اُنھوں نے کبھی کسی قسم کے رنج و ملال کا اظہار نہ کیا۔ بلکہ عبدالحمید کے ذکر ہی سے چڑتی تھیں۔ لیکن یہ نمائشی برہمی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔ اب وہ اکثر عبدالحمید کو یاد کر کے رو دیا کرتیں۔ اور اپنی نادانی پر بہت پچھتاتیں۔ اکثر کہا کرتیں کہ "میں نے بے بات کی بات نکالی بے چارے کو ہزاروں اُلٹی سیدھی سُنا ڈالیں۔ وہ غیرت مند آدمی تھا، برداشت نہ کر سکا۔ ہائے میری جہالت نے اُسے اور مجھے دونوں کو برباد کیا۔ سکینہ بی بی کے

پاس عبدالحمید کی ایک تصویر بھی جو انٹرنس کے امتحان میں پاس ہونے کے بعد یعنی شادی سے کچھ ہی دنوں پہلے اُس نے کھنچوائی تھی۔ ماماؤں کی زبانی سُنا کہ سکینہ بی بی تنہائی میں اکثر اُس تصویر کو سامنے رکھ کر ہاتھ جوڑ کے کھڑی ہو جاتیں اور کہتیں :۔

”میرے سرتاج! مجھ سے بڑا قصور ہوا۔ بِللہ معاف کر دو۔ تم معاف نہ کرو گے تو خدا بھی معاف نہ کرے گا۔ جہنم کا کُندہ بنوں گی۔ ہائے میرا دین بھی برباد اور دنیا بھی برباد خدارا اب چلے آؤ، کب تک روٹھے رہو گے۔ میں اپنے گناہوں کی کافی سزا بھگت چکی رنج و غم سہنے کی اب دل میں جان نہیں۔ سب لوگ تمہاری نیک دلی کی تعریف کرتے ہیں کیا تمہاری نیکی کا کوئی حصہ بھی میرے لئے نہیں۔ کیا تم اپنی کنیز کو ہمیشہ نامراد ہی رکھنا چاہتے ہو۔ کیا تمہاری بدبخت سکینہ صرف اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ تڑپ تڑپ کے تمام ہو جائے۔ ہائے تمہیں کیا بتاؤں کہ تنہائی کے ویران دن اور جدائی کی سنسان راتیں کس طرح گذارتی ہوں۔ کون سمجھ سکتا ہے کہ تمہارے بغیر نرم بستر میرے لئے کانٹوں کا بچھونا ہے۔ خوشی کی محفلوں میں مَیں شریک نہیں ہوتی۔ گہنوں اور اچھے کپڑوں سے اب مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ کس کے لئے سنگھار کروں، کس کے لئے پہنوں اوڑھوں کون دیکھنے والا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں جس کے پاس دولت ہے وہ ہر قسم کی خوشیوں کا مالک ہے۔ یہاں دولت کا انبار مٹی کا ڈھیر ہے۔ اسی کمبخت دولت کے غرور نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ اسی نے میری ساری خوشیاں مجھ سے چھین لیں۔ کاش اس ساری دولت کے بدلے تم مجھے واپس مل جاؤ۔ تم موجود ہو تو سوکھے ٹکڑے اور پھٹے کپڑے دنیا کی بہترین نعمت ہیں۔ حمید! میرے پیارے۔ بِللہ اب اپنی گنہگار لونڈی کو بخش دو۔ غصہ کو تھوک دو اور پلٹ آؤ۔ تمہاری کنیز تمہارے پاؤں دھو دھو کر پیئے گی!“

اسی قسم کی باتیں کرتیں اور زار و قطار رونے لگتیں۔ سُنا ہے کہ ایک دفعہ اسی طرح روتے روتے بیہوش ہوگئیں۔ ماماؤں کی مجال نہیں کہ بغیر بلائے اُن کے کمرہ میں جائیں

خدا جانے کتنی دیر بیہوش پڑی رہیں۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ اتفاق سے مو جومیاں اُدھر جا نکلے۔ انہیں فرش پر بیہوش پڑا پایا۔ عبد الحمید کی تصویر بھی پاس ہی فرش پر پڑی تھی تو چل، ہیں چل، ایک ہلچل مچ گئی۔ فوراً کویراج کو بلایا گیا۔ خدا خدا کر کے ہوش آیا مہینہ بھر تک بیمار رہیں۔ غرض چار پانچ برس تک اضطراب کا ہی عالم رہا۔ رفتہ رفتہ طبیعت سکون پذیر ہوگئی۔ دنیا کی ساری دلچسپیوں سے مُنہ موڑ لیا۔ شب و روز قرآن پاک کی تلاوت ہے۔ یا نماز اور ورد و وظائف۔ سُنا ہے آدھی آدھی رات تک مصلے پر بیٹھی رہتی ہیں۔ اب کوئی سال بھر سے صحت اچھی نہیں رہتی۔ عبد الحمید کی گم شدگی کو جب سات برس گذر گئے اور اُن کی کوئی خیر خبر نہ ملی تو سب کو یقین ہو گیا کہ اب وہ زندہ نہیں۔ سکینہ بی بی کی جوانی بلکہ زندگی برباد ہو رہی تھی۔ اُن کی یہ حالت دیکھ کر مو جومیاں بھی بہت کڑھتے تھے۔ مگر کچھ بس نہ چلتا تھا۔ آخر صلاح یہ ٹھہری کہ سکینہ بی بی کا عقد ثانی کر دیا جاوے۔ مولویوں سے فتویٰ پوچھا۔ سب نے یہی کہا کہ ہاں ایسی حالت میں شوہر کو مُردہ اور بیوی کو بیوہ سمجھنا چاہیے اور دوسرا نکاح جائز ہے۔ عقد بیوگان کا بنگال میں عام رواج ہے۔ مگر جب سکینہ بی بی سے استمزاج کیا گیا تو وہ کسی طرح اس پر آمادہ نہ ہوئیں اور انہوں نے کہا کہ میں نے تو اپنے شوہر کی یاد ہی میں زندگی ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس جواب کے بعد اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا کہ سکینہ بی بی کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ پھر بھی وقتاً فوقتاً کئی مرتبہ اُنہیں عقد ثانی کی ترغیب دی گئی۔ مگر اُنہوں نے ہمیشہ صاف انکار کر دیا۔ اس وقت یہ نئی خبر سُنی کہ اٹھارہ برس کے بعد عبد الحمید واپس آ گئے۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کھانا کھا لو تو چل کر دیکھیں کہ ماجرا کیا ہے۔ جب میں نے عبد الحمید کو دیکھا تھا تو اُن کا لڑکپن تھا اور نہ میرا بچپن، اب ان کا سن پینتیس چھتیس سال سے کم نہ ہوگا۔ بالکل بدل گئے ہوں گے۔ میں تو شاید ہی پہچان سکوں۔ نہ جانے کس نے انہیں شناخت کیا

اور کیسے شناخت کیا۔"

ہم لوگوں نے نہا دھو کر کپڑے بدلے، کھانا کھایا اور کوئی ساڑھے دس بجے موجو میاں کے یہاں پہونچے محفل جمی ہوئی تھی۔ گانا ہو رہا تھا۔ موجو میاں کے دوست احباب اور گاؤں کے تمام معززین جمع تھے۔ ابوالبرکات کے والد بھی موجود تھے۔ اُنہوں نے ہم لوگوں کو دیکھتے ہی اپنے پاس بلا لیا۔ وہ مجھے علی گڑھ سے جانتے تھے۔ عبدالحمید اُن کے برابر ہی بیٹھے تھے۔ اُن سے ہمارا تعارف کرایا۔ ابوالبرکات نے اُنہیں مطلق نہ پہچانا۔ مگر عبدالحمید نے کہا:۔

"چنّو میاں! ہم تو آپ کو پہچان ہی گئے"

"چنّو میاں ابوالبرکات کا بچپنے کا پیار کا نام تھا۔ مگر اب کوئی اُنہیں اس نام سے نہیں پکارتا تھا۔ ابوالبرکات کو عبدالحمید کے اس غیر معمولی حافظہ پر بہت تعجب ہوا۔ چنانچہ اُنہوں نے کہا:۔

"آپ کا حافظہ بلا کا ہے۔ مگر کیا آپ کے نزدیک اس اٹھارہ برس میں میرے اندر کوئی خاص تغیر نہیں ہوا؟"

"کیوں نہیں۔ تغیر تو بہت ہوا ہے۔ مگر آپ کی آنکھیں اور ہنسی کا انداز آج بھی بالکل ویسا ہی ہے جیسا اٹھارہ سال پہلے تھا۔

میں نے ابوالبرکات سے پوچھا کہ موجو میاں کو سنتے ہیں۔ اُنہوں نے کہا وہ یہاں موجود نہیں ہیں۔ پھر اُنہوں نے اپنے والد صاحب سے دریافت کیا کہ موجو میاں کہاں ہیں۔ اُنہوں نے کہا کسی کام سے زنانہ میں گئے ہیں، ابھی آتے ہوں گے ہمیں وہاں بیٹھے تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ موجو میاں سخت بدحواس کمرہ میں داخل ہوئے اور ابوالبرکات کے والد سے کہا کہ بھیّا ذرا اِدھر آیئے۔ سب گھبرا گئے کہ خدا خیر کرے۔ دونوں نے آہستہ آہستہ کچھ باتیں کیں محفل برخاست کی گئی۔ ہم سے

کہا گیا کہ تم لوگ گھر جاؤ۔ ہم چلے تو آئے مگر برابر تشویش رہی کہ یہ کیا ہوا۔ ابوالبرکات کے والد کی آمد کا انتظار تھا کہ وہ آئیں تو کچھ پتا چلے۔ کوئی ساڑھے گیارہ بجے تک ہم لوگ جاگتے رہے۔ مگر ابوالبرکات کے والد نہ آئے۔ میں بہت تھکا ہوا تھا ابوالبرکات نے کہا اب سو جاؤ جو کچھ ہوگا صبح کو ابا سے معلوم ہو جائے گا۔ مجھے پہلے ہی نیند کے جھونکے آ رہے تھے۔ تکیہ پر سر رکھتے ہی بے خبر سو گیا مشکل سے گھنٹہ بھر سویا ہوں گا کہ ابوالبرکات نے مجھے جگا دیا اور کہا :۔

"رشید! غضب ہو گیا۔ موجو میاں نے اپنے داماد کو مار ڈالا۔ اور آپ بھی خودکشی کر لی"

میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ہم دونوں فوراً کپڑے پہن کر موجو میاں کے گھر پہونچے۔ وہاں ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ سیکڑوں آدمی جمع تھے۔ چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں، جتنے منہ اتنی باتیں ابوالبرکات کے والد کمرہ کے سامنے کرسی پر خاموش بیٹھے تھے۔ کمرہ کے دروازہ میں تالا پڑا تھا۔ لوگ انھیں گھیرے ہوئے تھے۔ اُن کے منہ پر مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ ابوالبرکات کی اور میری کوشش اور منت و سماجت سے لوگ مکان سے باہر گئے۔ ہم نے دروازہ بند کر دیا۔ اب بالکل تنہائی تھی۔ میں نے ابوالبرکات کے والد سے کہا:

"چچا ابا۔ خدا کے لئے کچھ بتائیے تو یہ ہوا کیا ؟"

انہوں نے ایک سرد آہ بھر کے کہا :۔

"کیا بتاؤں میاں۔ مقدر میں جو لکھا تھا سو پورا ہوا" اتنا کہہ کر۔ خاموش ہو گئے ہم بھی خاموش رہے، چند لمحہ کے بعد وہ خود ہی بولے :۔

"رات تم لوگوں کے آنے سے کوئی گھنٹہ پون گھنٹہ پہلے بھیکو بندر والا آیا۔ موجو میاں ہیں، اور سب لوگ اندر بیٹھے گانا سُن رہے تھے، اُس نے کہلا کر بھیجا کہ موجو میاں سے تنہائی میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ موجو میاں نے نوکر سے کہا جاؤ کہہ دو اس وقت

فرصت نہیں بکل کسی وقت آنا۔ نوکر گیا اور پھر پلٹ کر آیا کہ حضور وہ کہتا ہے بہت ضروری کام ہے۔ مَوجو میاں کو پھیکو کا یہ اصرار بُرا معلوم ہوا۔ اُنہوں نے نوکر سے کہا۔ زیادہ بک بک کی ضرورت نہیں۔ ایک دفعہ کہہ تو دیا کہ اس وقت ملاقات نہیں ہو سکتی۔ نوکر پھر لوٹ کر آیا اور کہا کہ "حضور وہ کہتا ہے سرکار کی عزّت کا معاملہ ہے میں حضور کی رعیت اور اس گھر کا پُرانا نمک خوار ہوں۔ اگر اس وقت حضور میری بات نہیں سُنیں گے تو میں اپنی جان کھو دوں گا۔" مَوجو میاں کو غصّہ تو آیا مگر ساتھ ہی حیران ہوئے کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ میں نے بھی کہا جاؤ سُن لو۔ دیکھو تو کہتا کیا ہے۔ وہ چلے گئے۔ جب بہت دیر تک واپس نہ آئے تو میں نے آدمی بھیجا کہ خبر لائے۔ کہاں چلے گئے۔ معلوم ہوا دوسرے مکان میں عبدالحمید کے چچا اور چچی سے کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ اس کے بعد جب محفل میں آئے تو تم موجود ہی تھے۔

"یہ پھیکو بندر والا وہی تو نہیں جو ہمارے ساتھ کشتی میں آیا تھا۔" میں نے ابوالبرکات سے پوچھا۔

"ہاں وہی۔"

"اچھا تو پھر اس نے مَوجو میاں سے کیا کہا؟" میں نے ابوالبرکات کے والد سے دریافت کیا۔

وہ اُنہیں تنہائی میں لے گیا اور کہا کہ حضور جان کی امان ملے تو کچھ عرض کروں مَوجو میاں نے کہا بے کھٹکے بیان کرو۔ اس نے کہا اس طرح نہیں۔ یہ میری جان اور آپ کی آبرو کا معاملہ ہے۔ زبان دیجئے کہ مجھے کوئی نقصان نہ پہونچے گا۔ مَوجو میاں نے اُس کے اطمینان کے لئے قسم کھا کر کہا جو کچھ بھی ہو، تم پر آنچ نہ آئے گی، جو بات ہے صاف صاف بتا دو۔"

اُس نے کہا:۔

"یہ شخص حمید میاں ہرگز نہیں، کوئی دغاباز جعلیا ہے"
"تجھے کیسے معلوم ہوا کہ یہ حمید میاں نہیں ہے"
"آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ حمید میاں ہے"
"ہمیں ایسے معلوم ہوا کہ اس کے چچا اور چچی نے پہچانا۔ اس کے گاؤں کے ایک اسکول ماسٹر نے پہچانا۔ عبدل جراح جس نے بچپن میں اس کی ٹانگ کے پھوڑے میں شگاف دیا تھا۔ اس نے پہچانا۔ زخم کا نشان تک ٹھیک اسی جگہ موجود ہے جہاں عبدل نے بتایا تھا"
"اور آپ نے بھی پہچانا"
"نہیں میں نے تو نہیں پہچانا"
"خیر اگر آپ بھی پہچان لیں اور آپ کے ساتھ ساری دنیا پہچان لے تب بھی وہ حمید میاں نہیں"
"اگر تیرے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ حمید میاں نہیں"
"آپ نہیں مانتے تو ثبوت بھی سن لیجئے۔ جس دن سکینہ بی بی کی شادی ہوئی اسی رات کو میں بھوانی پور جانے والا تھا۔ اب آپ سے کیا چھپاؤں۔ اس زمانے میں بندر تو فقط ایک پردہ تھا ورنہ دراصل میرا پیشہ چوری اور بٹ ماری تھا۔ میرے تین ساتھی اور بھی تھے۔ اب ان میں سے ایک بھی زندہ نہیں۔ میں ہی کمبخت محتاجی اور بڑھاپے کی مصیبتیں جھیلنے کے لئے زندہ رہ گیا ہوں۔ ہاں تو اس رات کو ہم لوگ بھوانی پور میں ایک ساہوکار کے یہاں ڈاکا مارنے والے تھے۔ ہمارے دو ساتھی پہلے سے بھوانی پور جا چکے تھے، طے یہ پایا تھا کہ باقی ہم دونوں اس رات کو ٹھیک تین بجے بھوانی پور پہنچکر اپنے ساتھیوں سے جا ملیں۔ آدھی رات کو ہم یہاں سے روانہ ہوئے۔ کوئی میل بھر چلنے کے بعد ہمیں یہ خیال آیا کہ ہم بہت پہلے چل پڑے

اس سلئے راستہ کے کنارے آموں کے ایک باغ میں ٹھہر گئے۔ چاندنی کھلی ہوئی تھی مگر باغ میں اندھیرا تھا۔ ہمیں باغ میں پہونچے مشکل سے دس منٹ گذرے ہوں گے کہ گاؤں کی طرف سے ہمیں ایک شخص آتا ہوا نظر پڑا۔ ابھی ہمارے اور اس کے درمیان کافی فاصلہ تھا، مگر میں نے غور سے دیکھا تو پہچان لیا۔ یہ حمید میاں تھے۔ میں حیران رہ گیا کہ شادی کی رات کو یہ گھر سے کہاں بھاگے جاتے ہیں۔ فوراً میرے دل میں یہ خیال آیا کہ ضرور ان کی نیت خراب ہوئی۔ بیوی کے قیمتی زیورات اور جواہرات چُرا کر چپکے سے نکل بھاگے ہیں۔ میں نے اپنے ساتھی سے اپنا خیال ظاہر کیا۔ اس نے بھی کہا یقیناً یہی بات ہے۔ پس ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ جو کچھ ان کے پاس ہے ان سے چھین لینا چاہئے۔ عمر بھر کے عیش کا سامان ہو جائے گا۔ ہم دونوں اپنی اپنی لاٹھیاں سنبھال کر تیار ہو گئے۔ جب وہ ہم سے چند قدم آگے نکل گئے تو ہم دبے پاؤں اُن کے پیچھے چلے۔ اور قریب پہونچ کر میں نے ایک لاٹھی اُن کے سر پر ماری۔ سر پھٹ گیا۔ وہ گر پڑے۔ ہم نے اُن کی جامہ تلاشی لی۔ مگر اُن کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ ہمیں سخت افسوس ہوا۔ چوٹ کے صدمہ سے وہ بے ہوش ہو گئے تھے جب کتنی ہی دیر ہو گئی اور انہیں ہوش نہ آیا تو ہم گھبرائے۔ پاس کے تالاب سے پانی لا کر اُن پر چھڑکا۔ مگر بے سود۔ دراصل وہ مر چکے تھے۔ ہم دونوں سخت بدحواس ہو گئے۔ مگر یہ حادثہ ہمارے لئے بالکل نیا نہ تھا۔ میرا ساتھی فوراً گاؤں سے پھاوڑا لایا اور ہم دونوں نے گڑھا کھود کر انہیں باغ میں دفن کر دیا اور زمین برابر کر دی کہ کسی کو شبہ نہ ہو!"

انہیں واقعات کو سن کر مو جو میاں بدحواس محفل میں آئے تھے۔ اُنہوں نے یہ ساری داستان مجھے سُنائی۔ اُس وقت اُن کی حالت بالکل دیوانوں کی سی ہو رہی تھی۔ وہ نقلی عبدالحمید کو قتل کر دینے کے لئے بالکل تیار تھے۔ لیکن ابھی تک

اُنہیں پھپھیکو کی باتوں کا پورا یقین نہ تھا محفل برخاست ہونے کے بعد ہم لوگ عبدالحمید کو الگ کمرے میں لے گئے۔ موجو میاں نے اپنی بندوق اس کی چھاتی پر رکھ دی اور کہا سچ سچ بتا تو کون ہے۔ نہیں تو ابھی تیرا خاتمہ کر دوں گا۔ پہلے تو اُس نے کچھ ہیر پھیر کی مگر جب دیکھا کہ واقعی موجو میاں غصّہ میں دیوانے ہو رہے ہیں اور جھوٹ بولا تو ضرور مار ڈالیں گے۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ آپ میری جان چھوڑ دیجئے۔ میں سب حال بتائے دیتا ہوں۔

اس کا اصلی نام قاسم تھا اور وہ رانی باڑی کے زمیندار چودھری غلام جبار کا ملازم تھا۔ غلام جبار موجو میاں کے پُرانے حریف اور مخالف ہیں۔ خصوصاً جب سے کونسل کے انتخاب میں موجو میاں سے ہار گئے تھے اُن کی جان اور آبرو کے دشمن ہو گئے تھے۔ موجو میاں کو بے عزّت کرنے کے لئے اُنہوں نے یہ فتنہ کھڑا کیا۔ حمید کے چچا بھی موجو میاں سے ناراض ہیں۔ کیونکہ اُنہوں نے پارسال موجو میاں سے دو ہزار روپیہ قرض مانگا تھا مگر موجو میاں نے نہیں دیا۔ اس لئے وہ آسانی سے غلام جبّار کی سازش میں شریک ہو گئے۔ اسی طرح اسکول کے ماسٹر اور عبدل جرّاح کو بھی اُنہوں نے روپیہ کے لالچ سے اپنا مددگار بنا لیا۔ حمید کے چچا اور رحچی نے گھر کے سارے حالات قاسم کو بتا دیئے۔ اُس نے دیبی پور آ کر اپنے کو عبدالحمید ظاہر کیا۔ یہاں کسی نے اُس کو نہ پہچانا۔ آخر حمید کے چچا اور رحچی رانا گڈھ سے بلوائے گئے اور اُنہوں نے بہت کچھ شک و شبہ کے بعد کہا کہ یہ عبدالحمید ہی ہے۔ پھر عبدل جرّاح اور ماسٹر نے شناخت کیا۔ اب شبہ کی کوئی گنجایش نہ تھی۔ سب نے متفقہ طور پر اُس کو عبدالحمید تسلیم کر لیا۔ موجو میاں کو اور ہمیں سب کو یقین ہو گیا کہ یہ عبدالحمید ہی ہیں۔ موجو میاں کی خوشی بیان سے باہر تھی۔ اُنہوں نے از سرِ نو سکینہ بی بی کی شادی کا جشن منانے کی تجویز کی۔ کل رات سکینہ بی بی کو پھر ایک بار دُلہن اور قاسم کو دولھا بنایا گیا۔ سُنا ہے

جب رات کو دُلہن دولہا ایک جا ہوئے اور قاسم نے سکینہ بی بی کا گھونگٹ کھولنا چاہا تو وہ جھجک کر پیچھے ہٹ گئیں اور کہا پہلے میری ایک بات کا جواب دے دیجئے اس کے بعد مجھے ہاتھ لگائیے گا۔ قاسم نے کہا سر آنکھوں سے، فرمائیے کیا بات ہے!" سکینہ بی بی نے کہا "یہ بتائیے کہ شادی کی رات کو کس بات پر ہماری آپ کی تکرار ہو گئی تھی؟" قاسم نے کہا "بی بی! اب گڑے مُردے اُکھاڑنے سے کیا حاصل، جانے دو ان باتوں کو، رنج کی یاد کرنے سے کیا فائدہ۔ کچھ اور باتیں کرو۔ اس ذکر سے تکلیف ہوتی ہے!" سکینہ بی بی نے کہا "نہیں۔ یہ بات تو میں آپ سے پوچھ کر رہوں گی!" قاسم نے تنگ ہو کر کہا:۔

"اٹھارہ برس کی بات ہے اب تو مجھے یاد نہیں کہ آپ نے کیا کہا تھا۔ اور میں نے کیا کہا تھا!"

قاسم کا یہ جواب سُن کر سکینہ بی بی پلنگ سے اُتر کر دور جا کھڑی ہوئیں۔ شک تو اُنہیں پہلے سے تھا۔ مگر اب یقین ہو گیا کہ یہ عبدالحمید نہیں ہیں۔ قاسم نے پھر کچھ اختلاط کرنا چاہا۔ سکینہ بی بی نے نہایت برہمی کے ساتھ جھڑک دیا کہ دیکھو اگر مجھے ہاتھ لگایا تو اپنی اور تمہاری جان ایک کر دوں گی۔ اگرچہ سب لوگوں نے تمہیں عبدالحمید تسلیم کر لیا ہے۔ مگر میرے نزدیک تم ہرگز عبدالحمید نہیں ہو۔

قاسم نے بہت کچھ چالیں چلیں۔ خوشامد کی، منت سماجت کی، پھر گرم ہوا، دھمکیاں دیں، زوجیت کے حقوق جتائے، پھر نرمی برتی، محبت کا اظہار کیا، قدموں پر سر رکھ دیا۔ جھوٹ موٹ کے آنسو بھی بہائے، مگر سکینہ بی بی تو آخر سکینہ بی بی ہیں اُن پر کسی بات کا اثر نہ ہوا۔ قاسم جب سب جتن کر کے ہار گیا تو اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ اس وقت سکینہ کو اُس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ آخر جائے گی کہاں، آج نہیں کل اُسے میری بیوی بننا ہی پڑے گا۔ رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔ لہذا

چادر تان کر سو گیا۔ سکینہ بی بی نے ساری رات زمین پر بیٹھ کر کاٹی۔ اور روتے روتے صبح کر دی۔ صبح کو یہ تمام قصہ سکینہ بی بی کی بوڑھی دایہ کی زبانی موجو میاں کے کان تک پہنچا۔ اُنہوں نے مجھ سے بیان کیا۔ میں نے کہا بہتر یہ ہے کہ ابھی کچھ دنوں عبدالحمید مردانہ میں رہیں اور سکینہ بی بی کے ساتھ اُنہیں تنہائی میں یکجائی کا موقع نہ دیا جائے کچھ دنوں کے بعد دیکھا جائے گا۔ ہم دونوں کا خیال تھا کہ سکینہ بی بی کو محض توہمات نے گھیرا ہے۔ کیونکہ ہمیں قاسم کے عبدالحمید ہونے کا یقین کامل تھا۔ اب یہ قصہ درپیش ہوا۔ موجو میاں جب قاسم کی اپنی زبان سے اُس کے جرم کا اقرار سُن چکے تو ایک لمحہ کے لیئے بالکل سناٹے میں آ گئے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ کیا کرنے والے ہیں۔ اُنہوں نے یکایک اپنی بندوق اُٹھائی اور دھڑ سے قاسم کے گولی ماردی۔ میں ہکّا بکّا دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ قاسم کی آواز تک نہ نکلی۔ وہ دھم سے زمین پر گرا۔ میں بدحواس ہو کر اس کی طرف لپکا۔ اتنے میں موجو میاں نے دوسری گولی اپنے ماری اور اس طرح پانچ منٹ میں دونوں کا خاتمہ ہو گیا۔ دراصل موجو میاں بڑے غیرت مند آدمی تھے۔ اگرچہ اُنہیں تحقیق طور پر معلوم تھا کہ سکینہ بی بی اور قاسم میں میاں بی بی کا تعلق نہیں ہوا۔ پھر بھی یہ ذلت کیا کم تھی کہ ایک نامحرم نے ساری رات اُن کی بیٹی کے ساتھ تنہائی میں گذاری۔ لوگ خدا جانے کیا کیا کہتے۔ وہ کس کس کا منہ بند کر سکتے تھے۔ خدا غارت کرے اس "الکشن بازی" کو جس نے لاکھ کا گھر خاک کر دیا۔ اور ابھی کیا ہے خدا جانے کس کس پر آفت آئے گی (مقفل کمرہ کی طرف اشارہ کر کے) دونوں لاشیں اس کمرہ کے اندر خون میں ڈوبی پڑی ہیں۔ بندوق بھی وہیں پڑی ہے۔ میں نے کسی چیز کو چھوا چھیڑا نہیں۔ جوں کا توں رہنے دیا۔ تھانہ میں اطلاع بھیج دی ہے پولیس کا انتظار ہے۔ سکینہ بی بی رات بھر کی جاگی ہوئی تھیں۔ آج نیند آ گئی تھی۔ مگر بندوق کے فیر اور پھر سینکڑوں آدمیوں کا شور و غل۔ جاگ اُٹھیں۔ جب اُنہیں اس واقعہ کی اطلاع ہوئی

تو دیوانہ وار زنانی ڈیوڑھی سے باہر نکل آئیں۔ پردہ کیسا اُنہیں اپنی جان ہی کا ہوش نہ تھا میں نے بڑی مشکل سے پھر اُنہیں زنانہ میں پہنچایا۔"

رات کے باقی گھنٹے جس اضطراب و انتشار میں ہم نے گذارے اس کا بیان کم از کم میری طاقت سے تو باہر ہے۔ صبح ہوتے پولیس بھی آپہونچی۔ حمید کے چچا، چچی، عبدل جراح ماسٹر چکرورتی، بھیکو بندر والا۔ سب حراست میں لے لئے گئے۔ پولیس نے سب کے بیان لئے۔ اس کے بعد سکینہ بی بی کا بیان قلم بند کرنا چاہا۔ ہم سب لوگ زنانی ڈیوڑھی پر پہونچے۔ ابوالبرکات کے والد نے دایہ کو بلا کر کہا کہ سکینہ بی بی کو دروازہ کے پاس بھیجدو۔ اُس نے کہا کہ سکینہ بی بی تو ابھی اٹھیں نہیں۔ رات جب آپ گھر میں پہونچا گئے تھے تو کچھ دیر تک تو پاگلوں کی طرح آنگن میں گھومتی رہیں۔ پھر اپنے کمرہ میں چلی گئیں۔ دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ تھوڑی دیر تک تو اُن کے رونے کی آواز آتی رہی۔ پھر خاموش ہوگئیں۔ ہم لوگوں نے خیال کیا کہ صدمہ سے جان آدھی ہو گئی ہے، رو رو کے الگ ہلکان ہوئی ہیں۔ تھک کے پڑ گئی ہیں۔ نیند آگئی ہوگی۔ اسی لئے کوئی اُدھر گیا نہیں، شاید ابھی تک سو رہی ہیں، یا یوں ہی پڑی ہوں گی۔ ابوالبرکات کے والد نے کہا۔" اچھا اب جگا دو۔ اور بلا لو۔ دایہ گئی اور تھوڑی دیر میں گھبرائی ہوئی آئی کہ حضور میں نے سیکڑوں آوازیں دیں۔ بہت کنڈی کھٹکھٹائی مگر وہ تو بولتیں ہی نہیں۔ دروازہ اندر سے بند ہے۔ ہم سب گھبرا گئے۔ اندر گئے اور ابوالبرکات کے والد نے بہت آوازیں دیں۔ زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا، مگر صدائے برنخاست، سب ایک دوسرے کو پر معنی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ آخر یہ تجویز ہوئی کہ دروازہ توڑا جائے۔ دروازہ توڑا گیا۔ سب سے پہلے دایہ کمرہ میں گئی۔ اُس نے کمرہ میں داخل ہوتے ہی ایک خوفناک چیخ ماری۔ سب دوڑ پڑے اور کمرے کے اندر پہونچ کر جو منظر دیکھا اس کے تصوّر سے آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور دل دھک دھک کرنے لگتا ہے۔

سکینہ بی بی کا بستر، کپڑے، جسم، سب خون میں شرابور تھے۔ ایک برق دم چھری آدھی سے زیادہ اُن کے سینے میں پیوست تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ پریم! کیا بتاؤں وہ صورت کیسی تھی۔ تم مبالغہ سمجھوگے۔ مگر خدا کی قسم حُسن کا جو تخیل بھی تمہارے ذہن میں ہوتا سکینہ بی بی کو دیکھنے کے بعد کہیں بلند ہو جاتا۔ اُس بے روح پیکر کی رعنائی میں تم سے کیا بیان کروں۔ ہونٹوں پر ایک خفیف سی مُسکراہٹ تھی۔ چہرے پر ملکوتی معصومیت عالمِ قدس کی یاد دلاتی تھی، خون میں ڈوبی ہوئی لاش، بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ سُرخ پھولوں کی چادر اوڑھے نیکی کا فرشتہ میٹھی نیند سو رہا ہے۔"

10/7

سچّی کہانی

(سماج کا انصاف)

"انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ جرم کی سزا ہر مجرم کو برابر ملنی چاہیئے۔ لیکن ہماری سماج کا قانون اس اصول کو تسلیم نہیں کرتا۔ چنانچہ اگر کسی اخلاقی جرم کے ارتکاب میں عورت اور مرد برابر کے شریک ہوں تو سزا صرف عورت ہی کو دی جاتی ہے۔ نہ صرف اس قدر بلکہ اگر یہ بھی ثابت ہو جائے کہ جرم کا اصلی محرّک اور باعث مرد ہے، تب بھی عورت ہی تقصیر وار گردانی جاتی ہے اور سزا پاتی ہے۔ اس قسم کے واقعات ہر جگہ اور ہر روز پیش آتے رہتے ہیں۔ ذیل کا واقعہ جو نواب زادہ مسٹر جاوید قصری نے مجھ سے بیان کیا 'سماج کے انصاف' کی ایک تازہ مثال ہے۔"

(پریم پجاری)

رشید صاحب کو میں برسوں سے جانتا ہوں، ہمارے محلہ میں رہتے ہیں، کپڑے کی چھوٹی سی دکان ہے، کوئی چالیس سال کا سن ہے۔ خود شعر نہیں کہتے۔ مگر شعر فہمی کا بہت اچھا مذاق رکھتے ہیں، میرے یہاں اکثر آتے ہیں۔ سنا ہے کسی زمانے میں پولیس

میں سب انسپکٹر تھے، کسی وجہ سے نوکری جاتی رہی۔ جب سے کپڑے کی دکان کر لی ہے
نجی حالات پوچھنے کی میری عادت نہیں۔ اس وجہ سے نہ کبھی میں نے پوچھا نہ انہوں نے
بتایا کہ نوکری کیوں جاتی رہی۔

ایک دن میں لکھنؤ سے کان پور جا رہا تھا۔ اسٹیشن پر رشید صاحب بھی مل گئے
کان پور سے کچھ کپڑا لینے جا رہے تھے۔ جاڑوں میں صبح کی گاڑی سے عموماً کم ہی لوگ
کان پور جاتے ہیں۔ ریل کا جو ڈبہ ہم سے قریب تھا اس میں سوار ہونے کے لئے ہم
بڑھے۔ رشید صاحب آگے آگے تھے، میں پیچھے پیچھے۔ رشید صاحب نے گاڑی کے
پائیدان پر قدم رکھا اور اندر داخل ہونا ہی چاہتے تھے کہ یکایک رک گئے اور کوئی آدھے
منٹ تک پائیدان ہی پر کھڑے رہے۔ جیسے گاڑی کے اندر کسی کو دیکھ کر جھجک گئے
پھر اُتر آئے۔ میں نے پوچھا خیر تو ہے۔ کہا، ہاں کوئی خاص بات نہیں۔ آیئے برابر
والے ڈبہ میں بیٹھیں گے۔ میں نے اُس ڈبہ میں جھانک کر دیکھا۔ ایک کونے میں ایک
عورت بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ اُس کی صورت نظر نہ آئی، اخبار کی اوٹ تھی، دروازے
کے قریب دو کھدر پوش بیٹھے کسی سیاسی مسئلہ پر گفتگو کر رہے تھے۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا کہ
رشید صاحب کیوں اس ڈبہ میں نہ بیٹھے۔ بہرحال میں ان کے ساتھ برابر والے کمپارٹمنٹ
میں سوار ہو گیا۔ ہم دونوں کے سوا اس ڈبہ میں اور کوئی مسافر نہ تھا۔ گاڑی چل پڑی۔ رشید
صاحب کچھ پریشان نظر آ رہے تھے۔ میں نے پوچھا "کیوں رشید صاحب! اس ڈبہ میں
کیوں نہ بیٹھے؟" کہنے لگے "میں نے سوچا کہ اکیلے بیٹھیں گے اور آپ سے اشعار سنتے
چلیں گے۔" اُن کے اس جواب سے میری تسلی نہ ہوئی۔ میں نے کہا "یہ بات نہیں۔ سچ
بتایئے معاملہ کیا ہے۔" انہوں نے کہا "کوئی راز کی بات تو نہیں۔ لیکن اسے سن کر آپ
مجھے واہمہ پرست سمجھنے لگیں گے۔ خیر مضائقہ نہیں۔"

"یہ واقعہ آج سے پندرہ سال قبل کا ہے۔ اُس وقت میں پولیس میں سب انسپکٹر تھا

رخصت پر گھر آیا ہوا تھا۔ اور ایک ضرورت سے اسی گاڑی سے کانپور جا رہا تھا،
میں جب ڈبّہ میں سوار ہوا اُس میں ۵ آدمی پہلے سے موجود تھے۔ دو کھدّر پوش مرد
دروازہ کے قریب بیٹھے باتوں میں مشغول تھے۔ دوسری طرف ایک جوان لڑکی کونے
کی سیٹ پر اور دو مرد اُس کے مقابل بیٹھے آہستہ آہستہ اُس سے کچھ کہہ رہے تھے
ان میں سے ایک جوان تھا، بہت ہی خوبصورت اور بانکا جوان، قیمتی سوٹ پہنے،
لیکن چہرے سے عیاری ٹپکتی تھی۔ دوسرا بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہو چکا تھا مگر تندرست
و توانا۔ بظاہر پیسے والا، مگر صورت سے کچھ بیوقوف معلوم ہوتا تھا۔ جس وقت ریل
نے سیٹی دی وہ دونوں گاڑی سے اُتر گئے اور قبل اس کے کہ گاڑی روانہ ہو اُنہوں نے
اپنا راستہ لیا۔ لڑکی تصویر حیرت بنی انہیں دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ دونوں نظر سے
اوجھل ہو گئے اور گاڑی چل پڑی۔

لڑکی کا سن کوئی اُنیس بیس برس کا ہو گا۔ ممکن ہے کچھ زیادہ ہو، گوری چٹی۔ بھرا بھرا
جسم۔ آنکھیں تو سچ مچ کنول کے پھول تھیں۔ وائل کی فیروزی ساڑی میں اُس کا مہتابی چہرہ
ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے چودھویں کا چاند ستھرے نکھرے آسمان میں جلوہ گر ہے۔ کیا بتاؤں
کس غضب کی دلربا صورت تھی، ادھر گاڑی چلی، اُدھر اُس نے اخبار اُٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔
میں اگرچہ مقابل کی سیٹ پر بیٹھا تھا، مگر اچھی طرح اُسے دیکھ نہ سکتا تھا، اس کا چہرہ اخبار کی
اوٹ میں تھا۔ پانچ سات منٹ کے بعد اُس نے اخبار سامنے سے ہٹایا تو میں نے دیکھا کہ
اُس کی دونوں آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے، ساڑی کے آنچل سے اُس نے
آنسو پونچھے۔ ایک غلط انداز نگاہ مجھ پر ڈالی۔ پھر اُن دو کھدّر پوشوں کی طرف دیکھا۔ جو
ہم دونوں سے دور گاڑی کے دوسرے سرے پر دروازہ کے قریب بیٹھے زور زور سے
باتیں کر رہے تھے۔ مہاتما گاندھی، نان کوآپریشن، کانگریس، پنڈت جواہر لال، سوراج
عدم تشدد، یہ الفاظ بار بار سنائی دیتے تھے۔ اپنی گفتگو میں وہ ایسے منہمک تھے کہ غالباً

انہیں یہ خبر بھی نہ تھی کہ اُن کے سوا کوئی اور بھی اس گاڑی میں بیٹھا ہے۔

لڑکی کی نظر اب کھڑکی کے باہر کھلی ہوئی فضا میں بھٹکتی پھر رہی تھی، وہ اپنے خیالات میں بالکل کھوئی ہوئی تھی۔ قصری صاحب! میں نے اپنی ملازمت کی مختصر مدت میں کئی بار بڑے بڑے خطروں کا مقابلہ کیا۔ بڑے بڑے سرکش بدمعاشوں اور خونی مجرموں کو اکیلا باندھ کر لے آیا۔ وہ جن کی مونچھوں سے چنگاریاں اُڑتی تھیں میرے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سُن کر دہل جاتے تھے۔ میرے چابک نے بڑے بڑے سر پھروں کے بل نکال دیئے۔ ان باتوں سے میرا مقصود آپ کو اپنی بہادری جتانا نہیں۔ بلکہ صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جوانی کے اس نا عاقبت اندیش دور میں مَیں یہ جانتا ہی نہ تھا کہ خوف کس بلا کا نام ہے۔ مگر اس وقت خدا جانے مجھے کیا ہو گیا تھا، میں ہر چند چاہتا تھا کہ اس لڑکی سے بات کروں لیکن ہمت ہی نہ پڑتی تھی: جب زبان کھولنے کا ارادہ کرتا تھا میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا تھا۔ آخر ایک بار میں نے جی کڑا کر کے آہستہ سے کہا :۔

"آپ بہت ہی رنجیدہ اور پریشان ہیں ؟"

لڑکی اُسی طرح بُت بنی کھڑکی کے باہر دیکھتی رہی۔ گویا اُس نے میری بات سُنی ہی نہیں۔ کھدر پوش پہلے سے بھی زیادہ جوش کے ساتھ بحث کر رہے تھے۔ کچھ جواب نہ پا کر میں بھی کئی منٹ تک خاموش رہا۔ پھر دل نے مجبور کیا۔ پھر میں نے آہستہ سے اپنے اُنہیں الفاظ کو دُہرایا۔ وہ چونک پڑی، جیسے کوئی سوتے سے جاگ اُٹھے۔ اس نے پوچھا "کیا آپ نے مجھ سے کچھ کہا ؟" میں نے کہا "جی ہاں! میں نے یہ کہا تھا کہ آپ بہت ہی رنجیدہ اور پریشان نظر آتی ہیں"

لڑکی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا "بابو جی! اس پاپی دنیا میں خوش کون ہے ؟" یہ کہا اور پھر اُس کی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔ میرا خیال ہے کہ مَیں اُس زمانہ

میں کافی سنگ دل تھا۔ کسی کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھ کر مجھ پر اس سے زیادہ اثر نہیں ہوتا تھا جتنا کسی پر جلتی ہوئی شمع سے گرم گرم موم پگھلتے دیکھ کر ہو سکتا ہے لیکن اس کے ان لفظوں سے میرے دل پر چوٹ سی لگی۔ سچ یہ ہے کہ میرے لیئے یہ ایک بالکل نیا احساس تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اس سے بات کئے جاؤں اور ہو سکے تو اس کے حالات معلوم کروں۔ میں نے پوچھا "آپ کہاں جا رہی ہیں؟" ساڑی کے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے کہا "یہ تو مجھے خود بھی نہیں معلوم"

ظاہر ہے کہ یہ جواب بالکل مہمل تھا۔ مگر قصری صاحب! میں آپ سے بہ قسم کہتا ہوں کہ مجھے اس کے معصوم چہرے اور صادقانہ لہجہ نے یقین دلا دیا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے سچ کہہ رہی ہے، میرے دل پر اور بھی چوٹ لگی۔ حیران تھا کہ اب میں اس سے کیا سوال کروں۔ آخر میں نے کہا "شاید میری یہ جرأت آپ کو ناگوار گذری ہو کہ میں نے کیوں آپ سے باتیں شروع کر دیں۔ مگر آپ کے آنسوؤں نے مجھے مجبور کر دیا۔ آپ کو روتا دیکھ کر میرے دل پر سخت چوٹ لگی اور میں نے یہ محسوس کیا کہ ضرور آپ پر کوئی بھاری مصیبت پڑی ہے اور اب تو مجھے یقین ہے کہ میرا خیال صحیح ہے"

"تعجب ہے" اس نے کسی قدر حقارت آمیز انداز سے کہا۔

"تعجب کس بات کا؟" میں نے پوچھا۔

"یہی کہ ایک مرد ہو کر آپ کو ایک دکھیاری عورت کی بپتا پر ترس آگیا"

"آپ مردوں کی طرف سے بہت ہی بدگمان معلوم ہوتی ہیں۔ مگر سب مرد ایک سے نہیں ہوتے"

"آپ مسلمان ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں" میں نے کہا۔

"ممکن ہے آپ کی قوم کے لوگ ہندوؤں سے کچھ مختلف ہوتے ہوں۔"

"اس میں قوم اور مذہب کا کوئی سوال نہیں، اچھے اور بُرے سب فرقوں میں ہوتے ہیں۔"

"شاید"، اُس نے آہستہ سے کہا۔

"آپ سے ایک التجا ہے۔ اگر آپ منظور کریں۔ ایک اجنبی ہوتے ہوئے مجھے یہ توحق نہیں کہ آپ سے کوئی درخواست کروں، لیکن مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اگر میں اس وقت خاموش رہا تو شاید زندگی بھر مجھے افسوس رہے گا۔ میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ کی کوئی خدمت مجھ سے ہو سکے تو مجھے اُس کے انجام دینے میں بہت خوشی ہوگی۔"

"آپ کی ہمدردی کا شکریہ.... لیکن..... اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔

تھوڑے سے وقفہ کے بعد میں نے کہا "آپ یکایک خاموش کیوں ہوگئیں" "لیکن" "کیا؟"

"لیکن یہ کہ آپ نے جو کچھ کہا بغیر سوچے سمجھے کہا ہے۔ کیا مذہبی اور سماجی قانون اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ آپ ایک "گری ہوئی" عورت کی مدد کریں۔ ایسی گنہگار عورت جو سوسائٹی کی نظر میں زندہ جلا دیئے جانے کے لائق ہے۔"

میں حیران تھا کہ اس بات کا کیا جواب دوں۔ آخر میں نے کہا "گناہوں کی سزا دینے کا اختیار صرف خدا کو ہے۔ ہمیں نہیں۔ لیکن کسی کو مصیبت میں دیکھ کر اس کی مدد کرنا انسانی فرض ہے۔ اس لئے میں نے آپ سے یہ درخواست کی۔"

"مجھے یقین ہے کہ اگر آپ کو میرے حالات معلوم ہو جائیں تو آپ کو اس کا بھی افسوس ہوگا کہ آپ نے مجھ سے بات بھی کیوں کی۔ خیر مجھے اس کی پروا نہیں۔ مجھ سے نفرت کرنے والے جہاں وہ لوگ ہیں جنہیں ساری دنیا سے زیادہ مجھ سے محبت کرنی چاہئے تھی وہاں اگر ایک آپ بھی ہوں تو میرا کیا بگڑتا ہے۔"

وہ یہیں تک کہنے پائی تھی کہ ایک اسٹیشن آگیا، ریل ٹھہر گئی، ہم دونوں خاموش ہوگئے۔ دونوں کھدر پوش پہلے سے بھی کچھ زیادہ سرگرمی کے ساتھ اپنی بحث میں مصروف تھے۔ مگر اتنی بلند آواز سے نہیں، انارکسٹ، بغاوت، خفیہ پولیس، بم، سیکرٹ سوسائٹی ٹیررسٹ، بنگال اور ایسے ہی کئی اور لفظ ہمارے کانوں تک پہنچے۔ گاڑی چل پڑی۔

میں نے کہا۔ "ہاں تو پھر اپنی رام کہانی سنائیے"!

"بہت چھوٹی کہانی ہے، اگرچہ میری زندگی کے بیس برس میں تکمیل ہوئی ہے وہ صاحب جو عینک لگائے ہوئے تھے۔ بڑے بوڑھے سے، وہ میرے پتا جی تھے اور وہ دوسرے جوان جو اُن کے ساتھ تھے وہ میرے چچا کے بیٹے ہیں۔ کوئی آٹھ مہینے ہوئے بیرسٹری پاس کرکے ولایت سے واپس آئے ہیں، اُن کا نام شیام سندر ہے۔ مجھ سے پانچ برس بڑے ہیں۔ بچپن ہی سے وہ مجھے بہت چاہتے تھے، میرا بہت لاڈ کیا کرتے تھے۔ قدرتی طور پر مجھے بھی اُن سے دل لگاؤ پیدا ہوگیا۔ پھر بھی مجھے یہ اندازہ نہ تھا کہ میں انہیں اس قدر چاہنے لگی ہوں۔ بی۔ اے پاس کرکے جب وہ بیرسٹری پڑھنے ولایت چلے گئے تب مجھے احساس ہوا کہ اُن کے بغیر دنیا کی تمام خوشیاں مجھ سے چھن گئی ہیں۔

ہم لوگوں میں مسلمانوں کی طرح چچازاد بہن بھائیوں کی آپس میں شادی نہیں ہوسکتی۔ اس لئے مجھے یقین تھا کہ میری ساری زندگی فقط نامرادی میں جینے اور رونے کے لئے ہے۔ ولایت سے وہ مجھے برابر خط لکھتے رہے اور کچھ اس انداز سے لکھتے تھے کہ میرے دل میں روز بروز نئی نئی اُمنگیں اور نئی نئی اُمیدیں پیدا ہوتی جاتی تھیں۔ تین برس سہانے خواب دیکھنے میں گذر گئے جس دن وہ لکھنؤ پہونچے اُسی رات کو انہوں نے مجھ سے کہا کہ "شکنتلا! اب ہم زیادہ دنوں تک، جدا نہیں رہ سکتے، ایسے ہمیں بہت جلد ایک ہوجانا چاہیے"!

"مگر یہ کیسے ممکن ہے شیام!" میں نے کہا۔
"ممکن کی ایک ہی کہی" انہوں نے مسکرا کر جواب دیا "میں ہندوؤں کے اس پرانے قانون کو نہیں مانتا کہ ہماری شادی صرف اس لئے نہیں ہو سکتی کہ ہم دو سگے بھائیوں کی اولاد ہیں، تمہیں پانے اور اپنا بنانے کے لئے میں ساری دنیا کو چھوڑ سکتا ہوں!"
گرمیوں کے دن تھے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ کشمیر لے گئے۔ اماں جی بھی ساتھ تھیں وہ ہمیشہ سے کمزور ہیں زیادہ چل نہیں سکتیں۔ اس لئے وہ اکثر کشتی ہی میں رہتی تھیں اور شیام اور میں سیر کو نکل جاتے تھے۔ گھنٹوں کشمیر کی خوبصورت وادیوں میں گھومتے پھرتے، کشمیر دنیا کی جنت، اس کے دل فریب مناظر، سبزے اور پھولوں کی بہار، بھرپور جوانیاں، محبت سے لبریز دل، پھر آزادی اور تنہائی اور اس بات کا یقین کہ ساری دنیا کی مخالفتوں کے باوجود اب ہم زندگی بھر ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ آہ جو نہ ہونا تھا ہوا۔ گرمیاں ختم کر کے ہم کشمیر سے واپس آ گئے، جلد ہی میں نے یہ محسوس کیا کہ میں ایک بچّہ کی ماں بننے والی ہوں۔ میں نے شیام سے کہا کہ اگر جلد تم نے شادی کی کوئی تدبیر نہ نکالی تو مجھے مر جانے کے سوا چارہ نہ ہوگا شیام نے کہا تم گھبراؤ نہیں میں خود اسی فکر میں ہوں، مگر چپکے چپکے انہوں نے میرے پتاجی کے کان بھرنے شروع کئے اور اس بات کا یقین دلا دیا کہ کالج کے کسی لڑکے سے میرے ناجائز تعلقات ہیں۔ جن کا شرمناک نتیجہ جلد ظاہر ہونے والا ہے۔
بات کو طول کہاں تک دوں، انہوں نے پتاجی کو یہ مشورہ دیا کہ خاندان کی عزت بچانے کے لئے مجھے قربان کر دینا چاہیے۔ پتاجی کو ان پر بڑا بھروسہ ہے، وہ مان گئے اور یہ فیصلہ کیا کہ مجھے لکھنؤ سے کہیں دور، بہت دور، ہمیشہ کے لئے چلا جانا چاہیے۔ اور اگر کبھی میں نے گھر کی واپسی کا ارادہ کیا تو قتل کر ڈالی جاؤں گی

ابھی تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ شیام کا ولایت سے آیا ہوا ایک خط میری نظر پڑ گیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ اُنہوں نے لندن میں ایک میم سے شادی کر لی ہے اور جلد اُسے ہندوستان بلانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ میرے کوئی بھائی بہن نہیں ہے اس لئے میرے چلے جانے کے بعد شیام ہی میرے پتاجی کے مال کے وارث ہوں گے۔ اس دولت کے لالچ نے اُنہیں اندھا کر دیا، اور اپنا راستہ صاف کرنے کے لئے اُنہوں نے مجھ کو اور میری محبت کو قربان کر ڈالا۔ اب مجھے ریل میں بٹھا گئے ہیں۔ کان پور کا ٹکٹ لے دیا ہے کہ وہاں سے جہاں میرے سینگ سمائیں چلی جاؤں؟"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی اور پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے میں نے کھدر پوشوں کی طرف دیکھا کہ وہ ادھر تو نہیں دیکھ رہے ہیں۔ وہ بدستور اپنی بحث میں مشغول تھے۔ سودیشی، بائیکاٹ، کھدر، سوشلزم، سرمایہ دار اور ایسے ہی کئی اور لفظ میرے کانوں تک پہنچے۔ میں کہہ نہیں سکتا شکنتلا کی یہ دکھ بھری کہانی سُن کر میرے دل پر کیسی چوٹ لگی۔ طرح طرح کے خیالات اس وقت میرے دماغ میں آ رہے تھے۔ کبھی سوچتا کہ اس بدمعاش شیام سندر کی مشکیں باندھ کر حوالات میں بند کر دوں اور اس پر اغوا کا مقدمہ چلا کر جیل خانہ بھجوا دوں۔ کبھی خیال آتا کہ مار کوڑوں کے اس بے وقوف بڈھے کی کھال اُدھیڑ دوں۔ کبھی جی میں آتا کہ شکنتلا کو اپنے گھر لے جاؤں اور اس کی حفاظت کروں، تاکہ وہ کوئی خطرناک اقدام نہ کر بیٹھے۔

میں ان ہی خیالات میں غلطاں پیچاں کوئی فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ شکنتلا نے اپنے زیورات اُتارنا شروع کئے اور اُتار کر نہایت احتیاط کے ساتھ اپنے رومال میں باندھے۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا:۔

"آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات کہوں"۔ میں نے کہا "ضرور کہیے"۔ اُس نے زیوروں کی پوٹلی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا:۔

"یہ چیزیں اب میرے لئے بیکار ہیں کبھی نہ کبھی طرح ضائع ہی ہو جائیں گی اس لئے میں چاہتی ہوں کہ آپ انہیں لے لیں۔ آپ کے کام آئیں گی"۔

زیور یقیناً ہزار بارہ سو کا مال تھا اور ایک لمحہ کے لئے مجھے اس خیال سے خوشی ہوئی کہ اتنی رقم کی چیز مفت ہاتھ آرہی ہے۔ مگر فوراً ہی میرے ضمیر نے اس خیال پر مجھے ملامت کی اور ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ خدا جانے آگے چل کر کیا پیچیدگیاں پیدا ہوں، اس لئے میں نے کہا کہ "میں آپ کی مہربانی کا دل سے شکر گذار ہوں، لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے اس قیمتی تحفہ کو قبول نہیں کر سکتا آپ بُرا نہ مانیں"۔

اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی کے ساتھ کچھ سوچنے لگی۔ پھر پوٹلی کھول کر سارا گہنا دوبارہ پہن لیا۔ اتنے میں ایک اور اسٹیشن آیا۔ گاڑی ٹھہر گئی، وہ کھڑی ہو گئی۔ میں حیران تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ کیا یہیں اتر جائے گی۔ وہ بالکل خاموش کھڑی رہی، میں بھی خاموش تھا۔ گاڑی چل پڑی، وہ دو قدم چل کر ہماری طرف والے دروازے کے پاس جا کھڑی ہوئی اور کھڑکی کے باہر سر نکال دیکھنے لگی، گاڑی پوری رفتار سے جا رہی تھی کئی اسٹیشن آئے اور نکل گئے۔ شکنتلا اسی طرح کھڑکی سے باہر سر نکالے خاموش کھڑی رہی۔ کھدر پوش اپنے مباحثہ میں مصروف تھے۔ میں اپنی جگہ خاموش بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔

اب ریل گنگا کے پل پر سے گذر رہی تھی۔ شکنتلا نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور نہایت تیزی کے ساتھ دریا میں کود پڑی۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا "ارے"! کھدر پوش اچھل پڑے اور پوچھا "کیا ہوا؟" میں نے کہا "وہ گنگا میں کود گئی"۔

ایک نے کہا "کون ؟" میں نے کہا "وہ عورت" دوسرے نے پوچھا "تمہاری عورت ؟" میں نے کہا "میری عورت نہیں۔ وہ ہندو عورت جو لکھنؤ میں سوار ہوئی تھی" اُس نے کہا "ہم نے تو سوار ہوتے نہیں دیکھا" دوسرے نے بڑھ کر زنجیر کھینچ لی۔ گاڑی پل ہی پر رُک گئی۔ بہت سے لوگ اُتر پڑے۔ ہجوم ہو گیا۔ واقعہ معلوم ہونے پر سب اس طرف دوڑے جہاں شکنتلا ریل سے کودی تھی، مگر وہ کب کی تہہ آب ہو چکی تھی۔ وہاں اب کیا دھرا تھا۔ دریا کی موجیں خدا جانے اُسے کدھر بہا لے گئیں۔

مجھے حراست میں لے لیا گیا۔ مقدمہ چلا، ہزاروں روپیہ میرا خرچ ہو گیا۔ مشکل سے جان بچی، مگر نوکری جاتی رہی۔ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں برابر والے ڈبہ میں کیوں سوار نہیں ہوا۔ ایک عورت اور دو کھدّر پوشوں کو اُس میں بیٹھا دیکھ کر پُرانے واقعات میری آنکھوں کے سامنے پھر گئے اور میرے دل میں یہ وہم آیا کہ کہیں اس مرتبہ پھر ویسا ہی کوئی حادثہ پیش نہ آ جائے۔ اُس مرتبہ تو جان بچ گئی تھی، اب کے خدا جانے کیا اُفتاد پڑے۔

9/7

سچّی کہانی

خواب کی تعبیر

مَیں نہ خواب کا قائل، نہ تعبیر خواب کا، نہ روح کا، نہ عالمِ ارواح کا۔ لیکن دل کسی طرح اس پر آمادہ نہیں ہوتا کہ سوتے میں جس فردوسِ نگاہ کی گُل چینی کی بیداری میں اُسے محض جلوۂ سراب تصور کرکے رعنائیِ خیال کو برباد کردوں۔ پھر یہ خواب اور بعد میں پیش آنے والے واقعات باہم اس طرح مربوط معلوم ہوتے ہیں، جیسے ایک زنجیر کی کڑیاں: اگر یہ خود فریبی ہے تو خدا کرے یہ طلسم فریب کبھی نہ ٹوٹے۔ میں نے جو کچھ دیکھا کاش دوسروں کو بھی دکھا سکتا اور زنانِ مصر کی اُنگلیاں کاٹ لینے کی داستان پھر ایک بار تازہ ہو جاتی۔

کئی برس کی بات ہے ایک تصنیف کے سلسلہ میں رات کو دو دو تین تین بجے تک کام کرنا پڑتا تھا۔ ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ کام کے انہماک میں ساری رات یوں ہی کٹ گئی، اور مجھے خبر نہ ہوئی۔ صبح ہوتے اللہ اکبر کی صدا کان میں آئی تو چونکا۔ بہت تھک گیا تھا۔ آنکھیں نیند سے بند ہوئی جاتی تھیں، لیٹ گیا، اور لیٹتے ہی

سو گیا۔ خواب میں بہت کم دیکھتا ہوں، اس قدر کم کہ اس تیس بتیس برس کی عمر میں پانچ سات مرتبہ سے زیادہ خواب دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا اور دیکھا بھی تو وہی باتیں جن کا دن میں تصور رہتا یا جو وقتاً فوقتاً آماج گاہِ خیال بنی رہی تھیں، مگر یہ آخری خواب یقیناً "رویائے صادقہ" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ "ایک پیکرِ جمال و رعنائی، گُل ہائے بہار کی طرح شگفتہ و شاداب، حریر سفید کا لباس پہنے میرے سامنے جلوہ فرما ہے، صبیح چہرے کی ضیا، پتلے پتلے گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ کی جھلک، ابریشمیں پلکوں کا بانکپن، بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کی کشش کس طرح بیان کروں! جن لفظوں میں بیان کرتا ہوں حقیقت کا خون ہوا جاتا ہے کس چیز سے تشبیہ دوں، میں نے تو ویسی کوئی شے کبھی دیکھی ہی نہیں۔ جنت کا قائل ہوتا تو اس نورِ مجسم کو حور سمجھتا، بشرطیکہ حوروں میں جذبات کا وجود تسلیم کر لیا جائے۔ جلوۂ جمال سے مسحور ہو کر بے خود نہ ہو جاتا تو شاید "ہذا ربّی" کہکر سربسجود ہو جاتا۔ یکایک وہ ہونٹ ہلے۔ میں سراپا گوش تھا "لیجیے یہ آپ کی امانت"! اتنا کہا اور ایک چھوٹا سا پیکٹ میری طرف بڑھایا۔ بے اختیار میرے ہاتھ اُس "امانت" کو لینے کے لئے اُٹھے اس کے بعد کیا ہوا کچھ یاد نہیں۔ سو کر اُٹھا تو خلافِ معمول دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، طبیعت میں ایک اضطراب تھا، گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا، گویا اس خوابِ سحر گاہی پر حقیقت کا گمان تھا، اور مجبور آنکھیں اپنی گم شدہ بہشت کی تلاش میں سرگرداں تھیں۔ قارئین محترم! آپ کا جی چاہے باور نہ کیجئے، آپ کا جی چاہے مجھ پر ہنسیئے، مگر میں نے عہد کیا ہے کہ واقعات کو بے کم و کاست بیان کروں گا۔ یکایک اُس "امانت" کا خیال آیا جو خواب میں مجھے سپرد کی گئی تھی۔ فوراً تکیہ اُٹھا کر دیکھا کہ کہیں اس کے نیچے تو نہیں۔ مگر وہاں کیا دھرا تھا۔ نگاہیں مایوس ہو کر پلٹیں۔ ٹھیک اُسی وقت میری چھوٹی بہن "زبیدہ" کمرے میں آئی اور میری

اس ناکام جستجو کو دیکھ کر بولی "بھائی جان آپ کیا تلاش کر رہے ہیں؟" زبیدہ کے سوال نے گویا میری آنکھیں کھول دیں۔ میں نے کہا "کچھ نہیں" زبیدہ چلی گئی اور میں نے اپنے جی میں کہا "سبحان اللہ! کیا کہنا اس عقل و دانش کا۔ کوئی اور ایسی حرکت کرتا تو اُسے جاہل، احمق، واہمہ پرست اور خدا جانے کیا کیا خطاب ملتے۔ مگر اب خود جناب کو کیا کہا جائے"۔ کئی دن گذر گئے مگر جی کی بیکلی نہ گئی۔ آنکھیں ہر وقت اور ہر جگہ اُسی مجسمۂ حسن و شباب کو ڈھونڈتی تھیں۔ سوچتا تھا کہ آخر مجھے کیا ہو گیا۔ خواب کی حقیقت خیال سے زیادہ نہیں، پھر خیالی مخلوق کا وجودِ خارجی کہاں سے آئے۔ پہلے میں سمجھتا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان فرماں رواؤں میں "اکبر"، اور یورپ کے سلاطین میں روس کا آخری زار "نکولا"، غالباً ساری دنیا کے واہمہ پرستوں کے بادشاہ تھے۔ مگر اب اپنی موہوم پرستی کے آگے تو یہ دونوں خرافاتی بھی گرد ہو گئے۔ کچھ دنوں سے اپنے حافظہ سے شکایت تھی کہ کچھ یاد نہیں رہتا۔ مگر یہ خواب تو کسی طرح فراموش ہونے میں نہیں آتا۔ دن گذرتے گئے اور رفتہ رفتہ وہ خیال دھندلا ہوتا گیا۔ لیکن صفحۂ خاطر سے بالکل محو نہ ہوا بلکہ کبھی کبھی تو یہ نقش اس درجہ اُبھر آتا کہ معلوم ہوتا آج پھر وہی خواب دیکھا ہے۔

اس واقعہ کو پورے دو مہینے گذر گئے۔ ایک دن دوپہر کے وقت میں کھانا کھانے کے بعد اخبار دیکھ رہا تھا کہ پوسٹ مین نے کئی خط اور ایک چھوٹا سا پارسل لاکر دیا۔ پارسل پر پتا کسی اجنبی کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، اندازِ تحریر نسوانی، مگر میرے لئے بالکل ناآشنا تھا، دماغ پر بہت زور دیا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ کہ اس پارسل کا بھیجنے والا کون ہے۔ ڈاک خانہ کی مُہر سے صرف اتنا پتا چلا کہ لکھنؤ سے آیا ہے۔ بھیجنے والے کا نام بڑھا نہ گیا اور پتا "معرفت پوسٹ ماسٹر۔ لکھنؤ" تحریر تھا، آخر کھولا، اور کھولنے پر اس میں سے جو چیز نکلی اُسے دیکھ کر حیرت و مسرت

سے دل کی عجیب کیفیت ہوگئی۔ یہ میری "بیاض اشعار" تھی۔ جو ایک برس پہلے ریل کے سفر میں گم ہوگئی تھی اور میں اس کے واپس ملنے سے مایوس ہو چکا تھا۔ بیاض کھولی تو اُس میں سے ایک ہلکے گلابی رنگ کا لفافہ نکلا۔ جو کسی ہلکے مگر نہایت نفیس عطر میں بسا ہوا تھا۔ خواہ مخواہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی راز کا انکشاف ہونے والا ہے دل نے خلافِ عادت زور زور سے دھڑکنا شروع کر دیا۔ آخر لفافہ چاک کر کے خط نکالا۔ خط کی پیشانی پر نہ پتا، نہ مقام، نہ تاریخ، جس طرح آغاز میں الفاظ خطاب غائب اُسی طرح خاتمہ پر لکھنے والے کا نام ندارد مضمون یہ تھا:۔

"لیجئے یہ آپ کی امانت۔ آج سے چند روز پہلے تک مجھے آپ کا پتا معلوم نہ ہوسکا ورنہ آپ کی بیاض کب کی آپ کو پہونچ جاتی ——— آپ تو غالباً اس کے واپس ملنے سے مایوس ہو چکے ہوں گے۔ مگر خدا میں سب کچھ قدرت ہے۔ اس مہینہ کے ——— میں آپ کا مضمون "اکبر کی واہمہ پرستی" نظر سے گذرا۔ آپ برا نہ مانیں تو کہوں کہ مجھے اُردو کے ایک شاعر سے ایسی پاکیزہ انگریزی کی توقع ہرگز نہ تھی۔ پھر واقعات کو جس خوبصورتی سے سجایا ہے، کیا کہنا۔ پڑھ کر جی خوش ہوگیا۔ اتفاق سے مضمون کے خاتمہ پر آپ کا پتا بھی درج تھا۔ آپ کی بیاض، آپ کے اشعار اور نظموں کا مجموعہ نہیں بلکہ اچھی خاصی آپ کی سوانح عمری ہے۔ جسے میں نے بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھا اور اکثر حصّہ سمجھ میں بھی آگیا۔ مگر بعض اشعار میرے لئے معمّا ہیں۔ مثلاً یہ شعر ؎

غم سے دل خون ہوا اور آنکھ میں صہبائے نشاط
یہ کہیں میرے ہی تخیّل کی پرواز نہ ہو

یا مثلاً یہ شعر ؎

اُف یہ کیا میں نے کیا۔ آئینہ کیوں چوم لیا
ہائے کیا ہو، نظر آتا نہیں اب عکس جمال

غالباً یہ اشعار خاص واقعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن کی تفصیل معلوم ہوئے بغیر ان کا مطلب سمجھ میں نہیں آسکتا۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خدانخواستہ آپ کے اشعار میں

کوئی خرابی ہے۔ بلکہ یہ میری سمجھ اور استعداد کا قصور رہے جو نہ سمجھ سکی۔ غالباً آپ کو اپنی یہ بیاض بہت عزیز ہوگی۔ تعجب ہے کہ آپ نے اِسے ریل میں سیٹ پر کیسے چھوڑ دیا۔ جب ایک مدت تک آپ کا پتا نہ معلوم ہوا تو مجھے یقین ہوگیا تھا کہ غالباً یہ بیاض اب میرے ہی پاس رہے گی اور اسی غلط یقین کے باعث مجھ سے ایک غلطی ہوگئی۔ پہلے ارادہ ہوا کہ اس غلطی کو آپ سے چھپاؤں اور اگر اس خیال پر قایم رہتی تو آپ کو کبھی اس کا پتا بھی نہ چلتا۔ مگر پھر سوچا کہ آخر سچ کہہ دینے میں کیا حرج ہے۔ آپ کی بیاض پر میں نے اپنی چند غزلیں اور کچھ متفرق اشعار لکھ لیے تھے۔ بیاض آپ کے پاس بھیجنے سے پہلے ارادہ ہوا کہ وہ اوراق پھاڑ لوں، جن پر میرے اشعار لکھے ہیں۔ پھر سوچا کہ رہنے دو۔ میں کیا اور میرے شعر کیا۔ لکھے رہے تب کیا اور پھاڑ لیئے تب کیا۔ پھر ورق پھاڑنے میں بیاض کے خراب ہونے کا بھی ڈر تھا۔ اُمید ہے کہ آپ میری اس غلطی کو معاف کر دیں گے۔ ہاں آپ کی اجازت کے بغیر میں نے آپ کے بہت سے اشعار نقل کر لئے ہیں۔ اس کے علاوہ پڑھتے پڑھتے جب کوئی شعر بہت پسند آیا تو بے اختیار میں نے اُس پر صاد (ص) بنا دیا اب جو دیکھتی ہوں تو آپ کی ساری بیاض ان نشانوں سے بھری ہوئی ہے اس کا بھی مجھے کوئی حق نہ تھا۔ اس لیئے معافی چاہتی ہوں۔ اگر میں اپنے کو اس کا اہل سمجھتی تو ضرور آپ کے کلام کی داد دیتی۔ جو یقیناً آپ کے احساسات کی تصویر اور آپ کے دل کی آواز معلوم ہوتا ہے۔ آپ کا ایک شعر زندگی بھر نہ بھولے گا ؎

جب کسی سے کوئی پیمانِ وفا کرتا ہے
کانپ اُٹھتا ہوں کہ میرا ہی سا انجام نہ ہو

والسّلام

کن الفاظ میں بیان کروں کہ اس خط کے پڑھنے کے بعد میری کیا کیفیت ہوئی جذبات بھڑک اُٹھے۔ ایک آگ تھی کہ سینے میں بھر گئی۔ دو مہینے پہلے جو خواب دیکھا تھا یہ اُس کی تعبیر تھی۔ مگر اب کیا کروں کس طرح اُس جادوگر کا پتا لگاؤں، نہ نام، نہ مقام، نہ پتا نہ نشان، کہاں ڈھونڈوں، کس سے پوچھوں، پھر بھی امکان بھر کوئی تدبیر اُٹھا نہ رکھی۔ سبھی جتن کئے، لکھنؤ میں بہت کوچہ گردی کی۔ بہت خاک چھانی مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ آخر تڑپ تڑپ کر بیٹھ رہا۔ اب بھی جب خیال آتا ہے تو کلیجہ پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ نمونے کے طور پر اُس شاہد رعنا کے چند شعر یہاں نقل کرتا ہوں اور قارئین ساقی سے التماس ہے کہ اگر کسی صاحب نے یہ اشعار کہیں سنے ہوں، یا کہیں دیکھے ہوں، یا لکھنے والے کا کچھ پتا معلوم ہو تو للہ مجھے بتائیں، زندگی بھر احسان نہ بھولوں گا۔

اُردو کے ہر دَور کی شاعرہ خواتین کا کلام میری نظر سے گذرا ہے۔ مگر یہ رنگ تو مجھے کہیں نظر نہیں آتا۔ یہ تو اشعار نہیں نشتر ہیں، زہر میں بجھے ہوئے نشتر، جی چاہتا تھا کہ چند شعروں پر تفصیلی تنقید لکھوں اور ان کے محاسن پر روشنی ڈالوں مگر پھر خیال آیا کہ اس تنقید کو میری نادیدہ شیفتگی کا نتیجہ سمجھا جائے گا اور اصل مقصود فوت ہو جائے گا۔ لہذا اس کا فیصلہ اہلِ نظر کے ذوقِ سلیم پر چھوڑتا ہوں کہ یہ اشعار کس پائے کے ہیں۔

×××

اِک تری یاد ہے، اللہ کرے یاد رہے
زندگانی کا سہارا ہے تصوّر تیرا

×××

بس تم رہو سلامت ہم کیا کریں گے جی کے
دو بھر ہیں بے تمہارے دو دن بھی زندگی کے

×××

قیدِ ستم میں بُلبُل، آہیں اگر بھروں میں — زنداں تو چیز کیا ہی گردوں کو پھونک دوں میں
خود کو ہلاک کر دوں، قصّہ ہی پاک کر دوں — جب تجھے نہیں ستم گر، دنیا میں کیا رہوں میں
پہلو میں میرے تو ہو، جینے کی آرزو ہو — مرنے کی جستجو میں کس واسطے جیوں میں
اے کاش اِس زباں میں ایسا اثر ہو پیدا — کونین کانپ اُٹھیں فریاد جب کروں میں
وہ بے خبر ہے مجھ سے میں بے خبر ہوں خود سے — کیا حالِ دل سُنے وہ، کیا حالِ دل کہوں میں

* * *

پُرلطف و دل پذیر مری داستاں کہاں — ہو بھی اگر تو مجھ میں مجالِ بیاں کہاں
ہر شاخِ گُل جگہ ہے مرے آشیانے کی — اب دیکھنا ہے برق گرے گی کہاں کہاں
اُس نے تو بزمِ ناز سے مجھ کو اُٹھا دیا — لے جائیں اب مجھے مری مایوسیاں کہاں
مدّت ہوئی چمن میں نشیمن مرا نہیں — گرتی ہیں کوند کوند کے اب بجلیاں کہاں
کچھ روز اور رہنے دے صیّاد باغ میں — پھر ہم کہاں، بہار کہاں، آشیاں کہاں
چاکِ قفس سے پھر مری حسرت بھری نگاہ — جاتی ہے آشیاں پہ، مگر آشیاں کہاں

* * *

جہاں تک استدلال کا تعلق ہے عقل آج بھی تسلیم نہیں کرتی کہ خواب کی کوئی حقیقت ہے۔ مگر یہ آخری خواب ایک ایسا معمّا ہے جس کی کوئی تاویل سمجھ میں نہیں آتی۔

سچّی کہانی

(حُسن فروش جوان)

جوانی کی شور انگیزیاں اللہ اللہ، جان دے دینا ایسا سہل معلوم ہوتا ہے جیسے ریل میں بیٹھ کر ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن تک چلا جانا۔ جہاں کوئی ناکامی ہوئی اور مرنے کی سوجھی۔ خصوصاً ناکامِ محبت کا علاج موت کے سوا نہیں، گولی مار کر، ریل کی پٹری پر لیٹ کر، دریا میں ڈوب کر، پھانسی لے کر، زہر کھا کر، غرض کسی نہ کسی طرح "نامراد" زندگی کا خاتمہ کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ بقول مرزا اسد اللہ خاں غالب ؎

تم نہ آؤ گے تو مرنے کی ہیں سو تدبیریں ۔۔۔ موت کچھ تم تو نہیں ہو کہ بلا بھی نہ سکوں[1]

---

[1] دیوان غالب کا حمیدیہ ایڈیشن جس وقت شائع ہوا میں لاہور میں تھا میں نے بھی اس کا ایک نسخہ منگایا اور پڑھنا شروع کیا، رات کا وقت تھا پڑھتے پڑھتے سو گیا۔ خواب میں دیکھا کہ دیوان غالب (حمیدیہ ایڈیشن) پڑھ رہا ہوں اور اس میں یہ دو شعر بھی موجود ہیں جو آج تک کسی اور ایڈیشن میں نظر سے نہیں گذرے تھے، ؎

آگ لگ جائے اگر گھر کو تو اندیشہ کیا ۔۔۔ شعلۂ دل تو نہیں ہے کہ بجھا بھی نہ سکوں

تم نہ آؤ گے تو مرنے کی ہیں سو تدبیریں ۔۔۔ موت کچھ تم تو نہیں ہو کہ بلا بھی نہ سکوں

صبح کو جب سو کر اٹھا تو خواب مجھے یاد تھا اور اشعار بھی۔ فوراً دیوان غالب (حمیدیہ ایڈیشن) اٹھا کر دیکھا مگر اس میں ان اشعار کا کہیں پتا بھی نہیں۔ وہی تین شعر "زہر ملتا نہیں الخ" درج تھے جو سب مروجہ ایڈیشنوں میں ملتے ہیں، حیرت تھی کہ خواب میں یہ دو شعر کیوں کر یاد آ گئے۔ وقتاً فوقتاً اکثر احباب کو سنائے، مگر کسی نے اقرار نہ کیا کہ یہ اشعار کبھی کہیں نظر سے گذرے ہیں۔

(پریم پجاری)

ہمیں بھی ناکامی ہوئی، ہم نے بھی جان دینے کی ٹھانی۔ لیکن گھر میں نہ بندوق نہ تمنچہ، گولی ماری جائے تو کیوں کر، چھری سے بھی کام لیا جا سکتا تھا۔ لیکن گو سفند قربانی کے خاک و خون میں تڑپنے کا منظر بارہا آنکھوں نے دیکھا تھا، مرغ بسمل کا پھڑکنا بھی اکثر نظر سے گذرا تھا۔ لہذا جسمانی اذیت کے خیال نے اپنے اوپر "خنجر آزمائی" سے باز رکھا۔ دراصل انسانی خون اور وہ بھی خود اپنا خون، پانی کی طرح بہتے دیکھنا، میرے لئے موت کی بھیانک صورت سے زیادہ روح فرسا تھا۔ رہا ریل کے نیچے لیٹ جانا تو یہ خود ایک طول عمل ہے، گھر سے میل دو میل چلو تو ریل کی پٹری ملے، پھر کوئی دیکھ لے تو سارا پروگرام غلط۔ یہی قباحت ڈوب مرنے میں ہے۔ کیونکہ نل کی بدولت بڑے بڑے شہروں سے کنوئیں تو اس طرح ناپید ہو گئے ہیں جس طرح آجکل کی تعلیم یافتہ لڑکیوں کے دل سے ماں بننے کی خواہش، رہا دریا تو وہ ہاتھ کے داؤں کہاں، پھانسی سے مجھے ہمیشہ سے نفرت ہے۔ یہاں تک کہ اس ہنگامی جنون کے عالم میں بھی پھانسی کا پھندا میری نظر میں نفرت انگیز ہی رہا۔ لہذا اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ "درد ناکامی" کا وہی علاج کیا جائے جو سوداگر کی بیٹی یعنی "زہر عشق" کی ہیروئن نے کیا تھا۔ مگر وہی دشواری ہمیں بھی پیش آئی جو مرزا غالب کو پیش آئی تھی اور جس کا انہوں نے اپنے اس مشہور شعر میں ذکر کیا ہے، ؎

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر! ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

اس لئے کہ جس طرح مرزا غالب کے زمانہ میں زہر پر لائسنس تھا (غالباً ہوگا)، اسی طرح آج بھی ہے اور آج سے بارہ برس پہلے بھی تھا، جب ہمیں زہر کی ضرورت پڑی تھی، مرنا بھی ہر حال ضروری تھا، سوچا کہ اب کیا کریں، خیال آیا کہ آخر دنیا میں ہر چیز کا بدل ہے، کیا ایسی اور کوئی چیز نہ ہوگی جو زہر کا کام دے اور بلا دقت دستیاب

ہو جائے، آخر ایک بات سمجھ میں آ گئی - خدا بخشے، امی جان کو داد کا ایک نہایت کامیاب مرہم کسی نے بتایا تھا وہ ہمیشہ بنایا کرتی تھیں اور ضرورت مندوں کو مفت دیا کرتی تھیں[1]، ایک دفعہ وہ مرہم بہت دنوں تک رکھے رکھے خراب ہو گیا - امی نے اُسے کوڑے پر پھینک دیا، ہمارے آنگن میں ایک بیری کا پیڑ تھا - ایک کوّا اُس پر بیٹھا تھا - اُس کی جو شامت آئی تو تیر کی طرح لپکا اور گھی سمجھ کر اس مرہم کی ایک چونچ بھر لی اور کھا گیا اور پھر پیڑ پر جا بیٹھا - چند منٹ گذرے ہوں گے کہ دھڑ سے نیچے گر پڑا اور تڑپ تڑپ کر مر گیا - اگرچہ کئی برس گذر چکے تھے لیکن یہ واقعہ مجھے یاد تھا اور اس مرہم کے اجزا بھی معلوم تھے یعنی خالص موم، تل کا تیل اور ہائیڈراجرائی ایمونیٹا - میں نے سوچا کہ لاؤ ہائیڈراجرائی ایمونیٹیا سے سنکھیا کا کام لو - چنانچہ فوراً ایک پڑوس کے ڈاکٹر سے چار آنے کا ہائیڈراجرائی ایمونیٹیا خریدا - باریک پیس کر پڑیا بنائی اور سرہانے رکھ لی، اس کے بعد چار خط لکھے - ایک اُس "بانیِ فساد" یعنی رشیدہ کے نام، ایک کوتوال شہر کے نام، ایک اَبّا کے نام جو اُن دنوں پردیس میں تھے، اور ایک امّی جان کے نام، سب میں اپنے مرنے کی وجہ مختلف بیان کی تھی، وہ چاروں خط نہایت دلچسپ تھے اور ایک جنون زدہ دماغ کی اس کشمکش کی مکمل تصویر جو زندگی کے آخری لمحوں میں حسرتِ زیست اور آرزوئے مرگ سے پیدا ہوتی ہے۔

اب شام ہو چکی تھی - خطوں سے فارغ ہو کر ٹائم پیس میں دو بجے پر الارم لگایا اور اپنے ایک نہایت رازدار "دوست" سید صاحب سے ملنے گیا - یہی سید صاحب بعد کے واقعات سے ان تمام "ہنگاموں" کے ذمہ دار اور کامیاب "حریف" ثابت ہوئے، میں نے انہیں سب حال بے کم و کاست سُنا دیا - اُنہوں نے مجھے میرے ارادے سے باز رکھنے کی "بظاہر" کوئی کوشش نہیں کی - گلے مل کر رونے لگے اور کہا خدا انجام بخیر کرے۔

[1] داد کا یہ لاجواب مرہم جن صاحب کو درکار ہو ایڈیٹر ساقی کی معرفت مجھ سے بلا قیمت منگا سکتے ہیں! (مریم بخاری)

رات کے دو بجے گھڑی نے الارم بجایا۔ میں کچھ سوتا تھا کچھ جاگتا تھا۔ گھبرا کر اٹھا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سینہ میں گوناگوں جذبات کا ایک طوفان برپا تھا۔ مرگ و زیست کی تمنّاؤں میں آخری جنگ ہو رہی تھی، نامراد زندگی سے جی سیر ہو چکا تھا پھر بھی جینے کی آرزو دل کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی تھی۔ جو بھیانک رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں آفتاب کی ایک مضمحل کرن کی طرح کبھی کبھی چمک اٹھتی تھی اور اُس کی روشنی میں مستقبل کی بہت سی ناتمام تصویریں بڑی سرعت کے ساتھ یکے بعد دیگرے حرکت کرتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ یکایک ایسا معلوم ہوا کہ دن نکل آیا۔ زہر اپنا کام کر چکا ہے۔ میرا سرد مردہ جسم بستر پر بے حس و حرکت پڑا ہے۔ بہنیں، امّی جان اور دو چار عزیز مجھے گھیرے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر آیا، نبض دیکھی اور کہا "افسوس خاتمہ ہو گیا"۔ عورتوں میں کہرام مچ گیا۔ مرد سنّاٹے میں آ گئے۔ امّی جان غش کھا کر گریں۔ میری چھوٹی بہن انجم میرے گلے سے چمٹ گئی۔ مُنہ پر مُنہ رکھ دیا اور فریاد کرنے لگی "ہے ہے بھیّا ہم سے خفا ہو گئے بولتے نہیں، میں نے آپ کے لئے تکیہ کا غلاف کاڑھا ہے، دیکھئے کیسا خوبصورت ہے انعام نہیں دو گے کیا؟ میں تو لے لوں گی۔ ہائے بولتے نہیں بھیّا، ہائے بھیّا۔ اپنی انجم سے نہیں بولتے۔ کیا کروں، ہائے کیا کروں اللہ۔

دفعتہً منظر بدلا، چاندنی کھلی ہوئی ہے۔ آبادی سے دور "شہرِ خموشاں" کے ایک گوشے میں ایک نئی سفید قبر، چاند کی زرد زرد اُداس روشنی میں ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے سفید ململ کی ساڑی میں لپٹی ہوئی ایک نوجوان بیوہ تنہائی اور بیکسی کے عالم میں اپنے اُجڑ جانے والے سہاگ اور جوانی کا ماتم کر رہی ہے۔ اتنے میں ایک گاڑی کی گھڑگھڑاہٹ سُنائی دی، راستہ کے کنارے گاڑی ٹھہر گئی۔ ہیں! یہ کون؟ رشیدہ! تنہا! رات کے وقت! قبرستان میں! کیوں؟ کس لئے؟ میرے سارے بدن میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ وہ آہستہ آہستہ آئی اور قبر کی پائینتی بیٹھ گئی۔ اُس کے پاس کچھ پھول تھے۔ وہ اُس نے قبر پر ڈال دیئے۔

کئی منٹ خاموش بیٹھی رہی۔ پھر اُس نے لوحِ مزار کی طرف دیکھا۔ اس پر لکھا تھا "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ" اُس کی گردن جھک گئی۔ پھر اُس نے سر اٹھایا اور آنسوؤں کے دو بڑے بڑے قطرے اُس کی آنکھوں سے ڈھلک پڑے۔

ابھی اِن جاگتے کے خوابوں کا سلسلہ جاری تھا کہ کلاک نے ادّھا بجایا میں چونکا ارے ڈھائی بج گئے۔ دنیا کی دلچسپیاں بار بار میرا دامن پکڑ کر کھینچتی تھیں اور مجھے زندہ رہنے پر مجبور کرتی تھیں لیکن ناکامی کی تلخیاں ہر بار میرے ارادہ کو استوار تر بنا دیتی تھیں فرشتہ مرگ کی بھیانک صورت اب مجھے بیوفا رشیدہ سے زیادہ مہربان نظر آتی تھی گھر میں سب لوگ سوئے ہوئے تھے۔ میں آہستہ سے اٹھا، دبے پاؤں آنگن میں گیا۔ صراحی سے گلاس میں پانی انڈیلا۔ اور خاموشی کے ساتھ اپنے بستر پر واپس آگیا۔ پھر ایک بار سب پر حسرت بھری نظر ڈالی، مجھے اُس وقت ایک چکّر سا آرہا تھا۔ مجھے وہ الفاظ معلوم نہیں جو اس شخص کے جذبات کی ترجمانی کر سکیں۔ جسے چند لمحوں کے بعد موت کی آغوش میں اَبدی نیند سوجانا ہے۔ پھر اپنی واقعی کیفیت کیسے بیان کروں۔ میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے تکیہ ہٹایا۔ چادر کا کونا اُلٹا اور ہائیڈ راجرائی امونیٹا کی پڑیا کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر وہ وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔ میں ایک سنّاٹے میں آگیا۔ بالکل مبہوت میرے حواس بالکل معطل تھے۔ اب میں کچھ سوچ نہیں سکتا تھا۔ کچھ دیر سر پکڑے بیٹھا رہا۔ پھر لیٹ گیا اور کروٹیں لیتے لیتے صبح ہوگئی۔ اس دوران میں اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے عجیب و غریب، ناممکن الوقوع اور مضحکہ خیز تدابیر میرے ذہن میں آئیں اُن کا ذکر بیکار ہے۔ اس لئے کہ عموماً ہر شخص کو زندگی میں ایک بار ضرور اس منزل سے گذرنا پڑتا ہے اور وہ ایسے ہی بے سر و پا افکار سے دوچار ہوتا ہے۔

سارا دن گذر گیا، اور میں کچھ فیصلہ نہ کرسکا کہ اب کیا کروں۔ ایک رات اور گذر گئی اور میں کسی نتیجہ پر نہ پہونچ سکا۔ دوسرے دن صبح کو سو کر اٹھا تو مجھے یکایک ایسا محسوس ہوا

جیسے میرے خیالات میں کوئی تغیر ہو گیا ہے جس طرح عدالتِ عالیہ بعض اوقات ایک خونی مجرم کی جوانی پر ترس کھا کر اُس کی سزائے موت کو حبسِ دوام میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اسی طرح میرے دل نے بھی یہ فیصلہ کیا کہ خودکشی کو جلاوطنی سے بدل دیا جائے دراصل یہ عقل کی بات تھی، مگر حیرت ہے کہ اُس وقت میرے دماغ میں کیسے آئی "اخلاقِ جلالی" میں جو فلسفۂ اخلاق کی ایک بے نظیر کتاب ہے۔ انہیں دنوں میں نے پڑھا تھا کہ "دور دراز کا سفر اختیار کرنا" اس "مرض کا بہترین علاج ہے" مگر اب سوال یہ تھا کہ آخر جاؤں تو کہاں جاؤں اور کس سلسلہ میں جاؤں۔ سیاحت، تجارت، ملازمت، گداگری آخر کیا کروں، ہر طرف نظر دوڑائی۔ آخر ایک دیرینہ دوست رشید کی طرف خیال گیا جن کے ساتھ میں نے مسلم ہوسٹل الٰہ آباد میں دو برس گذارے تھے۔ رشید بی، اے پاس کرنے کے بعد ولایت چلے گئے۔ اور وہاں سے آئی، سی، ایس۔ ہو کر آئے اور اب دو برس سے بنگال میں کسی جگہ سب ڈویزن آفیسر تھے، ایک مرتبہ یہ بھی سنا تھا کہ کلکتہ میں ہیں قبل اس کے کہ وہ ہندوستان واپس آئیں میری اُن کی خط و کتابت بند ہو گئی تھی لیکن اس سے ہماری دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ کم از کم میرا یہی خیال تھا۔ اور یہ خیال کچھ بے جا بھی نہ تھا۔ کالج کی تعلیم کے زمانہ میں رشید اور میں دو برس تک ایک کمرے میں رہے تھے۔ بارہا ایک پلنگ پر سوئے تھے، ایک گلاس میں پانی پیا تھا۔ ایک پلیٹ میں کھانا کھایا تھا۔ ایک دوسرے کے کپڑے پہنے تھے۔ ایک دوسرے کی کتابوں سے کام لیا تھا۔ ایک دوسرے کا روپیہ خرچ کیا تھا۔ حتیٰ کہ ایک دوسرے کی "چوری" نیز "سینہ زوری" میں حصہ لیا تھا۔ غرض ہر حال میں ایک دوسرے کے شریک رہے تھے۔

رشید کا خیال آتے ہی میں نے اپنا سوٹ کیس نکالا۔ کچھ گرم کچھ ٹھنڈے کپڑے اُس میں رکھے ہولڈال میں بستر باندھا۔ اپنے کمرے میں چپکے چپکے انہیں تیاریوں میں مصروف تھا کہ اچانک امّی جان آگئیں اور مجھے اس حال میں دیکھ کر متعجب ہو کر پوچھا

"کہاں جا رہے ہو؟" میں نے کہا "کہیں نہیں۔ ذرا لکھنؤ کا ارادہ ہے، پرسوں آ جاؤں گا انشاء اللہ۔" جس وقت یہ الفاظ میری زبان سے ادا ہوئے۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ایک عجیب قسم کا اضطراب مجھ پر طاری تھا۔ قدم ڈگمگا رہے تھے، مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ کان پور سے یہ میرا آخری سفر ہے۔ وطن واپس نہ آنے کا میں تہیہ کر چکا تھا۔ امی جان چلی گئیں۔ میں نے پھر اپنی چیزیں درست کرنی شروع کیں۔ میز کی دراز میں سے بٹوا نکالا۔ کھول کر دیکھا تو اس میں کل پانچ روپے سوا دو آنے۔ دل دھک سے ہو گیا، چکر سا آنے لگا۔ میں آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب میں نے محسوس کیا کہ دنیا کا سفر چاہے وہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو عاقبت کے سفر سے کہیں زیادہ مشکل ہے، وہاں چار آنے کی سنکھیا میں انسان آخری منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ یہاں کلکتہ تک جانے کے لئے کم سے کم دس روپے چاہئیں۔ اسی سوچ میں سر پکڑے بیٹھا تھا کہ اب کیا کروں۔ اتنے میں دروازے پر کسی نے آواز دی۔ یہ ہمارے منشی جی تھے دکانوں کا کرایہ وصول کر کے لائے تھے، اسّی روپیہ نقد انہوں نے میرے ہاتھ میں دیئے۔ اسّی روپے یوں بھی اسّی روپے ہوتے ہیں اور اس وقت تو مجھے اسی اشرفیوں سے زیادہ معلوم ہوئے، رات کی گاڑی سے میں کلکتہ روانہ ہو گیا راستہ میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ بجز اس کے کہ ایک رفیقِ سفر کا لوٹا گاڑی سے فاختہ کی طرح اڑ گیا۔ صورت یہ ہوئی کہ وہ گاڑی کا پٹ کھولے، دروازہ کے کنارے پر بیٹھے منہ دھو رہے تھے، اٹھے تو لوٹا وہیں چھوڑ دیا۔ میں برابر کی سیٹ پر لیٹا تھا۔ ریل پوری رفتار سے جا رہی تھی، دروازہ کھلا دیکھ کر میں نے کواڑ جو بھیڑا تو لوٹا آتش بازی کے انار کی طرح سرسراتا ہوا اڑا چلا گیا۔"

دوسرے دن شام کو کلکتہ پہونچ گیا۔ ایک چھوٹے سے ہوٹل میں قیام کیا۔ اگلے دن رشید کی تلاش میں نکلا۔ معلوم ہوا کہ وہ چھ ہفتے کی چھٹی لے کر شیلانگ گئے ہوئے ہیں۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی، مگر قدرت کو یہی منظور تھا۔ اس لئے کہ اگر رشید اس وقت کلکتہ میں

موجود ہوتے تو غالباً میری زندگی میں وہ خوفناک انقلاب کبھی رونما نہ ہوتا جس نے مجھے "اخلاقی دُنیا" کا بدترین مجرم بنا دیا۔ میں نے گناہ کئے، کر رہا ہوں، اور کرتا رہوں گا۔ اُن کی خوفناک سزائیں پائیں، پا رہا ہوں، اور پاتا رہوں گا۔ مگر اس سے میری ہمتیں پست اور میرے حوصلے شکست نہیں ہوئے۔ میں جو کچھ کرتا ہوں جان بوجھ کر کرتا ہوں اور اپنے کسی عمل پر کبھی متاسف نہیں ہوتا۔ تکرار گناہ سے مرتے دم تک اسی طرح قدرت سے انتقام لیتا رہوں گا۔ رشیدہ سے جُدا کر کے قدرت نے میری روح پر جو عذاب مُسلّط کر دیا اُسے آسانی سے نہیں بھلایا جا سکتا۔ معمولی زخم ہو تو بھر جائے، ناسور کیا بھرے سینہ کے اندر ہر وقت سلگتی رہنے والی آگ اس وقت ذرا بھڑک اُٹھی ہے۔ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اُسے توجہ سے سنئے۔ میں جانتا ہوں کہ میرے حالات اور خیالات سے واقف ہونے کے بعد آپ کو بھی مجھ سے نفرت ہو جائے گی، آپ مجھے سوسائٹی کے لئے ایک موذی مرض اور ایک مہلک وبا تصوّر کرنے لگیں گے۔ مگر مجھے اس کی پرواہ نہیں! ہزاروں بُرا کہنے والوں اور بُرا سمجھنے والوں میں اگر ایک آپ کی ذات بھی شامل ہو جائے تو اس سے میرا کیا بگڑتا ہے۔

ہمارے ہوٹل کا "پختہ کار" مینیجر بلا کا عیّار تھا۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر شیطان کو اس کی شاگردی کا موقع مل جاتا تو وہ عمر بھر اپنی اس خوش قسمتی پر ناز کرتا، ناجائز طریقوں سے روپیہ حاصل کرنے کے ہزاروں گر اُسے یاد تھے۔ ریس (گھوڑدوڑ) کا اُسے جنون تھا۔ مگر اُس دیوانگی میں بھی اُس کے ہوش کا یہ عالم تھا کہ ہمیشہ دوسروں کے روپیہ سے کھیلتا۔ ہار ہو تو روپیہ لگانے والے کی، اور جیت ہو تو یہ بھی برابر کے شریک، اس بدبخت نے چند ہی روز میں مجھے اپنے رنگ پر لگا لیا۔ میرے پاس اوّل تو روپیہ تھا ہی کتنا، خیر جس قدر بھی تھا اس میں سے کچھ تو "ریس بازی" کی نظر ہوا۔ کچھ ہوٹل کے "بل" میں چلا گیا۔ اب میں بالکل فقیر تھا۔ قرض پر زندگی کا مدار تھا جس کی مقدار

ہر روز خوفناک طریقہ پر بڑھتی جا رہی تھی، مینیجر کی "پراسرار" عنایتوں کے باعث میری معمولی آسائشوں میں ہنوز کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اب بھی میں اُسی کمرہ میں مقیم تھا، جس میں پہلے دن آ کر ٹھیرا تھا۔ اب بھی مجھے ویسا ہی اچھا کھانا ملتا تھا۔ جیسا نقد قیمت ادا کرنے والوں کو اور بھی جو چھوٹی موٹی ضروریات ہوتی تھیں اُن سب کا سر انجام مینیجر کے ذمہ تھا۔ اُس نے کبھی ایک لمحہ کے لئے مجھے یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ میں اُس کا قرض دار ہوں، میں اپنی سادہ دلی سے اس غیر معمولی مہربانی کو اُس کی شرافت اور نیک دلی پر محمول کرتا تھا مگر درحقیقت وہ محض "شیطنت" پر مبنی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ مجھ پر اس قدر حاوی ہو گیا کہ اس کے ہاتھوں میں میری حیثیت ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہ تھی، اُس کے حکم سے سرتابی کی مجھ میں مجال نہ تھی۔ اب وقت آ گیا تھا کہ وہ مجھے اپنے ناپاک مقاصد کی تکمیل کے لئے مسمریزم کے ایک معمول کی طرح استعمال کرے۔

اپنے گھر میں بچپن سے اپنے حُسن و رعنائی کا تذکرہ سنتا آیا تھا، جب ہوش سنبھالا تو آئینہ نے اس روایت کی تصدیق کی اور جوانی آئی تو صنفِ نازک کے روز افزوں التفات اور غیر معمولی میلان نے اُس پر مہر توثیق ثبت کر دی، مجھے اپنی خوبصورتی کا احساس ضرور تھا اور اس پر تھوڑا سا ناز بھی۔ مگر اپنے حُسن و شباب کی تباہ کُن قوتوں کا صحیح اندازہ ہرگز نہ تھا۔ میں ایک جوہر تھا ناتراشیدہ، تابشوں سے معمور لیکن جلا کا محتاج حُسنِ صورت کے ساتھ ساتھ قدرت نے سحرِ گفتار بھی عطا کیا تھا اور وہ تمام چیزیں جو شباب کی متوالی عورتوں کو دیوانہ بنا دینے کے لئے کافی ہیں۔ مگر اب تک ان قدرتی صلاحیتوں سے کام نہیں لیا گیا تھا۔ اُن کے نشوونما کے لئے ایک خاص قسم کی تربیت درکار تھی جو خدا نہ کرے کہ کسی کو نصیب ہو "پختہ کار"، مینیجر نے جلد میری ان صلاحیتوں کو سمجھ لیا اور اُن سے کام لینے کی تدبیریں سوچنے لگا، پہلے مجھے ریس کا چسکا لگایا۔ پھر قرض دے دے کر ممنونِ احسان بنایا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ میری خواہش، میرا ارادہ،

میرا اختیار، اُس کی خواہش، اُس کے ارادے اور اُس کے اختیار کے تابع اور مطیع ہو گئے اُس نے مجھے سکھایا کہ جھوٹ موٹ عورتوں سے عشق کس طرح کرنا چاہیئے۔ انہیں فریب دینے اور اپنی محبت میں مبتلا کرنے کے کیا طریقے ہیں۔ اُن کے بٹوے کس طرح خالی کرائے جا سکتے ہیں۔

مثال بہت رکیک ہے۔ مگر واقعہ کے عین مطابق جس طرح ایک نائکہ اپنی نوخیز نوچیوں کو "تماش بینوں" کے دل چھین لینے کے طریقے سکھاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح منیجر نے میری تربیت کی اور اس کے بعد میرے حُسن و شباب کو فروخت کرنا شروع کر دیا کلکتہ میں جس طرح عشرت پسند مرد، خوبصورت طوائفوں اور دوسری پیشہ ور یا غیر پیشہ ور عورتوں پر اپنی دولت برباد کرتے ہیں۔ اسی طرح وہاں عیش و عشرت کے گہواروں میں پلنے والی، مغربی آزادی کی فضا میں سانس لینے والی ایسی بہت سی "خوش مذاق" عورتیں بھی ہیں جو اپنے تنوّع پسند ذوق کی تسکین کے لئے مردانہ حُسن و شباب کو بھاری بھاری قیمتیں دے کر خریدتی اور اُس سے لطف اندوز ہوتی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ نسوانی حُسن کلکتہ میں ہاتھوں ہاتھ بک جاتا ہے اور بہت اچھی قیمت پاتا ہے مگر وہاں کے "مہذب" و "شریف" طبقۂ نسواں، نیز دولت مند طوائفوں میں مردانہ حُسن و شباب کے بھی کچھ گاہک نکل ہی آتے ہیں۔ ریس کے سلسلہ میں منیجر کی بہت سے اونچے اونچے گھرانوں میں رسائی تھی، اُس نے ہر جگہ میری غیبت میں کچھ اس طرح میری تعریف کی کہ لوگ مجھ سے ملنے کے مشتاق ہو گئے۔ رفتہ رفتہ میرا حلقۂ احباب جس میں بیشتر عورتیں تھیں کافی وسیع ہو گیا۔ کہیں بازار کے سودے کی طرح مجھے خریدا گیا کہیں "نشست برخاست" نے بے تکلّفی کی صورت اختیار کی، بے تکلفی دوستی بنی، دوستی عشق و محبت میں تبدیل ہو گئی، نتیجہ بہر حال واحد تھا۔

منیجر کے حکم کے مطابق مجھے یہ سب روپ بھرنے پڑتے تھے، منتیں کیں، آہیں بھریں، آنسو بہائے، قدموں پر سر رکھا۔ کیا کیا نہیں کیا۔ مگر میرے جذبات کو اس میں ذرّہ برابر

دخل نہ تھا۔ محبّت کا بہروپ بھرتے بھرتے اور عشق و عاشقی کی نقالی کرتے کرتے غالباً محبت کا احساس ہی میرے دل سے فنا ہو گیا تھا۔ میری حیثیت اُس بے جان ساز کی سی تھی جس میں سے کبھی ایسے غم انگیز نغمے نکلتے ہیں کہ سننے والوں کا کلیجہ مُنہ کو آنے لگتا ہے، اور کبھی ایسا آہنگِ مسرّت بلند ہوتا ہے کہ سامعین جوشِ نشاط سے بیتاب ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ کیفیت تاثر فقط سننے والے ہی تک محدود رہتی ہے، خود ساز متاثر نہیں ہوتا، نہ اُسے غم کا احساس ہوتا ہے نہ خوشی کا۔ دوسرے رُخ سے دیکھئے تو میں گویا ایک مجسمۂ سنگیں تھا۔ جس کی پرستش کی جاتی ہے۔ پرستار اپنے جوشِ عقیدت میں کبھی ہاتھ جوڑ کر اُس کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے، کبھی اُس کے قدموں پر سر رکھ دیتا ہے۔ کبھی فرطِ رقت سے آبدیدہ ہو جاتا ہے، کبھی گڑگڑا کے اُس سے اپنی مُرادیں مانگتا ہے۔ مگر پتھر کی بے جان مورت میں اُس کے جذبات کو سمجھنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت کہاں؟ وہ سمجھتا ہے کہ میرا بت سب کچھ سنتا ہے سب کچھ دیکھتا ہے، سب کچھ محسوس کرتا ہے اور جو کچھ میں اس سے مانگتا ہوں مجھے دے گا۔ مگر اس آرزو کا بر آنا معلوم۔ حُسنِ اتفاق سے اگر کوئی مُراد پوری ہو جائے تو وہ اُسے اپنے "بت" کی مہربانی پر محمول کرتا ہے۔ وائے نادانی! جس طرح فرطِ عقیدت میں انسان کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ اسی طرح جوشِ محبت بھی اُسے اندھا کر دیتا ہے۔ مجھے خوب یاد ہیں وہ چاندنی راتیں۔ جب حسین آنکھوں نے میرے لئے میرے آغوش میں آنسوؤں کے دریا بہائے ہیں۔ آہ، مجھے خوب یاد ہیں وہ رنگین خلوتیں جب حُسن کی ناز پروردہ جوانیاں محبت کی بھیک مانگنے کے لئے میرے قدموں پہ سرنگوں ہوئی ہیں۔ آہ سب کچھ یاد ہے۔ مگر کیا یہ نیازِ حُسن میرے قلب کو متاثر کر سکا؟ نہیں، کبھی نہیں۔ ذرّہ برابر نہیں۔ میرا دل ایک سنگ پارہ سے زیادہ بے احساس ہو چکا تھا ہائے میں نے کیسے کیسے معصوم دلوں کو محبت کے فریب دیئے کس کس طرح اپنا دیوانہ

بنایا اور جب یقین ہو گیا کہ حریف شکست کھا گیا یعنی میری جھوٹی محبت کے جال میں پھنس گیا تو پھر کیسا کیسا اُسے تڑپایا ہے۔ کس کس بیدردی سے اُسے ذبح کیا ہے، اس لئے ہرگز نہیں کہ کسی کو مبتلائے اذیت دیکھ کر مجھے مسرّت ہوتی تھی۔ نہیں۔ میری روح ہنوز اس درجہ مسخ نہیں ہوئی تھی، میرا مقصد فقط اپنے حسن و شباب کی قیمت وصول کرنا تھا۔ اب زیادہ سے زیادہ جس قدر بھی وصول ہو سکے اور جس جس تدبیر سے وصول ہو سکے منّت سے یا ستانے سے مجھے بہرحال اپنے کام سے کام تھا۔

بعض اوقات جب کچھ اور ملنے کا امکان نہ ہوا تو میں نے قیمتی ساڑیاں تک لے لینے میں دریغ نہیں کیا۔ غرض جھوٹی محبت کی مجھے ایسی ایسی بھاری قیمتیں دی گئیں میرے فریب کی قربان گاہ پر ایسی ایسی گراں بہا قربانیاں پیش کی گئیں کہ اُن کی مثال شاید ہی مل سکے۔ مگر یہ سب کچھ منیجر کا "حق" تھا قیمتی لباس، عمدہ کھانا، سجا ہوا کمرہ، اور موٹر کی سیر۔ بس یہ میرا حصّہ تھا۔ ہاں کبھی کبھی ریس کھیلنے کے لئے دس بیس روپے بھی مل جاتے یہ بدبخت منیجر شیطان کی طرح میری روح پر مسلّط ہو گیا تھا میں اس کے اشاروں پر چلتا تھا۔ خدا جانے اُس نے مجھ پر کیا جادو کر دیا تھا کہ میں کسی بات میں اُس کی مخالفت کر ہی نہ سکتا تھا۔ پہلے پہلے مجھے اس کام سے سخت نفرت ہوئی، مگر رفتہ رفتہ وہ نفرت محض کراہت بن کر رہ گئی۔ کچھ مدّت کے بعد یہ احساس بھی فنا ہو گیا۔ اور اس قسم کا ہر عمل ایک مشین کی طرح مجھ سے صادر ہوتا تھا۔ آہ۔ قدرت۔ اگر رشیدہ کو بے وفائی پر آمادہ نہ کر دیتی تو کیا میری یہی حالت ہوتی؟ جس وقت یہ خیال آتا ہے تو میں غم و غصّہ سے دیوانہ ہو جاتا ہوں اور جوش غضب میں اپنے اس عہد کی تجدید کر لیتا ہوں کہ جب تک دم میں دم ہے گناہ کر کے قدرت سے اس بدسلوکی کا انتقام لوں گا جس نے میری روح اور میرے جسم کی تمام راحتوں کو ہمیشہ کے لئے مجھ سے چھین لیا۔ کہاں تک کہے جاؤں یہ مجذوب کی بڑ کہیں ختم ہونے والی ہے۔

ہاں تو جو بات میں کہنے والا تھا وہ رہ گئی۔ جذبات کے ہیجان میں سب کچھ بھول گیا ان دنوں میری خریدار ایک ایرانی "خانم" تھیں، اُن کا سن چالیس سال سے کم نہ تھا۔ رخساروں پر غازہ کی سرخی کے سوا جسے وہ کثرت سے استعمال کرتی تھیں۔ اب جوانی کی اور کوئی نشانی اُن میں باقی نہ تھی۔ مگر بُوالہوسی کے لئے عُمر کی قید نہیں۔ بلکہ بعض لوگوں کا تو خیال ہے کہ ؎

جوانی سے زیادہ وقت پیری جوش ہوتا ہے
بھڑکتا ہے چراغ صبح جب خاموش ہوتا ہے

جوش سے مُراد غالباً فرطِ ہوس ہے۔ یہی حال اُن "خانم" کا تھا۔ مگر اُن کی ٹھنڈی گرمیاں جلد ہی میرے لئے ناقابلِ برداشت ہوگئیں۔ اس لئے میں نے اب وہاں نہ جانے کا تہیّہ کر لیا تھا۔ منیجر میری اس "حماقت" سے سخت ناراض تھا، بہر حال میں نے اُس سے وعدہ کیا کہ دو تین ہفتہ کے اندر اندر انشاء اللہ اس سے زیادہ موٹا شکار پھانس کر دکھا دوں گا۔ اسی فکر میں کئی دن سے سرگرداں پھر رہا تھا۔ مگر ہنوز کامیابی کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ انہیں خیالات میں غلطاں پیچاں ایک دن صبح کے وقت میں ہوٹل سے نکلا کوئی آٹھ ساڑھے آٹھ بجے کا وقت تھا، میں اپنے افکار میں اُلجھا ہوا گردوپیش سے بالکل بے خبر، سڑک پر خاموش چلا جا رہا تھا کہ سامنے سے ایک موٹر آتی ہوئی دکھائی دی میں بے خیالی میں اپنے داہنے ہاتھ کو ہٹ گیا۔ چشم زدن میں موٹر بالکل سر پر آپہونچی، اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور فی الفور میں نے پوری قوت سے بائیں جانب کو جست کی موٹر نکل گئی۔ میں بچ گیا۔ بس یہیں تک مجھے یاد ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کا حال دوسروں سے سُنا۔ کیونکہ جب میں نے آنکھ کھولی اور ہوش آیا تو اپنے آپ کو ہسپتال میں پایا۔ سارا بدن زخموں سے چور، کپڑے خاک آلودہ، خون میں شرابور، سر میں سخت چوٹ آئی تھی۔ تکلیف سے بُرا حال تھا۔ میں نے ایک آہ کی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

کسی نے مجھ سے پوچھا "کیا حال ہے" یہ آواز نہ تھی۔ موسیقی کی ایک موج تھی جس سے میرے قلب میں ایک کیفیتِ اہتزاز سی پیدا ہو گئی۔ میں نے فوراً آنکھیں کھول دیں، ایک جوان خاتون میرے سرہانے کھڑی تھی۔ فرنگیوں کا سا گورا بھبوکا رنگ، سنہری بال، مگر نقوش ہندوستانی، کالی ساڑی میں گورا مکھڑا ایسا پیارا معلوم ہوتا تھا جیسے آدھی رات کو چودھویں کا چاند، ساڑی پر سفید ستارے ٹکے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تاروں بھرا آسمان زمین پر اتر آیا ہے۔ تھوڑی سی دیر کے لئے میں اپنی تکلیف کو بھول گیا اور میں نے اس کے چہرہ پر نظر جما دی، وہ سخت پریشان معلوم ہوتی تھی۔ اس نے پھر اپنا سوال دُہرایا۔ میں نے پھر اپنے دل میں ایک سنسنی سی محسوس کی مُسکرا کر میں نے کہا "اچھا ہوں"، میرے اس جواب سے وہ پھول کی طرح شگفتہ ہو گئی۔ گلابی ہونٹوں پر ایک خفیف سی مُسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ مجھے ایک کمرہ میں لے جایا گیا، جہاں میرے زخموں کی مرہم پٹی کی گئی، اس کے بعد ایک بڑے کمرہ میں جہاں اور بھی کئی مریض تھے مجھے ایک پلنگ پر لٹا دیا گیا۔ نرس سے میں نے پوچھا "یہ کالی ساڑی والی عورت کون تھی"؟ اس نے مُسکرا کر جواب دیا "آپ کی قاتل"، میں کچھ نہ سمجھا۔ مجھے حیران دیکھ کر نرس نے کہا "جس وقت آپ نے سامنے سے آنے والی موٹر سے بچنے کے لئے بائیں جانب کو جست کی، پیچھے سے ایک اور موٹر آ رہی تھی۔ یکایک آپ اس کے سامنے آ گئے، ٹکر ہوئی آپ تیورا کر گرے اور بیہوش ہو گئے۔ فوراً ہی آپ کو اُسی موٹر میں ڈال کر یہاں لایا گیا یہ اُس عورت کا بیان ہے۔ اب خدا جانے اس میں کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ"!

"مگر اس عورت کا اس حادثہ سے کیا تعلق ہے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"صرف اتنا تعلق ہے کہ وہ موٹر چلا رہی تھی اور آپ کو کچل دیا" نرس نے ایک شوخ مُسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"اچھا تو وہ خود ہی مجھے موٹر میں ڈال کر یہاں لائی ہے؟"

"جی ہاں وہ خود۔ بڑی رحم دل ہے بے چاری!"
ہسپتال میں کوئی تین ہفتے مجھ پر سخت تکلیف کے گذرے۔ شدت کا بخار آیا۔ مگر جلد ہی میری حالت درست ہو گئی۔ سر کا زخم بھی جو بظاہر اندیشہ ناک تھا رفتہ رفتہ اچھا ہو رہا تھا۔ میری جسمانی اذیت مینیجر کے لئے بظاہر حد درجہ اندوہ ناک تھی، وہ ہر وقت میرے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا، اور ہر طرح تسلی دیتا تھا، مگر درحقیقت وہ اپنے دل میں اس حادثہ سے بیحد مسرور تھا اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔ وہ مجھ سے اکثر کہا کرتا تھا "بھیّا! خدا کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں، نہ جانے اس میں اُس کی کیا مصلحت تھی۔ وہ جو کچھ کرتا ہے اپنے بندوں کی بہتری کے لئے کرتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس حادثہ اور مصیبت میں بھی ہماری کوئی بھلائی اُس کے مدنظر ہو اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ط تکلیف کے بعد راحت لازمی ہے۔ دیکھو تو پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔"

نرس کے بقول میری "قاتل"، یعنی سیاہ ساڑی والی خاتون اس دوران میں کئی بار مجھے دیکھنے ہسپتال آئی۔ وہ اس حادثہ سے حد درجہ متاثر معلوم ہوتی تھی۔ مینیجر نے مجھے بتلایا کہ وہ ایک لکھ پتی کی بیوہ اور ایک بہت بڑی جائداد کی تنہا مالک تھی۔ مینیجر کے اور میرے درمیان اب اکثر اُس کے متعلق گفت گو ہوا کرتی تھی۔ ہم نے اپنی مصلحتوں اور اُس کی دولت کی مناسبت سے اُس کا نام "لکشمی" رکھ لیا تھا۔ مینیجر کو یقین تھا کہ اگر میں نے اُس کے مشورہ پر عمل کیا تو ایک نہایت معقول رقم "لکشمی" سے وصول ہو جائے گی۔

کلکتہ کے دوران قیام میں کتنی ہی کافر جوانیوں سے میں کھیل چکا تھا، میرے نزدیک اُن کی حیثیت ایک کھلونے سے زیادہ نہ تھی، حسن و شباب کی ساحرانہ قوتیں اب مجھے متاثر نہیں کر سکتی تھیں؛ رشیدہ کی بے وفائی کے بعد محبت کو میں حماقت و دیوانگی کا

مجموعہ اور فطرت انسانی کی بد ترین کمزوری سمجھنے لگا تھا۔ اگر کوئی یہ کہتا کہ مجھے فلاں سے محبت ہے تو میرے نزدیک اس کے یہ معنی ہوتے کہ یا تو یہ شخص خود کسی کو فریب دے رہا ہے یا کسی کا فریب کھا رہا ہے۔ محبت کرنے کی صلاحیت مجھ میں اتنی بھی باقی نہ رہی تھی جتنی ایک اندھے میں دن کی روشنی اور رات کی تاریکی میں امتیاز کرنے کی ہوتی ہے۔ میرے لئے صرف وہی عورت دلچسپی کا باعث ہو سکتی تھی جو میری گرمیِ آغوش کو بھاری قیمت دے کر خرید سکتی تھی۔ مگر دنیا میں ایسا بھی ہوا ہے کہ صدیوں سرد خاموش پڑے رہنے کے بعد بعض پہاڑ یکایک پھٹ جاتے ہیں اور شعلہ فشانی شروع کر دیتے ہیں، آگ کا ایک دریا اُن کے دہانے سے اُبلتا ہے اور جدھر رُخ کرتا ہے خشک و تر سب کچھ جلا کر خاکستر کر دیتا ہے۔ ٹھیک یہی میری حالت ہوئی۔ میرا مُردہ اور بے احساس دل جو مدتوں سے ہمالیہ کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کی طرح سرد پڑا تھا اور محبت کی گرمی سے یکسر محروم ہو چکا تھا۔ اب پھر ایک بار اس میں حرارتِ زندگی کی ایک موج پیدا ہوئی۔ پھر اُس نے درد محبت کا احساس کیا۔ پھر اُس میں نشتر کی ایک نوک سی چبھتی ہوئی معلوم ہوئی۔ پھر کسی کو چاہنے اور چاہے جانے کی آرزو دل کے گوشہ گوشہ میں انگڑائیاں لینے لگی اور اس انقلاب کا باعث وہی فتنہ گر تھی جس نے مجھے چند دن کے لئے زندگی سے دور اور موت سے بہت قریب کر دیا تھا۔

پہلی بار جب میں نے ہسپتال میں اُس کی آواز سُنی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میری روح کے بربط کا ہر تار اس صدائے نغمہ سے گونج اُٹھا۔ پھر جب پہلی مرتبہ میں نے اُس کی صورت دیکھی تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے بہت سے پردے میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹ گئے، جیسے میں سوتے سوتے جاگ اُٹھا، میرا دل پتھر تھا۔ مگر اس پتھر پر ایک نقش بن گیا، گہرا نقش، آسانی سے نہ مٹنے والا۔ پہلے اس نقش کی حیثیت ایک "خاکہ" سے زیادہ نہ تھی۔ مگر رفتہ رفتہ وہ ایک رنگین تصویر بن گیا اور ہر وقت پیش نظر رہنے لگا۔

مینجر سے میں نے اُس کو چھپایا۔ میں اُس سے ڈرتا تھا۔ وہ لکشمی سے ایک "معقول رقم" وصول کرنے کی فکر میں لگا ہوا تھا۔ بظاہر میں اُس کی ہاں میں ہاں ملا دیتا تھا، مگر میرا دل ہرگز اس "کمینہ پن" میں شریک ہونے کے لئے تیار نہ تھا۔

ایک دن جب کہ میں ہسپتال میں تنہا بیٹھا ہوا تھا لکشمی آئی، اُس نے کہا۔ شاہد صاحب! آج مجھے آپ سے کچھ خاص باتیں کرنی ہیں، ایک التجا آپ کے پاس لے کر آئی ہوں اور مجھے آپ کے اخلاق و شرافت سے توقع ہے کہ آپ مجھے مایوس نہ کریں گے۔ شاید آپ کو یقین نہ ہو، مگر میں خدا کو گواہ کر کے کہتی ہوں، کہ اس حادثہ سے آپ کو جو تکلیف پہنچی ہے اس کا مجھے بے حد افسوس اور صدمہ ہے۔ مگر ساتھ ہی آپ کو معلوم ہے کہ میں بالکل بے قصور ہوں۔ میں نے موٹر کو روکنے اور بچانے کی انتہائی کوشش کی، مگر بدقسمتی سے آپ اتنے قریب اور اس طرح سامنے آ گئے تھے کہ ٹکر ہوئے بغیر نہ رہی، آپ کے چوٹ لگی اور بہت لگی اور اب اتنے دنوں سے آپ ہسپتال میں تکلیف اُٹھا رہے ہیں۔ مجھے آپ کے نقصان کا اچھی طرح احساس ہے مگر میں پھر وہی عرض کروں گی کہ خطا میری نہیں، قدرت کو یہی منظور تھا۔ حادثات کو کوئی روک نہیں سکتا۔ بہرحال میں اس کے لئے بخوشی تیار ہوں کہ جس طرح آپ پسند کریں آپ کے نقصان کی تلافی کر دوں۔ آپ کے مینجر صاحب کئی بار دیوانی اور فوجداری میں مجھ پر دعوی کرنے کی دھمکی دے چکے ہیں۔ پولیس نے الگ مقدمہ چلایا ہے اور یہ بھی مینجر صاحب کی کوششوں، کا نتیجہ ہے۔ اُنہوں نے نہ صرف پولیس کو میری آزار رسانی پر آمادہ کیا ہے، بلکہ کچھ دے دلا کر دو تین جھوٹے گواہ بھی تیار کر لئے ہیں، وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حادثہ کی ذمہ دار میں ہوں، wrong side, negligence, Rash driving کونسا جرم ہے جس کا ارتکاب میں نے نہیں کیا۔ خیر پولیس اور مینجر صاحب جو کچھ بھی کہیں، مگر مجھے کم سے کم آپ کی ذات سے اُمید ہے کہ آپ ایک

بے قصور کو خطاوار نہ ٹھہرائیں گے اور کل مجسٹریٹ کے سامنے وہی بات کہیں گے جو حق ہے۔ یہ ہرگز خیال نہ کیجئے کہ میں الزام سے بری ثابت ہونے کے بعد اپنا وعدہ پورا نہ کروں گی، نہیں جو کچھ کہہ رہی ہوں اُس کے لئے تیار ہو کر آئی ہوں، آپ جو کچھ فرمائیں اسی وقت حاضر کر سکتی ہوں۔ ساتھ ہی ایک بات اور بھی عرض کر دوں، آپ باور کیجئے کہ میں آپ کے منیجر صاحب کی دھمکیوں سے خوف زدہ ہو کر، ہرگز یہ درخواست لے کر آپ کے پاس نہیں آئی ہوں، بلکہ مجھے آپ کی تکلیف اور آپ کے نقصان کا کامل احساس ہے اور اس کی تلافی جس طرح بھی ممکن ہو میرے نزدیک لازمی ہے۔ بالفرض میری غلطی ثابت بھی ہو جائے تو زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ عدالت مجھ پر کچھ جرمانہ کر دے۔ مگر اس سے آپ کو کیا ملے گا۔ آپ خود جو جی چاہے مجھ پر جرمانہ کر دیجئے۔ میں بخوشی اُسے ادا کر دوں گی۔"

لکشمی جس وقت یہ باتیں کہہ رہی تھی میرے دل کا کچھ عجیب عالم تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ لکشمی بے قصور ہے۔ خطا درحقیقت میری تھی۔ مگر میں منیجر سے وعدہ کر چکا تھا کہ مجسٹریٹ کے روبرو لکشمی کو قصوروار ثابت کر دوں گا۔ ایک طرف منیجر کی شیطانی قوت میری روح پر پوری طرح مسلط تھی۔ دوسری طرف شرافت کا احساس جو مدت ہوئی مٹ چکا تھا خدا جانے کس طرح پھر ایک بار میرے قلب کی گہرائیوں میں موجزن ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ محبت کا وہ جذبہ بھی اپنا عمل کر رہا تھا جسے میں نے سب سے چھپا کر اپنے بے احساس دل کے ایک گوشہ میں جگہ دی تھی۔ بہرحال میں نے خود کو سنبھالا اور تمام مصلحتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ جواب دیا کہ "قصوروار کون ہے اس کا صحیح علم کم از کم مجھے نہیں۔ رہ گیا تلافی کا سوال تو اس کے متعلق منیجر صاحب سے مشورہ کئے بغیر میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" لکشمی مایوس ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ چلتے وقت اُس نے کچھ ایسی نظروں سے میری طرف دیکھا کہ میں خود اپنے نامہربان جواب سے شرمندہ ہو گیا۔ دوسرے دن

ہیں، لکشمی، مینجر، پولیس کا داروغہ، سپاہی، جھوٹے گواہ، سب مجسٹریٹ کے سامنے کھڑے تھے، میں نے جو بیان دیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "غلطی سراسر میری ہے لکشمی ہرگز حادثہ کی ذمہ دار نہیں" صرف میرے بیان نے مقدمہ کا خاتمہ کر دیا۔ پولیس کی شرمندگی، مینجر کی برہمی، لکشمی کی حیرت اور میری خوشی اس وقت دیکھنے کے قابل تھی اس واقعہ نے آن واحد میں لکشمی کو مجھ سے اور مجھے لکشمی سے بہت قریب کر دیا۔

دوسرے دن لکشمی نے مجھے اپنے یہاں چائے پر بلایا۔ نہ جانے آج کتنی مدت کے بعد مجھے حقیقی مسرت کے چند لمحے نصیب ہوئے تھے۔ لکشمی میرے سامنے بیٹھی تھی خدا جانے کیوں ہم دونوں خاموش تھے۔ میرا دل کسی قدر زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ یہ سچ ہے کہ میں نے زبان سے ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہا تھا جو میرے جذبات کی غمازی کر سکے، مگر آنکھیں زبان کی قائم مقام بن کر دل کی ترجمانی کا فرض بخوبی ادا کر رہی تھیں میں نے محسوس کیا کہ میری اس کیفیت سے لکشمی بھی متاثر ہو رہی ہے۔ مگر برابر اس کوشش میں لگی ہوئی ہے کہ دل کی چوری کھلنے نہ پائے۔ آخر میں نے کہا "لکشمی دیوی آپ نے میرا قصور معاف کر دیا؟" لکشمی نے حیران ہو کر پوچھا "آپ کا قصور؟ آپ نے کونسا قصور کیا ہے؟" میں نے کہا "میں سخت شرمندہ ہوں کہ پرسوں ہسپتال میں میں نے آپ کو مایوس کن جواب دیا اور اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کیا۔ بلکہ پردے پردے میں آپ کو قصوروار ٹھہرایا!"

لکشمی نے کہا "شاہد صاحب! گئی گذری باتوں کا اب ذکر نہ کیجئے۔ مجھ پر آپ نے جو احسان کیا ہے اگرچہ وہ آپ جیسے ایک شریف انسان کے ظرف کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ مگر میری توقعات سے یقیناً کہیں بڑھ کر ہے، اب آپ سے ایک التجا ہے۔ کیا آپ اسے قبول کریں گے؟" میں نے کہا "بسر و چشم" لکشمی یہ سن کر اٹھی، برابر والے کمرے میں جا کر میز کی دراز میں سے کوئی چیز نکالی اور واپس آ کر ایک بند لفافہ میرے سامنے رکھ دیا، اور کہا "یہ آپ کی امانت ہے" میں کچھ نہ سمجھا، لفافہ

اُٹھا کر کھولا۔ اُس میں سو سو روپے کے کئی نوٹ تھے۔ کتنے تھے۔ یہ نہیں معلوم، میں نے شمار نہیں کئے۔ لکشمی کا مطلب سمجھ گیا، گویا یہ روپیہ میری اُس تکلیف کا معاوضہ تھا جو موٹر کے حادثہ سے مجھے پہونچی تھی۔ نہایت بے اعتنائی کے ساتھ وہ لفافہ لکشمی کے سامنے ڈالتے ہوئے میں نے کہا "مجھے آپ سے ایسی اُمید نہ تھی کہ آپ گھر بلا کر مجھے اس طرح ذلیل کریں گی"۔ لکشمی اس جواب کے لئے تیار نہ تھی، وہ سخت مضطرب ہو کر بولی "نہیں نہیں، خدا کے لئے آپ میرے مفہوم کو غلط نہ سمجھئے، میرے ساتھ بے انصافی نہ کیجئے۔ کیا اس کا امکان بھی ہے کہ میں آپ کو گھر بُلا کر شرمندہ کروں۔ کیا میں آپ کے نزدیک ایسی ہی ذلیل ہوں"۔ لکشمی کے ان الفاظ نے مجھے لاجواب کر دیا۔

کچھ دیر تک پھر ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے، آخر میں نے ہی ابتدا کی میں نے کہا "لکشمی دیوی، شاید آپ کو معلوم ہے کہ منیجر صاحب میرے حد درجہ دوست، خیر خواہ اور محسن ہیں۔ مقدمہ خارج کرا کے میں نے اُنہیں بے حد ناراض کر دیا ہے۔ پرسوں، مقدمہ سے پہلے میرے نقصان کی تلافی کے طور پر ایک معقول رقم آپ مجھے دینا چاہتی تھیں، مگر میں نے نہیں لی۔ غالباً آپ ان تمام باتوں کو میری شرافت اور نیکی پر محمول کرتی ہوں گی، مگر درحقیقت ایسا نہیں، کاش میری ذات میں اتنی شرافت اور نیکی موجود ہوتی۔ اپنی کمزوریاں اور عیوب کوئی دوسروں پر ظاہر نہیں کیا کرتا۔ مگر بعض اوقات انسان اس کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ آپ باور کیجئے کہ میں نے جو کچھ کیا وہ محض خود غرضی کی بنا پر تھا"۔

"مگر اس میں آپ کی کیا غرض تھی؟" لکشمی نے میرا قطع کلام کر کے کہا۔

"غرض یہ تھی کہ میری وجہ سے منیجر صاحب اور پولیس نے آپ کو جو ذہنی اذیت پہنچائی تھی اُس کی تلافی ہو جائے"۔

"اوہ، شاہد صاحب!" لکشمی نے صرف اتنا کہا۔ اس وقت وہ تشکر و امتنان

کی تصویر بنی ہوئی تھی، میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"اس کے علاوہ ایک اور بات بھی تھی"

"وہ کیا؟"

لکشمی کے اس سوال کا جواب میں نے الفاظ میں نہیں دیا۔ بلکہ ہاتھ بڑھا کر لکشمی کا ہاتھ تھام لیا۔ پہلے اُسے اپنی آنکھوں سے لگایا، پھر ہونٹوں سے۔ لکشمی نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے ایک لرزش سی اُس کے ہاتھ میں محسوس ہوئی۔ میرا خود تمام جسم کانپ رہا تھا۔ دل کی اس وقت جو حالت تھی۔ بے وفا رشیدہ سے جدا ہونے کے بعد آج پہلی بار مجھ پر طاری ہوئی تھی۔

×××

وقت گذرتا گیا اور ہم ہر روز ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے گئے۔ بینجر کی برہمی ہمارے اس بڑھتے ہوئے ارتباط کو دیکھ کر گھٹتی جا رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ جلد وہ مجھے اپنی راہ پر لگا لے گا۔ اور مقدمہ خارج کرا کے میں نے اس کا جو مالی نقصان کیا تھا اُس کی تلافی کی صورتیں نکل آئیں گی لیکن میں تہیّہ کر چکا تھا کہ اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے مگر لکشمی سے ایک پیسہ نہ لوں گا واقعہ یہ ہے کہ رشیدہ کی بے وفائی نے میرے قلب میں جو ناسور ڈال دیئے تھے لکشمی کی وفا پرستیوں نے اُنہیں مندمل کر دیا۔ جسمانی راحتیں اور روحانی مسرتیں اب قدم قدم پر مجھ سے ہم آغوش ہوتی تھیں۔ کمر تک پہنچنے والے لکشمی کے سنہرے بال جس وقت میرے بازو پر بکھرے ہوتے تھے۔ اور اس کی گداز مرمریں باہیں میری گردن کے گرد حلقہ کئے ہوتی تھیں اُس وقت میری ایسی حالت ہوتی تھی ——— آہ، کن الفاظ میں بیان کروں، کیسی حالت ہوتی تھی لکشمی کی دولت لکشمی کا جسم، لکشمی کی روح، ہر چیز میری ملکیت تھی، چند روز اس طرح گذرے، دولت، حسن، جوانی، محبّت اور آزادی جب یہ سب ایک جگہ جمع ہو جائیں تو پھر کونسی تمنّا ہے جو

پوری نہ ہو سکے۔ بلکہ سچ پوچھیئے تو یہ سب کچھ مل جانے کے بعد اور رہ بھی کیا جاتا ہے جس کی انسان تمنّا کرے۔ مگر افسوس، حصول آرزو کے بعد محبت کی زندگی شفق اور دھنک کی رنگینیوں سے زیادہ ناپائدار ثابت ہوتی ہے۔ چاہت کی آگ رفتہ رفتہ سرد پڑنے لگی یعنی کی کمینگی جس پر تھوڑی سی مدت کے لئے شرافت نے غلبہ پالیا تھا پھر اُبھر آئی پہلے مجھے خود لکشمی سے محبت تھی اب میں فقط اُس کے روپیہ کو چاہتا تھا۔ سچ یہ ہے کہ لکشمی نے میری خاطر اپنی دولت پانی کی طرح بہائی۔ تقریبًا ہر ہفتہ میں ریس میں کچھ نہ کچھ ہارتا تھا۔ لکشمی نے بہت کچھ دیتی تھی اور اس طرح کہ گویا قرض ادا کر رہی ہے۔ احسان جتانا تو کجا احسان کر کے اُلٹی ممنون ہوتی تھی۔ با ایں ہمہ میرے نفس کی دنائت روز افزوں ترقی پر تھی۔ آخر لکشمی کو بھی اس کا احساس ہو گیا۔ اُس نے مجھے سنبھالنے کے لئے ہاتھ روک لیا۔ میں اور بھی بگڑ گیا۔ اب اُسے اتنی بھی اجازت نہ تھی کہ اُس کے ہونٹ میرے لبوں کو چھو سکیں۔ میرا کھینچنا اُس کے لئے قیامت ہو گیا۔ خوابِ راحت کی خوگر آنکھیں جنہیں قدرت نے جادوگری کے لئے بنایا تھا اب جاگنے اور آنسو بہانے کے لئے وقف تھیں

ایک دن شام کے وقت میں لکشمی کے ہاں گیا، وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے کوچ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کے سنہرے بال بُری طرح بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے چپکے سے اُس کے منہ پر منہ رکھ دیا۔ وہ بیتاب ہو کر اُٹھ بیٹھی۔ میرے گلے میں باہیں ڈال دیں، اس وقت اُس کی حالت دیوانوں کی سی ہو رہی تھی۔ میں نے خیال کیا کہ اس وقت لوہا گرم ہے، زور سے ضرب لگانی چاہیئے۔ وہ مجھ سے جدا ہونا نہ چاہتی تھی۔ مگر میں نے بزور اپنے سے علیحدہ کیا اور کہا "لکشمی دنیا میں ہر چیز قیمت سے ملتی ہے میرے آغوش کی بھی ایک قیمت ہے۔ خدا نے تمہیں اس قابل کیا ہے کہ تم پوری قیمت دے کر اسے خرید سکتی ہو۔ میں ضرورت مند ہوں، اس لئے قیمت لینے پر مجبور ہوں ورنہ تم جانتی ہو کہ میں نے کبھی اس کی پروا نہیں کی!!

میرے یہ الفاظ سُن کر لکشمی یکایک سنبھل گئی۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا کہ اس وقت کس قسم کے جذبات اس کے قلب میں موج زن ہیں۔ تاہم اتنا ضرور اندازہ ہوا کہ اس کا جوش سرد پڑ گیا، اُس کی آنکھوں میں اور چہرے پر بھی، نفرت اور حقارت کے آثار نمایاں تھے اس نے نہایت متانت سے کہا "کیا قیمت ہے تمہارے آغوش کی"۔ میں سمجھا دار کاری لگا۔ دل میں سوچا کہ اب کیا مانگوں۔ وہ ایک ہیرے کی انگشتری پہنے ہوئے تھی۔ بہت بڑا اور تابناک ہیرا۔ میں جوہری نہیں تاہم میرا خیال تھا کہ اس ہیرے کی قیمت ہزار بارہ سو سے کم نہ ہوگی۔ انگشتری کی طرف اشارہ کر کے میں نے کہا "یہ انگوٹھی" لکشمی نے فوراً انگوٹھی اپنی انگلی سے اُتار کر میرے سامنے پھینک دی، میں نے اُسے اٹھا کر پہن لیا اور دل ہی دل میں خوش ہوتا ہوا لکشمی کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی میں نے اُس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اُسے آغوش میں لینا چاہا، اُس نے زور سے میرے مُنہ پر ایک طمانچہ مارا اور نہایت غضب ناک آواز اور حقارت آمیز لہجہ میں کہا "نکل جا یہاں سے پاجی، کمینے!" اتنا کہہ کر اُس نے اپنے ڈرائیور کو آواز دی۔ وہ فوراً آیا لکشمی نے اُس سے کہا "شاہ صاحب کو ہوٹل پہونچا دو"۔ میں سر جھکائے خاموش اُس کے کمرہ سے نکل آیا۔ اس ذلت نے میرے جذباتِ غیرت کو ذرا سی دیر کے لئے برانگیختہ کیا۔ مگر دودھ کے اُبال کی طرح جلد ہی یہ عارضی طوفان فرو ہو گیا۔ منیجر کو میں نے کُل واقعات سُنائے۔ اُس نے پوری داستان سُن کر بہت کچھ میری تسلّی تشفی کی اور کہا "بھیّا خدا روزی رساں ہے، ایک در بند تو ستّر در کھُلے۔ خدا تمہیں زندہ سلامت رکھے لکشمی جیسی ہزاروں چھوکریاں تمہاری جوتی کی نوک پر سے قربان ہیں"۔ انگشتری دیکھ کر وہ بے انتہا خوش ہوا اور کہا کہ پندرہ سو سے کم اس کی قیمت نہ ملے گی۔ اس خیال سے میرے بھی کچھ آنسو پچھ گئے۔ کہ خیر جو ہوا سو ہوا ایک "معقول رقم" تو ہاتھ آئی، اگلے دن ہم دونوں وہ انگشتری فروخت کرنے کے ارادہ سے ایک بڑے جوہری کی دکان پر گئے۔ بڈھے جوہری نے

انگشتری کو ہاتھ میں لے کر بغور دیکھا۔ پھر مسکرا کر بولا "بابو جی کسی نے خوب آپ کو بے وقوف بنایا۔ یہ تو اِمی ٹیشن (نقلی) ہے"۔

چند روز ہوئے میں کلکتہ گیا تھا۔ اُس شخص کو میں نے دیکھا جس کی عبرت ناک داستان سچی کہانی کے عنوان سے پیش کی گئی ہے۔ دیکھ کر کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ یہ شخص کسی زمانہ میں مردانہ حُسن کا مجسّمہ رہ چکا ہے۔ آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے، زرد رنگت، پچکے ہوئے گال، لاغر جسم، پریشان بال، جھاڑ جھنکاڑ کی طرح اُلجھے ہوئے، میلے کچیلے کپڑے، شراب کے نشہ میں چور، ہوٹل کے برآمدہ میں ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر نیم بیہوشی کی حالت میں پڑا تھا۔ میرے ایک دوست نے جو واقفِ حال تھے اور خود اُسی کی زبانی اس کی رام کہانی سُن چکے تھے، اس کے حالاتِ زندگی مجھ سے بیان کئے اُسے دیکھ کر اور اس کی داستانِ حیات سُن کر میرا دل لرز گیا، یہاں تک واقعات و خیالات کا تعلق ہے میں نے مطلق تصرّف نہیں کیا ہے البتہ الفاظ میرے ہیں۔

سچی کہانی

ایک خط جو کبھی "اُن" تک نہ پہونچا

اُردو تحریر کا رواج اس ملک میں برائے نام ہے۔ شہر میں مشکل سے دو چار آدمی ایسے ہوں گے جو اُردو میں خط لکھتے ہوں یا اُن کے پاس اُردو میں لکھے ہوئے خط آتے ہوں، چونکہ میرے پاس ہر روز دو چار خط آتے ہیں اور وہ عموماً اُردو میں لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لئے یہاں کے لوگوں حتیٰ کہ ڈاک خانہ والوں تک کو یہ خیال ہو گیا کہ ہر وہ خط جو اُردو میں لکھا ہوا ہو وہ میرے سوا اور کسی کا نہیں ہو سکتا۔ یا میں نے کسی کو لکھا ہو گا۔ یا مجھے کسی نے بھیجا ہو گا جس خط پر اُردو میں پتا لکھا ہوا ہو، چاہے وہ کسی کے نام ہو، اس شہر میں، پہونچنے کے بعد وہ ایک مرتبہ میرے یہاں ضرور آتا ہے۔ چنانچہ کل ۳۱ ر جولائی کو ایک پڑوسی ایک بڑا سا لفافہ میری غیر موجودگی میں گھر پہ دے گیا اور ساتھ ہی ایک پُرزہ جس پر انگریزی میں لکھا تھا:۔

"میں آج صبح ٹہلنے کے لئے گیا تھا۔ وکٹوریہ پارک میں یہ خط پڑا ہوا ملا۔ لفافہ

پر کسی کا پتا درج نہیں، کھول کر دیکھا تو اُردو میں لکھا ہوا تھا۔ میں نے
خیال کیا کہ شاید آپ کا ہے۔ جیب سے نکل پڑا ہو گا۔"
آج مجھے پھر وہی مشہور مثل دُہرانی پڑتی ہے کہ "واقعات افسانوں سے کہیں زیادہ عجیب ہوتے ہیں"۔ ورنہ یہ خط کیوں میرے ہاتھ پڑتا۔ شاید قدرت نے مجھے اسی خدمت کے لئے انتخاب کیا ہے کہ میں قارئین ساقی کو "سچی کہانیاں" سنایا کروں۔ جب تک اس قسم کے واقعات پیش آتے رہیں گے، میں بھی لکھتا رہوں گا۔"

"پریم پجاری"

یکم اگست ۱۹۳۵ء

(دوشنبہ اور سہ شنبہ کی درمیانی رات) ۱۶ جولائی ۱۹۳۵ء

میری موہنی! یہ تم نے کیا کر دیا۔ مجھے نیند کیوں نہیں آتی۔ کئی دن سے رات کے اکثر گھنٹوں کی آواز سنتا ہوں۔ کل رات کو چاند کا ہزاروں میل کا سفر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس وقت بھی رات ہے۔ تھوڑی سی باقی ہے۔ آج تو قیامت کی بیکلی ہے آنکھیں جل رہی ہیں، لاؤ اپنا ہاتھ لاؤ، میری آنکھوں پر رکھ کے دیکھو، کیوں کیسی آگ نکل رہی ہے؟ تمہارے ہاتھ کیسے ٹھنڈے ہیں، چین سا آگیا۔ دوسرا ہاتھ دو۔ یہاں رکھو میرے دل کے قریب، اب دیکھو۔ آواز آئی؟ کیوں کیسے زور زور سے دھڑک رہا ہے دو دن سے برابر یہی حالت ہے۔

ابھی ابھی ذرا آنکھ جھپک گئی تھی۔ پندرہ منٹ مشکل سے سویا ہوں گا۔ ایک عجیب خواب دیکھا۔ اس کے اثر سے جی سہما ہوا ہے۔ دل زور زور سے دھڑک رہا ہے۔ تمہیں سناؤں؟ کچھ بھول گیا ہوں، کچھ یاد ہے، اچھی تعبیر دینا، اور بُری بھی ہو گی تو کیا ہو گا۔ میرے پاس ہے کیا جو چھن جائے گا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ چاندنی رات ہے، ٹھیک آج کی سی رات، چودھویں کا چاند کشتی کی طرح نیلے آسمان میں بہتا چلا جا رہا ہے۔

تم بھی میرے ساتھ ہو۔ ہم دونوں خاموش ہیں۔ تم کچھ سوچ رہی ہو۔ میں بھی کچھ سوچ رہا ہوں۔ چلتے چلتے دور سے سمندر کا کنارہ نظر آیا۔ ہم بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ساحل سے ٹکرانے والی غضب ناک موجوں نے ہمارے پاؤں چھو لئے۔ تم ٹھہر گئیں، میں اور آگے بڑھا۔ کنارے پر ایک چھوٹی سی کشتی پڑی تھی۔ میں اس میں بیٹھ گیا۔ وہ موجوں کے تھپیڑوں سے ڈگمگا رہی تھی۔ تم نے کہا "خدا حافظ"۔ میرا دل بیٹھا جا رہا تھا میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ تم پر ایک حسرت بھری نظر ڈالی اور بس کشتی خود بخود چل نکلی، کنارہ دور ہوتا گیا۔ جب تک نظر نے کام دیا میں تمہیں دیکھتا رہا۔ فاصلہ بڑھتا گیا تھوڑی دیر کے بعد، جہاں تم کھڑی تھیں وہاں ایک سیاہ نشان کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا۔ یہاں تک کہ وہ سیاہی بھی اُفق کی تاریکی میں گم ہو گئی۔

اب تک مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔ اب محسوس ہوا کہ میں کہاں ہوں؟ سنسان رات، بے سروسامان، تنہائی، چھوٹی سی کشتی، پرشور موجیں اور کہیں پر نہ ختم ہونے والا اتھاہ سمندر۔ جی دہلا جاتا تھا۔ کشتی ہے کہ اب اُلٹی اور اب اُلٹی۔ اتنے میں بادل اُٹھے، چاند چھپ گیا۔ ہوا تیز ہو گئی، بوندا باندی شروع ہوئی۔ پھر دھواں دھار مینہ برسنے لگا۔ اندھیرا گھُپ، کچھ نظر نہیں آتا۔ کالی کالی پہاڑ سی موجیں جب تیزی سے دوڑتی ہوئی میری طرف آتیں تو میں خوف کے مارے آنکھیں بند کر لیتا۔ ہر مرتبہ خیال ہوتا کہ اب کشتی اُلٹ جائے گی۔ میں ڈوب جاؤں گا۔ اسی ہلچل میں ایک بیہوشی کی سی کیفیت مجھ پر طاری ہونے لگی۔ اتنے میں ایک زور کی موج آئی۔ کشتی اُلٹ گئی۔ میں نے غوطہ کھایا اور پانی کی گہرائی میں گرنے لگا۔ اتنے میں ایک خون خوار بھیانک گھڑیال مُنہ پھاڑے میری طرف لپکا۔ دہشت کے مارے میری چیخ نکل گئی۔ اُسی سے آنکھ کھُل گئی۔ میں اپنے بستر پر تھا۔ نہ سمندر، نہ کشتی، نہ گھڑیال، تم اگر اس وقت میرے دل پر ہاتھ رکھ کے دیکھو تو معلوم ہو کہ میرے سینہ میں کیسا طوفان برپا ہے۔

کل یونیورسٹی میں میرے ایک دوست نے پوچھا :-

"آپ کی آنکھیں آج بھاری بھاری کیسی ہو رہی ہیں ؟"

میں نے کہا "رات گرمی بہت تھی، نیند کم آئی"

اُنھوں نے تعجب سے کہا "گرمی! ہم تو رات چادر اوڑھ کر سوئے تھے"

"مگر ہم نے آم بھی تو کھائے تھے - آموں نے گرمی کی ہوگی" میں نے ہنس کر ٹالتے ہوئے کہا -

پھر تھوڑی دیر کے بعد جب میں گھر آیا تو آئینہ لے کر اپنی صورت دیکھی، آنکھیں بھاری تھیں، اُن میں سرخی تھی، ٹھنڈے پانی سے غسل کیا - کچھ تسکین ہوئی، مگر آنکھیں برابر جل رہی ہیں - آج کھٹک بھی ہے، درد بھی ہے -

آج کی رات خاصی ٹھنڈی ہے - شام تھوڑا سا چھینٹا ہو گیا تھا - ہوا خوش گوار ہے، خنک ہے، آہستہ آہستہ چل رہی ہے - مگر نہ جانے کیوں میرے دل کو اس سے وحشت ہو رہی ہے، جی بہت بیکل ہے، کروٹیں بدلتے بدلتے اُکتا گیا تو اُٹھ بیٹھا، روشنی کی قلم اور کاغذ نکالا اور یہ دو ورق سیاہ کر ڈالے، موہنی! تم انہیں پڑھوگی تو اپنے جی میں کیا کہوگی ؟ کہوگی "دیوانہ کہیں کا - نیند نہیں آتی تو میں کیا کروں، کیا میں نے کہہ دیا ہے کہ نہ سو" اور یہ بھی ممکن ہے کہ ماجرائے درد پڑھ کر تمہارے دل پر چوٹ لگے اور تم کہو:- "پریم - میرے دل کے مالک، میری رُوح کے مالک، لا میں تیری آنکھوں کی آگ اپنے ہونٹوں سے بجھا دوں"

آہ موہنی! میں بیداری میں کیسے کیسے سنہرے خواب دیکھتا ہوں، مگر اُن کی تعبیر؟ آہ اُن کی تعبیر کچھ بھی نہیں، یہ سراب کی جھلک ہے، سیمیا کی نمود ہے، خیال کی نقاشی ہے، کہاں تم اور کہاں پریم!

۱۹ر جولائی ۱۹۳۵ء

میری موہنی! خدا جانے تمہاری طبیعت کیسی ہے، آج میرا دل بہت ہی گھبرا رہا ہے۔ صبح سے کتنی بار تمہیں دیکھا ہے، کتنی بار تم سے باتیں کیں ہیں۔

ہماری یونیورسٹی میں تصویروں کے بہت سے مجموعے ہیں، میں نے بارہا انہیں دلچسپی سے دیکھا ہے۔ اُن میں قدرتی مناظر بھی ہیں، اچھی صورتیں بھی ہیں، مرد بھی ہیں عورتیں بھی ہیں، آج میں نے اُن سب کو پھر دیکھا۔ میرا مذاق شاید کچھ بگڑ گیا ہے یا بدل گیا ہے۔ کوئی تصویر مجھے اچھی نہ معلوم ہوئی۔ یہ نہیں کہ مجھے اُن سے وحشت ہوئی ہو، نہیں۔ مگر کسی نے نظر کو اُلجھایا نہیں۔ دل کو اٹکایا نہیں۔ رہ رہ کر تمہارا خیال آتا ہے، اور تمہارا خیال کیا بتاؤں کیا کیا اپنے ساتھ لاتا ہے۔ مگر کسی چیز سے دل کو تسکین نہیں ہوتی بیکلی نہیں جاتی، کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ کیا کروں، کہاں جاؤں، دو گھنٹے سے اکیلا بیٹھا ہوں۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کچھ بھول گیا ہوں۔ یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں، یاد نہیں آتا۔ جیسے میری کوئی چیز کھوگئی ہے، ڈھونڈھتا ہوں، مگر نہیں ملتی خیالات کا شیرازہ بکھرا ہوا۔ یکسر پراگندہ، ابتر، پریشان، ابھی کچھ سوچ رہا تھا، ابھی کچھ سوچنے لگا۔ پھر دل میں تکلیف ہونے لگی۔ پھر سب کچھ بھول گیا، پھر تم سے باتیں ہونے لگیں، پھر دوری کا حجاب حائل ہوگیا، پھر منہ سے بے اختیار ایک آہ نکل گئی، ہائے موہنی۔ یہ تم نے کیا کر دیا، آخر جی اتنا کیوں گھبراتا ہے۔ دل کیوں بیٹھا جاتا ہے۔ آخر میں کیا چاہتا ہوں۔ تمہاری آنکھوں کی قسم موہنی۔ مجھے خود بھی نہیں معلوم۔ بس دل میں ایک آگ سی لگی ہوئی ہے۔ اگتا نہ جانا میری پیاری۔ دل میں یہ لگن تمہیں نے لگائی ہے تم سے نہ کہوں تو کس سے کہوں۔ کہنا بھی چاہوں تو کوئی کیوں سننے لگا۔ سُن بھی سے لے تو اُس سے حاصل کیا۔

۸ر جولائی کو تمہارا خط ملا تھا۔ آج ۱۹ر جولائی ہے۔ بارہ ۱۲ دن ہوگئے، انتظار

کرتے کرتے، راہ دیکھتے دیکھتے صبح سے شام، شام سے صبح ہو جاتی ہے۔ دل کو کہاں تک سمجھاؤں، کہاں تک سنبھالوں، نہیں معلوم کب تک انتظار کرنا ہوگا۔ کب تک یوں ہی تڑپنا ہوگا۔ طرح طرح کے وسواس دل میں آتے ہیں، کہتا ہوں میرے اللہ! خط جلد آئے یا دیر میں، اُن کی طبیعت اچھی ہو۔ موہنی۔ جواب کے لئے تم نے میرے خط کا انتظار کیوں کیا۔ تمہارا خط تو ہر حال میں مجھے مل ہی جاتا ہے تمہیں خط بھیجنا میرے اختیار میں ہوتا تو اب تک نہ جانے کئے خط لکھے ہوتے۔ روانہ نہیں کر سکتا۔ پھر بھی لکھ ڈالتا ہوں اس سے دل کی بیکلی ذرا کم ہو جاتی ہے۔ اب تک تین خط لکھ چکا ہوں۔ ایک یہ اور دو اور۔ اُن دو میں سے ایک پھاڑ ڈالا ایک رکھا ہے۔ پھاڑ اس لئے ڈالا کہ لکھنے کے بعد خیال آیا کہ دیوانے یہ خط کیا اُن تک پہونچے گا۔ اُس وقت کچھ ایسا ہی تصوّر بندھا کہ اب میری کوئی تحریر تمہیں نہ ملے گی بس پھاڑ ڈالا۔ پھر افسوس ہوا۔

پیاری تم خود ہی سوچو۔ بارہ دن تک انتظار سہل نہیں تمہیں تو خود اندازہ ہے کہ انتظار میں کیسی اذیت ہوتی ہے۔ مجھے اس خیال سے اور بھی کوفت ہو رہی ہے کہ میرے آخری اور اس خط کے درمیان تقریباً دو ہفتے کا فصل ہو جائے گا اور اس قدر انتظار تمہیں بہت تکلیف دے گا۔ مگر میں کیا کروں میری پیاری، کیسے لکھوں، کس پتہ پر لکھوں اچھا سچ بتاؤ، تم نے اتنے دن کیوں لگا دیئے۔ اب تک تو تمہیں کئی خط لکھنے چاہیئے تھے۔ کیا جی اچھا نہ تھا؟ نہیں۔ فرصت نہیں ملی؟ نہیں لکھنے کو جی نہ چاہا؟ نہیں۔ پھر کیوں نہیں لکھا؟۔ آہ موہنی! میرا مضطرب دل تمہاری مجبوریوں کو نہیں سمجھتا۔ سمجھتا تو اتنا بے قرار کیوں ہوتا۔ صبر سے انتظار کیوں نہ کرتا۔ کوئی ایسی ہی مجبوری ہوگی، جو خط میں دیر ہوئی۔ میرے اضطراب سے قطع نظر، خط لکھے بغیر خود تمہیں کیسے قرار آتا۔ دل کیوں کر مانتا کہ دو ہفتے تک اپنی تڑپ کا اظہار نہ کرے، جلتا رہے، گھلتا رہے اور سانس نہ لے۔ خدا کے لئے بتاؤ تو کیا ہوا۔ خدانخواستہ کوئی بات تمہارے

لئے زحمت کا باعث تو نہیں ہو گئی۔

موہنی تمہیں خط روانہ کرتے وقت میرا دل لرز لرز جاتا ہے۔ سوچتا ہوں کہ خدانخواستہ کوئی اس تحریر کو دیکھ لے تو کیا ہو۔ یہ میں جانتا ہوں کہ میرا ضمیر مجرم نہیں اور تمہارا دامن بھی معصومیت کی خوشبو سے مہک رہا ہے۔ مگر بدقسمتی سے سوسائٹی حقیقی جرم اور فرضی و خیالی معصیت میں امتیاز کرنا نہیں جانتی۔ اُسے اپنے بنائے ہوئے قوانین کی مخالفت کسی طرح گوارا نہیں۔ چاہے وہ قوانین کیسے ہی بعید از عقل و مجنونانہ کیوں نہ ہوں، مجھے خوف اپنا نہیں، تمہارا ہے۔ قربان جائیے ایسے قانون کے جس کی نظر میں عورت محض عورت ہونے کی بنا پر زیادہ تقصیروار اور زیادہ ناقابلِ معافی سمجھی جائے۔ چاہے "جرم" کے ارتکاب میں دونوں برابر کے شریک ہوں۔

---

۲۱ جولائی ۱۹۳۵ء

موہنی پیاری۔ تم نے لکھا تھا "دیکھا ہم آپ کے اشعار کے بالکل بھی مستحق نہیں.... ......ایک آدھ شعر ہمارے لئے بھی کہا جایا کرے" میری تمنا! اب تمہارے سوا اور کس کے لئے شعر کہہ سکتا ہوں۔ جانِ آرزو! موہنی کے سوا اب میرے پاس شعر کہنے کے لئے موضوع ہی کون سا ہے۔ مگر خدا جانے میرے کلام پر اشعار کا اطلاق بھی ہو سکتا ہے یا نہیں؟ "شاعری" تو اُن میں ذرا بھی نہیں ہوتی۔ فقط اپنی حالت اور بعض واقعات کا بیان ہوتا ہے۔ دل کی تڑپ جب الفاظ کا جامہ پہن لیتی ہے تو میں اسی کو شعر کہہ دیتا ہوں اچھا تو سنو، ایک شعر کہا ہے، ؎

یہ جانتا ہوں کہ میں تجھ کو پا نہیں سکتا
ہر ایک سانس میں بڑھتی ہے آرزو تیری

کہو پسند آیا؟ سچ کہنا۔ میری خاطر سے نہیں۔ تم کہو گی یہ تو بالکل میرے حسبِ حال

ہے۔ پہلا مصرع اگر تمہارے حسب حال ہے تو پروردگار جلد اس صورتِ حالات کو بدل دے اور اگر دوسرا مصرع حسب حال ہے تو خدا کرے کہ یہ حالت ہمیشہ قایم رہے۔ میرے لئے اس سے زیادہ خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ تم مجھ ایسے ہیچ کارہ کو جسے کوئی مفت بھی نہ لے اپنی گراں بہا محبّت دے کر خریدنا چاہو۔ زہے نصیب، خوشا طالع۔

موہنی! تمہاری جادو بھری آنکھوں کی قسم میں نے اس شعر میں ذرّہ برابر مبالغہ نہیں کیا ہے، گذرنے والا ہر دن بلکہ ہر لمحہ مجھے تم سے قریب تر کر دیتا ہے۔ حالانکہ ظاہری فاصلہ میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ ہر وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دل میں جس درجہ تمہاری آرزو پہلے تھی اب اُس سے کچھ سوا ہو گئی ہے۔ بس اسی کیفیت کو میں نے بیان کیا ہے۔

کل کا ایک لطیفہ سُنو۔ ایک مولانا ہیں۔ سن پچاس سے متجاوز۔ آدمی فاضل ہیں۔ عمامہ باندھتے ہیں، ڈاڑھی گھنی اور گھیر دار ہے۔ پیٹ ماشاءاللہ ایسا ہی ہے جیسا ایک مولوی کا ہونا چاہیئے۔ اپنے خیال میں "واصل بحق" ہو چکے ہیں۔ میرے یہاں کبھی کبھی تشریف لاتے ہیں، کہا کرتے ہیں کہ اگرچہ آپ ابھی "مجاز" کے دَور سے گذر رہے ہیں۔ پھر بھی آپ کے کلام میں ایک ایسا درد، ایک ایسی لذّت ہے جو دوسروں کو نصیب نہیں۔ کل تشریف لائے تو میں نے یہ شعر سُنایا۔

یہ جانتا ہوں کہ میں تجھ کو پا نہیں سکتا
ہر ایک سانس میں بڑھتی ہے آرزو تیری

سُنتے ہی سبحان اللہ کی تسبیح پڑھنے لگے۔ اس کے بعد بولے "آخر وہی ہوا جو ہم سمجھتے تھے۔ آپ کے کلام میں "حقیقت" کا رنگ آگیا۔ شعر کیا ہے "معرفت" کا دفتر ہے جس نکتہ کو آپ نے بیان کیا ہے وہ "عشقِ حقیقی" کی قریب قریب آخری منزل ہے۔ سبحان اللہ تعریف نہیں ہو سکتی، کیا بات کہی ہے"۔ ہر ایک سانس میں بڑھتی

ہے آرزو تیری ✣ یہ جانتا ہوں کہ میں تجھ کو پا نہیں سکتا" ہائے سچ ہے، جب تک روح جسم کے خاکی قفس میں بند ہے "اُس" تک نہیں پہونچ سکتی۔ مگر ہر لمحہ اُس کی تمنا کا زیادہ ہونا دلیل ہے اس امر کی کہ بس اب منزل دور نہیں"

وہ کہہ رہے تھے۔ اور میں خاموشی کے ساتھ سُن رہا تھا اور جی ہی جی میں کُڑھ رہا تھا کہ میں نے کیا حماقت کی جو یہ شعر اس ناآشنائے محبت کو سنایا۔ جی چاہتا تھا کہ کمبخت کی داڑھی نوچ لوں اور پوچھوں کہ نامراد تو نے کبھی سچ مچ محبت بھی کی ہے یا یونہی "حقیقت" اور "معرفت" کے بھنور میں غوطے کھا رہا ہے۔ پھر خیال آیا کہ یہ بےچارہ اس کوچہ سے محض نابلد ہے، اُس کے نزدیک تو صرف اس کا فرضی محبوب (خدا) ہی ایک ایسی ہستی ہے جس تک رسائی ناممکن ہے، اُسے کیا خبر کہ جہاں محبت کا قدم درمیان میں آیا، ایک گوشت پوست سے بنے ہوئے انسان تک پہونچنا بھی خدا تک پہونچنے سے زیادہ دشوار ہو جاتا ہے۔ بہرحال جب وہ ارشاد فرما چکے، تو میں نے کہا:۔

"مولانا اس میں شک نہیں کہ جو کچھ میں نے بیان کیا، ہے تو وہ حقیقت۔ مگر جس "حقیقت" کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا اگر یہ وہی حقیقت ہے تو اس پر اور مجھ پر دونوں پر لعنت ہے میں تو آپ "مجاز" ہی میں اُلجھا رہنے دیجیے "حقیقت" کے کانٹوں میں نہ گھسیٹیے۔ وہ آپ ہی کو مبارک رہے" مولانا اس بدتمیزانہ جواب کے سننے کے بالکل تیار نہ تھے۔ بےچارے ہکا بکا رہ گئے۔ داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کچھ کہنا چاہتے تھے کہ میں نے موضوع گفتگو بدل دیا۔

ایک شعر اور بھی کہا ہے، وہ بھی سُن لو۔

جز ترے کوئی میرے پاس کہاں ہوتا ہے
اپنے سایہ پہ بھی تیرا ہی گماں ہوتا ہے

جہاں تک میری نظر پہونچتی ہے یہ مضمون بالکل نیا ہے۔ ہمارے شعراء عموماً تخیل کی مدد سے شعر کہتے ہیں۔ اپنے ذاتی محسوسات اور جذبات سے چنداں سروکار نہیں رکھتے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اُن کے یہاں اگر کوئی نیا مضمون ہوتا بھی ہے تو محض خیالی۔ حقیقت کو اس سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ اب اس شعر کی شانِ نزول بھی سُن لو:۔

(۶۔ جولائی) ہفتہ کی رات کو میں کلکتہ کے اسٹیشن پر بجلی کے کھمبے کے سامنے مسافروں کے مجمع سے دُور اکیلا کھڑا تھا۔ دل میں تمہارا خیال تھا۔ تصوّر میں تم سے باتیں ہو رہی تھیں کہ دیکایک اپنے سایہ پر نظر جا پڑی۔ ایک لمحہ کے لئے ایسا محسوس ہوا کہ تم مجسم میرے سامنے کھڑی ہو۔ اُسی وقت یہ شعر موزوں ہو گیا۔

میرے اشعار پر بہترین تنقید تم کر سکتی ہو۔ اس لئے کہ اُن کا تعلق صرف تم سے ہے۔ بتاؤ کہ ان شعروں میں کچھ "جان" ہے یا نہیں۔

۲۹۔ جولائی ۱۹۳۵ء

(آپ کا خط ملا)

انتظار اور پھر اُس کے خط کا انتظار جس پر جان جاتی ہو۔ آہ۔ موہنی! کیسے بتاؤں کہ یہ ۲۱ دن کیسے کٹے۔ تم نے بھی کسی سے محبت کی ہے۔ تم نے بھی کسی کے خط کا انتظار کیا ہے۔ ان لمحات کا تصوّر کرو جب کسی کی تحریر دیکھنے کے لئے آنکھیں ترستی ہیں، دل تڑپتا ہے کلیجہ مُنہ کو آتا ہے اور خط نہیں آتا۔ ڈاک کے وقت کیسی بے چینی ہوتی ہے۔ پوسٹ مین کی آواز سُن کر دل کیسا دھک دھک کرنے لگتا ہے۔ پھر جب خط نہیں آتا تو کیسی مایوسی ہوتی ہے۔ روز اُمید بندھتی ہے، روز ٹوٹتی ہے، کیا [illegible] جی میں کیسے کیسے وسواس آتے ہیں کیسی کیسی خوفناک باتوں کا تصوّر بندھتا

ہے۔ دل لرزلرز جاتا ہے۔ کلیجہ کانپ کانپ اٹھتا ہے۔ الٰہی خیر۔ کہیں کوئی بات کھل تو نہیں گئی۔ ہائے ایسا ہوا تو غضب ہوا حقیقت حال کوئی کیا جانے۔ دنیا تو ظاہر کو دیکھتی ہے۔ تمہاری علالت کے خیال نے اور بھی نیم جاں کر دیا کیسی کیسی دعائیں مانگی ہیں کہ خدا یا خیر کی خبر سنانا۔ دل میں کیسے بُرے بُرے خیال آتے تھے۔ سچ کہتا ہوں۔ موہنی اگر ورق کے ورق سیاہ کر ڈالوں، تب بھی اس اذیت کا اظہار ممکن نہیں جو اس مرتبہ تمہارے خط میں دیر ہونے سے میرے قلب اور روح کو پہنچی ہے۔

زندگی میں ہر قسم کے تجربات میں نے اٹھائے ہیں۔ خالی تخت اور کھری چارپائی پر بھی سویا ہوں۔ چٹائی پر اور کبھی صرف ننگی زمین پر سونے کا اتفاق بھی ہوا ہے۔ مگر موہنی تمہاری معصوم محبت کی قسم، اُن حالتوں میں ایسی تکلیف کبھی نہیں ہوئی جیسی ان دنوں اسپرنگ کی گدے دار مسہری پر راتیں کاٹنے میں ہوتی ہے، تمہیں بتاؤں کہ یہ بیس راتیں میں نے کیسے کاٹیں؟ مگر کیسے بتاؤں موہنی، کن الفاظ میں اس حالت کو بیان کروں۔ لیکن میرے بتائے بغیر تم خود سمجھ سکتی ہو۔ آہ۔ پیاری تم نے بھی مجھ سے کم اذیت نہیں سہی، بلکہ بعض صورتوں میں تمہاری تکلیف یقیناً مجھ سے زیادہ ہے۔

اُمید تھی کہ تمہارا خط آئے گا تو کچھ نہ کچھ سامان تسکین اپنے ساتھ لائے گا یہ خبر نہ تھی کہ وہ تازہ الجھنوں کا پیغام ہوگا۔ آہ موہنی یہ کیسی قید ہے۔ کیا قیامت ہے کہ میں اپنے دل کا حال بھی تمہیں نہیں سنا سکتا۔ خط لکھنے کی بھی ممانعت ہے۔ اپنے سوا کوئی اپنا ہمراز نہیں، دل پر جو گذرتی ہے دل ہی اُس سے خوب واقف ہے، اپنا درد دکھ کس سے کہوں، کسے سناؤں، کب تک سہوں، کب تک اُٹھاؤں، موہنی پیاری، خدا کے لئے کچھ کہو تو آخر ماجرا کیا ہے۔ ایسی قید

ایسی مجبوری۔ کیا خط لکھنے کے لئے تنہائی میسر نہیں آتی۔ کیا تمہاری نگرانی کی جاتی ہے؟ کیا خط ڈاک میں ڈالنے کے لئے قابل اعتماد آدمی نہیں ملتا؟ کیا خدا نخواستہ تمہاری معصومیت کو بے بنیاد شکوک کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ آخر کچھ بیان تو کرو کونسی نئی صورت حالات پیدا ہوگئی، جس نے ایسا مجبور کر دیا۔

میں سمجھتا تھا کہ ہر روز ہم دشواریوں پر قابو پاتے جا رہے ہیں۔ یہ معلوم نہ تھا کہ "میرا چاند" ایک بار چمک کر ایسا گہن میں آ جائے گا، ایسا گھنگھور گھٹاؤں میں چھپ جائے گا کہ میں اس کی ایک کرن بھی نہ دیکھ سکوں گا۔ آثار کہہ رہے ہیں کہ تمہارے دیدار کی تمنا۔ تمہاری صحبت میں چند پرسکون ساعتیں گذارنے کی آرزو تمہاری موہنی آنکھوں سے باتیں کرنے کا ارمان، اور تمہارے رس بھرے ہونٹوں سے "دو پیرھم!" سننے کی حسرت میرے ساتھ قبر میں جائے گی۔ آہ۔ موہنی میری جان، یہ کیا ہوگیا؟ مجھے اچھی طرح اندازہ ہے کہ تمہارے دل پر کیا گذرتی ہوگی۔ نہ کوئی ہمراز نہ غم خوار، اپنے دل کا درد اپنے سے کہنا اور آپ ہی سہنا، کسی سے ذکر کرنا تو درکنار، دل سے زبان تک لانا بھی گناہ ہے۔ کوئی ہوا بھی پا جائے تو قیامت آ جائے، ہمدردی کیسی اُلٹا دشمن بن جائے۔ تمہارا اضطراب اور بے تابی، اس پر مجبوری اور بے بسی میرے دل کا خون کئے دیتی ہے۔ ہائے کیا تدبیر کروں موہنی! جو تمہارے دل کو ذرا سا سکون حاصل ہو سکے۔

بظاہر میں آزاد ہوں مگر تمہاری مجبوریوں نے مجھے تم سے زیادہ قید و بند میں مبتلا کر رکھا ہے۔ تمہیں اگر موقع مل جائے تو مجھے خط تو لکھ سکتی ہو۔ میرے لئے تو اس کا بھی امکان نہیں، جانتا ہوں کہ میرا خط تمہیں نہیں مل سکتا، پھر بھی دیوانگی ملاحظہ، جب اُٹھتا ہے تو صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالتا ہوں، لکھ چکتا ہوں تو سوچتا ہوں یہ کیا کیا۔ بس پھاڑ ڈالتا ہوں۔ اب تک کتنے خط لکھے اور پھاڑ ڈالے۔ ہاں

کبھی یہ خیال بھی آجاتا ہے کہ شاید کسی وقت بھیج سکوں، تب البتہ چاک نہیں کرتا چنانچہ کئی خط جن میں باہم کوئی ربط نہیں، پڑے بھی ہیں، شاید وہ کبھی تم تک پہونچ سکیں۔

۳۰۔جولائی ۱۹۳۵ء (۶ بجے صبح)

مدّت سے یہ حالت تھی کہ میں شعر نہیں کہہ سکتا تھا، مگر اب چند روز سے تمہارے تصوّر پیہم کے طفیل، میری کوشش کے بغیر زبان سے بیساختہ اشعار نکل جاتے ہیں، دو شعر پچھلے خط میں لکھ چکا ہوں، باقی یہاں لکھتا ہوں۔ یہ سب میری حالت کے آئینہ دار اور میرے محسوسات کی سچی تصویر ہیں اور اگر میں نے تمہاری قلبی کیفیت کا اندازہ کرنے میں غلطی نہیں کی تو یہ سب کے سب یقیناً مجھ سے زیادہ تمہاری "آپ بیتی" ہیں۔

اس طرح جاگزیں ہے دل میں ترا تصوّر ۔۔۔ گویا لگی ہوئی ہے تصویر آئینہ میں

(۲۳۔جولائی ۱۹۳۵ء)

سچ کہنا موہنی، تمہیں اپنے پریم کی قسم۔ تمہاری پیاری تصویر اگر میرے دل کے آئینہ میں لگی رہے تو تمہیں اس پر کوئی اعتراض تو نہیں۔

مجبوریاں ہیں ظاہر، کیونکر کہوں کہ آؤ ۔۔۔ اب دل نہیں سنبھلتا، میں کیا کروں

(۲۳۔جولائی ۱۹۳۵ء)

شاید تمہیں یہ شک ہونے لگے کہ یہ شعر میرا ہے یا تمہارا۔

رات اک بزم میں تھے جور و جفا کے شکوے ۔۔۔ دل تڑپ آیا جو تری مہر و وفا یاد آئی

(۲۴۔جولائی ۱۹۳۵ء)

بڑے سیکھے لوگوں کی صحبت تھی۔ ایک صاحب بولے۔ "موسمی ہواؤں کی پُرکیف

محبت کا رُخ دیکھتے دیکھتے بدل جاتا ہے۔"

دوسرے نے کہا "جس نے عورت کی محبت پر اعتماد کیا، اُس نے کالے ناگ پر اعتماد کیا۔"

تیسرے صاحب بولے "عورت اور زہر ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔"

ایک شاعر صاحب نے فرمایا "ازل میں جب سب چیزوں کی تقسیم ہو رہی تھی، "فریب" ایک خوبصورت پھولوں کا گلدستہ بنا، عرش ایزدی کے پایہ کے پاس پڑا تھا۔ عورت سب کی نظر بچا کر آئے چرا لائی اور وہ اُسی کے پاس رہا۔"

ایک مولانا نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا "کہنے کو عورت ذات کی لبساط کیا مگر چھُری ہے چھری۔ دیکھنے میں بڑی کمزور، بڑی ناتوان، مگر بدیدی پر آجائے تو "ہندہ" کی طرح "امیر حمزہ" کا کلیجہ چبا ڈالے۔"

میں خاموش بیٹھا سُن رہا تھا۔ تمہارا مُسکراتا ہوا چہرہ اور محبت بھری آنکھیں میرے سامنے تھیں، خدا جانے ایک آن واحد میں کیا کچھ نظر سے گذر گیا۔ دل میں ایک چوٹ سی لگی اور تنہائی ہوتی تو ضرور دل کی آگ پانی کی شکل میں آنکھوں سے ٹپک پڑتی۔ اب میری باری تھی۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ آپ کی کیا رائے ہے؟

میں نے کہا "جو کچھ آپ حضرات نے فرمایا یہ صرف اُن عورتوں کا ذکر ہے جن سے آپ کو سابقہ پڑا ہے۔"

مولانا نے مکرر داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک طنز کے ساتھ کہا "جن عورتوں سے آپ کو سابقہ پڑا ہو آپ ان کے بارے میں کچھ ارشاد فرمائیے۔"

اب میرے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں نے کہا۔ اس گندی مجلس میں کسی معصوم ہستی کا ذکر کرنا اُس کی توہین ہے۔" یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا، گھر پہونچتے پہونچتے یہ شعر موزوں ہو گیا ہے

رات اک بزم میں تھے جورِ جفا کے شکوے　　دل بھر آیا جو تری مہر و وفا یاد آئی
میں کہوں تو شاید ہی تم کو اعتبار آئے　　شب کا ماجرا پوچھو آستین و بالش سے

(۲۴-جولائی ۱۹۳۵ء)

اُس رات کو نیند بہت دیر تک نہ آئی۔ پھر سو گیا۔ سویا تو ایک عجیب اندوہ ناک خواب دیکھا۔ تفصیل نہ پوچھو، تمہارے دل کو رنج ہوگا۔ روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ آنسوؤں سے آستین بھیگ گئی، تکیہ تر ہو گیا۔ خیر، خدا دشمن کو بھی یہ ہچکی نہ دے۔ کلیجہ نکلا پڑتا تھا۔ پھر جس طرح صبح کی، میرا ہی جی جانتا ہے۔

رات کچھ ایسا تصوّر نے ترے بیخود کیا　　ڈال کر اپنے گلے میں اپنی باہیں چوم لیں

(۲۶-جولائی ۱۹۳۵ء)

اس ملک میں مسہری کے پردے چھوڑے بغیر سونا ناممکن ہے۔ البتہ مچھروں سے فصد کھلوانی اور بخار کو دعوت دینی منظور ہو تو اور بات ہے۔ رات کو گرمی بہت تھی اُس پر مسہری کی بند کوٹھری، میں نے قمیص اُتار ڈالا، گلے میں صرف بنیان تھا، وہ بھی بغیر آستینوں کا۔ روشنی گل کرنے کے بعد تم سے باتیں ہونے لگیں۔ مجھے کچھ خبر نہیں۔ میرے ہاتھ کس طرح میری گردن میں حائل ہو گئے۔ میرے ہونٹوں نے میرے برہنہ بازو کو چھوا، خدا کی قسم مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ تمہارا بازو تھا جسے میرے گرسنہ لبوں نے بیتابانہ چوم لیا۔ کیا کہوں کیسی لذّت محسوس ہوئی۔ کوئی سنے تو اسے میری دیوانگی کے سوا اور کس چیز سے تعبیر کرے۔ اچھا تو ہنی، تم اسے کیا کہو گی؟۔

ہو کے آزاد بھی ہیں ہم مجبور　　ہائے مجبوریاں محبّت کی

(۲۸-جولائی ۱۹۳۵ء)

پرسوں جس وقت تمہارا خط ملا اور اسے پڑھ کر مجھے یہ معلوم ہوا کہ اب میں تمہارے خط کا جواب بھی نہ لکھ سکوں گا تو دل دھک سے ہو گیا۔ بہت دیر تک اسی سوچ میں بیٹھا رہا کہ اب کیا ہو گا۔ دل میں کہتا تھا کہ یا اللہ! آزاد ہونے پر بھی ہم اتنے مجبور ہیں۔ یہی خیال یکبارگی اس شعر کی شکل میں زبان پر جاری ہو گیا۔ اور میں دیر تک ایک نہایت دردناک لہجہ میں اسے گُن گناتا رہا۔

۲۰۔جولائی ۱۹۳۵ء (۹ بجے شب)

موہنی شاید تم اسے گستاخی سمجھو۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میں نے اپنی بات کے پاس کی خاطر زندگی میں بارہا نقصانات اُٹھائے ہیں لیکن اپنے عہد کو توڑنا میری غیرت نے کبھی گوارا نہ کیا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی پیکرِ جمال کے پرستاروں میں داخل ہونے کے بعد انسان کی خواہش، ارادہ، اختیار کچھ بھی اپنا نہیں رہتا جب میں نے تم سے تصویر مانگی اور تم نے نہ بھیجی تو میں نے عہد کیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو اب کبھی اس سوال کو نہ دہراؤں گا۔ مگر ایک مہینہ بھی نہ گذرنے پایا کہ میں نے اپنے اُس عہد کو توڑ دیا۔ نہیں معلوم کہ میرا وہ احساسِ غیرت کیا ہوا جو میں آج پھر تم سے انتہائے نیازمندی کے ساتھ التجا کر رہا ہوں کہ موہنی، میری پیاری، میری تمنا، میری روح کی تسکین، میرے قلب کی روشنی، میری زندگی کی بہار، میرے تخیل کی رعنائی، میری محبت کی دنیا، میری پیاری موہنی، خدارا اپنی تصویر بھیج دو اور بہت جلد بھیج دو۔ میں تمہیں مجبور نہ کرتا۔ مگر کیا کروں میں خود مجبور ہوں، یہ نامراد دل نہیں مانتا کسی طرح نہیں مانتا۔ تمہاری پیاری نوازشوں نے اسے بگاڑ دیا۔ مچلتا ہے، ضد کرتا ہے، سنبھالے نہیں سنبھلتا، تم پر ناز کرتا ہے۔ تم نے کیوں اس کی اتنی رعائتیں کیں، کیوں اتنی عنایتیں کیں۔ اب میرا کہا نہیں سنتا۔ تم ہی اسے سنبھالو تم ہی

سمجھاؤ۔ تمہیں اختیار ہے کہ اس کی ضد پوری کر کے اسے مسرتوں سے لبریز کر دو۔ یا مایوس کر کے تڑپنے کے لئے چھوڑ دو۔ موہنی تمہیں اپنی موہنی آنکھوں کی قسم، اب میرے صبر کی مزید آزمائش نہ کرو۔ میں اس امتحان میں بُری طرح فیل ہو گیا۔ آیندہ بھی کامیابی کی اُمید نہیں۔ بس اب تمہاری عنایت پر دار و مدار ہے۔

سچّی کہانی

عورت!

"پنہاں" جانِ آرزو!! اچھّا خفا نہ ہو۔ تمہیں اصرار ہے تو عورتوں کے متعلّق آج اپنے خیالات بے کم و کاست تمہیں لکھے دیتا ہوں۔

سانپ بھی قاتل، زہر بھی قاتل، لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ سانپ جسے چاہے کاٹ لے اور مار ڈالے۔ مگر زہر بے جان ہونے کی وجہ سے اپنے عمل کے لئے ایک واسطے کا محتاج ہے۔ جب تک کوئی اُسے استعمال نہ کرے ہلاکت ممکن نہیں، قدرت نے عورت کو سانپ اور زہر دونوں کا مجموعہ بنایا ہے۔ یہ ناگن جسے ڈس لے وہ کبھی جاں بر نہیں ہو سکتا، اور جو کوئی خود اس سے سروکار رکھے اُس کی ہلاکت بھی یقینی ہے، پھر بعض سانپ بے ضرر بھی ہوتے ہیں۔ مگر کیا عورت کے متعلّق بھی کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے؟ سانپ کو جب تک نہ چھیڑو وہ حملہ نہیں کرتا لیکن عورت! پناہ بخدا! اس کی آنکھوں میں اژدہے کی سی مقناطیسی کشش موجود ہے۔ شکار سامنے سے

گذرا اور اُس نے کھینچ لیا چھیڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

عام طور پر مشہور ہے کہ فساد کی بنیاد تین چیزیں ہیں، زر، زمین، زن۔ اس میں شک نہیں کہ زر اور زمین کی خاطر بھی دنیا ہمیشہ پامال ہوئی ہے لیکن عالم انسانیت کو عورت کے باعث جن گوناگوں تباہیوں سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اُس کے تصوّر ہی سے کلیجہ کانپ اُٹھتا ہے۔ بات یہ ہے کہ زر اور زمین جن بربادیوں کا باعث ہو سکتے ہیں، عورت بھی انہیں بروئے کار لا سکتی ہے لیکن اُن کے علاوہ بہت سی ہولناک تباہیاں ایسی بھی ہیں جو صرف عورت ہی کے باعث وجود میں آ سکتی ہیں، اس طرح عورت خود اپنی ذات سے پیدا ہونے والے۔ نیز زر اور زمین سے اُٹھنے والے تمام فتنوں کی جامع ہے۔

جس دن سے دنیا وجود میں آئی انسانوں کا کوئی طبقہ عورت کی لائی ہوئی بلاؤں سے محفوظ نہیں رہا۔ پیغمبروں نے عذابِ الٰہی کی سختیاں جھیلیں۔ ائمۂ ہدا اور اولیا اللہ نے جانیں گنوائیں، ذلتیں اُٹھائیں۔ بادشاہوں نے سلطنتیں کھوئیں اور موت کے گھاٹ اُترے۔ انسانی خون کی ندیاں بہیں، آبادیاں ویرانوں میں اور محل مقبروں میں تبدیل ہو گئے۔ اور اس سب کی ذمّہ دار حوّا کی سعادت مند بیٹیاں ہیں۔ شاید اسی لئے پیغمبر عربی نے فرمایا ہے کہ "اگر حوّا نہ ہوتی تو کوئی عورت قیامت تک اپنے رفیقِ زندگی کے ساتھ خیانت نہ کرتی"[۱]

آسمانی کتابوں میں لکھا ہے کہ جنت میں گیہوں کا ایک پیڑ تھا۔ خدا نے آدم کو اُس کے پاس جانے سے منع کر دیا تھا۔ حوّا نے اس ممانعت کے باوجود گیہوں کے تین دانے اس پودے سے توڑ لئے۔ ایک خود کھایا اور دو آدمؑ کے لئے لائیں۔ آدمؑ

---

[۱] لولا الحوّاء لم تخن انثیٰ زوجہا الدّھر۔

نے پوچھا یہ کیا چیز ہے؟ حوّا نے کہا "یہ پھل ہے اس پیڑ کا جس کے کھانے سے خدا نے ہمیں منع فرمایا تھا۔ ایک دانہ میں نے کھایا اور دو تمہارے لئے لائی ہوں۔" آدمؑ نے پوچھا "اس میں کیا لذّت ہے؟" کہا اس میں غضب کی حلاوت و شیرینی ہے۔" آدمؑ نے اس کے کھانے سے انکار کیا۔ حوّا نے جب یہ ماجرا دیکھا تو ایک پیالہ شراب کا لا کر آدمؑ کو پلایا۔ آدمؑ پر بے خودی کا عالم طاری ہو گیا اور گیہوں کے وہ دو دانے حوّا سے لے کر کھا گئے۔ اور عہد شکنی کی۔ ہنوز وہ دانے حلق سے نیچے نہیں اترے تھے کہ تاج ان کے سر سے اُڑ گیا اور وہ تخت سے گر پڑے۔ آدم اور حوّا دونوں بالکل برہنہ ہو گئے۔ جنّت کی تمام نعمتیں ان سے چھن گئیں اور دنیا میں پھینک دیئے گئے۔

جب یہ واقعات میں نے پڑھے، مجھے خیال ہوا کہ شاید سب عورتیں حوّا کی طرح اپنے شوہروں کے لئے نزولِ آفات کا باعث ہوتی ہیں اور شاید اسی لئے پیغمبر عربی نے انہیں "شیطانوں کی رسّیاں[۱]" کہا ہے۔

حوّا کی سب سے پہلی بیٹی اقلیما تھی۔ دنیا میں پہلی مرتبہ انسانی خون اسی اقلیما کی بدولت بہایا گیا۔ برادر کشی کا پہلا واقعہ اسی اقلیما کے باعث ظہور میں آیا، نیک نہاد شوہر پہلی بار اسی اقلیما کے سبب موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ اقلیما خوبصورت تھی، بہت خوبصورت ماہ دیروں کو شرمانے والی۔ قابیل اور ہابیل دونوں اس کے بھائی تھے۔ ہابیل سے اس کی شادی ہوئی۔ قابیل جو اقلیما کے حسنِ بے پناہ کی قوتوں سے مسحور ہو چکا تھا، ہابیل کی کامرانی اور اپنی محرومی کو برداشت نہ کر سکا۔ اس نے ہابیل کا سر پتھر سے کچل دیا۔

جب یہ واقعات میں نے پڑھے مجھے خیال ہوا کہ شاید سب عورتیں اقلیما کی طرح فتنہ و فساد کا باعث ہوتی ہیں۔

---

[۱] النساء حبالة الشياطين۔

نوحؑ پیغمبر تھے، غیر معمولی ہمت و استقلال کے مالک، تقریباً ایک ہزار برس اپنی قوم کی ہدایت میں مصروف رہے۔ قوم نے انہیں بڑی بڑی جسمانی اذیتیں دیں۔ مگر وہ صبر کے ساتھ برداشت کرتے رہے۔ آخر ایک دن لوگوں نے ان کو اس بُری طرح زدوکوب کیا کہ اُن کا تمام جسم چکنا چور اور کپڑے خون میں شرابور ہو گئے۔ اُن کی بیوی نے کہا "اے لوگو! نوحؑ تو دیوانہ ہے، تم ناحق اسے اتنا مارتے ہو۔ وہ جو کچھ کہتا ہے دیوانہ پن میں کہتا ہے"۔ بیوی کی زبان سے اپنی دیوانگی کا اعلان سُن کر نوحؑ کا پیمانہ صبر چھلک گیا۔ اُنہوں نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر فریاد کی کہ بارِ الٰہا! اب میں بالکل مغلوب ہو گیا۔ تو میری امداد فرما۔ تیر دعا ہدفِ اجابت پر بیٹھا اور ایک عالم گیر طوفان نے اس تمام قوم کو، اُس بدبخت عورت سمیت ہلاک کر دیا۔

جب یہ واقعات میں نے پڑھے، مجھے خیال ہوا کہ شاید سب عورتیں نوحؑ کی بیوی کی طرح اپنے شوہروں کو دیوانہ سمجھتی اور بالآخر ایک عالم گیر تباہی کا سبب بنتی ہیں

آؤ اب دنیا کا "بہترین قصہ"، تمہیں سُناؤں، وہ افسانہ بھی ہے اور عبرت کا تازیانہ بھی۔ دنیا کا سب سے زیادہ حسین انسان صرف اپنی عصمت اور پاک بازی کے گناہ میں، ایک مغلوبِ ہوس، عورت کے ہاتھوں زندانی بنایا جاتا ہے۔ عورت بھی کون، جو دل و جان سے اُس پر فریفتہ تھی، جس کی محبت طوفانوں کی طرح پرشور اور سمندروں کی طرح اتھاہ تھی۔ جو اپنا سب کچھ حتیٰ کہ ننگ و ناموس بھی محبت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے کے لیے تیار تھی۔ جب اُس کے نفس کی آگ کو ٹھنڈا نہ کیا گیا تو اُس کی محبت دشمنی میں تبدیل ہو گئی۔ اُس نے اپنے محبوب پر، معصوم محبوب پر، اپنے اوپر دست درازی کا جھوٹا الزام لگایا۔ آخر دنیا پر اُس کا فریب کُھل گیا اور اُس نے جوشِ غضب میں اُس مجسمۂ جمال و عصمت کو قید میں ڈال دیا۔ اور برسوں عذاب

زندان میں مبتلا رکھا۔ وہ محبوب کُش عورت زلیخا تھی جس کی محبت آج بھی ہماری شاعری کا دلچسپ موضوع ہے اور اُس کا محبوب یوسفؑ جس کے فراق نے یعقوبؑ کی آنکھوں کا نور چھین لیا تھا۔

جب یہ واقعات میں نے پڑھے مجھے خیال ہوا کہ شاید سب عورتیں زلیخا کی طرح محبوب کُش اور دنیا دشمن ہوتی ہیں۔

ہندوؤں کی روایات میں بھی اس قسم کے واقعات بکثرت ملتے ہیں، جن کی بنا پر عورت کو فتنہ و فساد کی بنیاد قرار دینا لازمی ہو جاتا ہے۔ رانی کیکئی کی بدولت رام چودہ برس کے لئے جلاوطن کئے گئے۔ بوڑھے باپ نے بیٹے کے فراق کی تاب نہ لا کر تڑپ تڑپ کے جان دے دی۔ صحرانوردی کے زمانہ میں سیتا بھی رام کے ساتھ تھیں۔ لنکا کا راجہ راون، سیتا کے حُسن عالم آشوب کا شکار ہو کر انہیں لنکا اٹھا لے گیا۔ رام نے لنکا پر فوج کشی کی۔ راون مارا گیا۔ لنکا تباہ ہوئی اور سیتا واپس آئیں۔ رام جلاوطنی کی مدت پوری کر کے جب اجودھیا واپس آئے تو لوگوں نے انہیں سیتا کی بے عصمتی کے طعنے دینے شروع کئے۔ رائے عامہ سے مجبور ہو کر رام نے اپنی بے گناہ محبوب بیوی سیتا کو گھر سے نکال دیا اور خود سرجو ندی میں ڈوب کر جان دے دی۔ ان تمام تباہیوں اور بربادیوں کا سبب بھی عورت تھی۔

اندر دیوتا کا یہ دستور تھا کہ جب وہ کسی رشی کی عبادت کو حد سے گذرتا دیکھتے اور انہیں یہ خوف ہوتا کہ اب یہ رشی مجھ سے بھی بڑھ جائے گا تو اُس کی عبادت میں خلل ڈالنے کے لئے کسی عورت کو اُس کے پاس بھیجدیا کرتے تھے۔ یہ مجرب اور کامیاب نسخہ اُنہوں نے بارہا استعمال کیا اور کتنے ہی رشیوں کی ریاضتیں اس طرح تباہ کیں۔ اس قسم کا سب سے زیادہ مشہور واقعہ مہارشی وشوامتر کا ہے جنہیں مینکا

نامی عورت نے گمراہ کیا تھا اور جس کا نتیجہ کالی داس کی مشہور ہیروئن شکنتلا کی شکل میں ظاہر ہوا۔ نار دمنی کی تباہی کا باعث بھی ایک عورت ہی ہوئی تھی ۔ ۔ ۔

یونانیوں کی تباہ کن لڑائی جو جنگِ ٹروجن کے نام سے مشہور ہے۔ ایک عورت ہی کی بدولت ہوئی تھی ۔ اُس عورت کا نام ہیلن تھا۔ کہتے ہیں کہ ہیلن سے زیادہ خوبصورت عورت یونان میں کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ شادی کے بعد ہیلن اپنے شوہر مینیلاؤس کی غیر حاضری میں پیرس کے ساتھ ٹروجن کو بھاگ گئی اور پیرس کے مرنے کے بعد اُس کے بھائی دی فوبوس سے شادی کر لی لیکن جب شہر فتح ہو گیا تو اُس نے دی فوبوس کو اپنے پہلے شوہر مینیلاؤس کے حوالہ کر دیا اور خود از سرِ نو اُس کی بیوی بن گئی اور باقی زندگی عیش و عشرت سے بسر کی۔

جب یہ واقعات میں نے پڑھے، مجھے خیال ہوا کہ شوہر سے بے وفائی کرنا شاید عورت کی فطرت میں داخل ہے۔

مصر کی شہرۂ عالم، حور طلعت فرماں روا، کلیوپیٹرا کی داستانِ زندگی بھی کچھ کم عبرت انگیز نہیں۔ سترہ برس کی عمر میں وہ مع اپنے چھوٹے بھائی کے تخت پر بیٹھی اس زمانہ کی رسم کے مطابق یہی بھائی اُس کا شوہر بھی تھا۔ چند سال بعد اختیاراتِ شاہی کلیوپیٹرا سے چھین لئے گئے۔ وہ شام چلی گئی اور مصر کا تخت واپس لینے کے لئے جنگی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔ آخر جولیس سیزر کو اپنے حسنِ عالم آشوب کا دیوانہ بنا کر اُس سے مصر پر فوج کشی کرادی۔ مصر کا فرماں روا یعنی کلیوپیٹرا کا بھائی اور شوہر مارا گیا۔ اور وہ از سرِ نو تخت نشین ہوئی۔ اس مرتبہ بھی اس کا ایک چھوٹا بھائی حکومت میں اس کا شریک کیا گیا لیکن کلیوپیٹرا نے جلد ہی اُسے زہر دے کر مار ڈالا۔ روم میں

وہ کھلے بندوں سیزر کی داشتہ کی حیثیت سے رہتی تھی۔ سیزر کے قتل ہو جانے کے بعد وہ مصر واپس آئی اور مارک اینٹونی کی حلیفہ اور داشتہ بن گئی۔ روم کے لوگ اس تعلق سے سخت بیزار تھے۔ آکٹیوین نے کلیوپیٹرا اور اینٹونی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور آکٹیوم میں انہیں شکست دی۔ کلیوپیٹرا اور اینٹونی بچ کر نکل گئے اور اسکندریہ پہونچے۔ کامیابی کی کوئی صورت نہ دیکھ کر کلیوپیٹرا آکٹیوین کی اس شرط پر راضی ہو گئی کہ اینٹونی کو قتل کر دے۔ چنانچہ فریب دے کر اس نے اینٹونی کو ایک مقبرہ میں بلایا۔ جو اس نے بظاہر اس لئے تیار کیا تھا کہ "دونوں ساتھ مریں گے اور ساتھ دفن ہوں گے"۔ اینٹونی فریب کھا گیا۔ وہ سمجھا کہ کلیوپیٹرا پہلے ہی خودکشی کر چکی ہے۔ یہ دیکھ کر اس نے بھی خود کو ہلاک کر ڈالا۔ آکٹیوین پر کلیوپیٹرا کے حسن کا جادو نہ چلا۔ اور آخرکار وہ ایک زہریلے ناگ سے خود کو ڈسوا کر مر گئی۔

جب یہ واقعات میں پڑھے، مجھے خیال ہوا کہ شاید عورت اپنی آسائشِ نفس کی خاطر سب کچھ قربان کر سکتی ہے۔

خسرو ایران کیکاؤس کی ملکہ سودابہ بھی نسوانی کیریکٹر کی تباہ کاری کا ایک دلچسپ نمونہ ہے۔ وہ اپنے سوتیلے بیٹے سیاوش پر فریفتہ ہو گئی۔ سودابہ بلا کی حسین تھی۔ کیکاؤس ایک بت کی طرح اسے پوجتا تھا۔ لیکن نیک نہاد سیاوش پر اس کے حسن کا جادو نہ چل سکا۔ سودابہ نے حصول آرزو کی کوئی تدبیر اٹھا نہ رکھی مگر ناکام رہی۔ آخر جوشِ غضب میں اس نے معصوم سیاوش کے ساتھ وہی سلوک کیا جو زلیخا نے یوسف کے ساتھ کیا تھا کیکاؤس نے بیٹے کی بے گناہی کا ثبوت ضروری سمجھا۔ اس لئے اسے دہکتی آگ میں جھونک دیا۔ سیاوش اس امتحان میں بھی پورا اترا اور خلیل اور سیتا کی طرح آگ سے صحیح و سالم نکل آیا۔ سودابہ اپنی شکست سے

اور بھی دیوانی ہو گئی۔ وہ ایک زخمی ناگن کی طرح پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ محبت کی بجائے اب انتقام کی آگ اُس کے سینہ میں شعلہ زن تھی۔ شہزادہ سیاوش کو نقصان پہنچانے کے لئے اُس کی ریشہ دوانیاں برابر جاری تھیں۔ شہزادہ اس خوبصورت ناگن سے ڈرتا تھا۔ جلاوطنی اختیار کرنے کے سوا اُسے اور کسی حال میں عافیت نظر نہ آئی۔ آخر موقع پاکر ایران کے حریف یعنی فرماں روائے توران افراسیاب کی پناہ میں چلا گیا۔ جہاں انجام کار نہایت بیدردی سے قتل کیا گیا جس کا نتیجہ ایران و توران کی تباہ کن جنگوں کی شکل میں رونما ہوا۔ ان تمام خونی واقعات کی ذمہ دار صرف ایک عورت تھی

پیغمبرؐ اسلام کے نواسے جناب حسنؑ ابن علیؓ کی صلح جوئی اور امن پسندی سب کو تسلیم ہے۔ یہاں تک کہ فتنہ و فساد سے بچنے کے لئے وہ خلافت سے دستبردار ہو گئے تھے۔ لیکن امیر معاویہ کو اب بھی اطمینان نہ ہوا۔ وہ برابر ان کی ہلاکت کی تدبیریں سوچتا رہا۔ آخر حاکم مدینہ مروان کی مدد سے یہ عقدہ حل ہو گیا مروان نے الیسونیہ نام ایک دلالہ کی وساطت سے جناب حسنؑ کی زوجہ جعدہ بنت اشعث المعروف بہ اسماء سے ساز باز کیا اور اُسے یقین دلا دیا کہ شہزادہ یزید ابن معاویہ تیرے حسن و جمال کا شہرہ سن کر غائبانہ عاشق ہو گیا ہے۔ اور تیرے فراق نے اُس کا برا حال کر رکھا ہے اگر تو زہر سے جناب حسنؑ کا کام تمام کر دے تو عراق و شام کی سلطنت اور خود یزید تیرے قدموں میں پڑے ہوں گے۔ جاہ پسندی کے جذبہ نے جعدہ کو اندھا کر دیا اور اس ناگن نے اپنے سرتاج کو ڈس لیا۔

جب یہ واقعات میں نے پڑھے۔ مجھے خیال ہوا کہ شاید عورت مال و جاہ کی خاطر سب کچھ قربان کر سکتی ہے۔

"پنہاں!" یہ ہیں وہ خیالات جو کبھی میرے لئے معتقدات مذہبی کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن آج اُن پر غور کرتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے، ہنسی آتی ہے، غصّہ آتا ہے، شرم آتی ہے، حیرت ہوتی ہے اُس عظیم الشان انقلاب پر جو ایک "عورت" کی بدولت میرے خیالات میں رونما ہوا ہے۔ ہنسی آتی ہے اپنی اُس حماقت پر جو ایک زمانہ تک میری رفیق رہی۔ غصّہ آتا ہے اس تعصب پر جس نے میری آنکھوں پر پردے ڈال دیئے تھے اور جس کی بنا پر میں یہ سمجھنے لگا تھا کہ سانپ، چھری، زہر، تباہی، موت اور عورت ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں۔ شرم آتی ہے اپنی گمراہی اور اپنی فطرت کی اس پستی پر جس میں میں مدتوں مبتلا رہا۔

"پنہاں!" جانِ آرزو! تیرے معصوم تبسّم کی قسم، اگر میرا ہر موئے تن زبان بن جائے تب بھی میں تیرا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ میری آنکھوں پر نادانی کے سیاہ پردے پڑے ہوئے تھے تعصّب کی روئی سے میرے کان بند تھے۔ کج فہمی نے مجھے اصابت رائے سے محروم کر دیا تھا لیکن جس دن سے میں نے تجھے دیکھا میری آنکھیں کھُل گئیں۔ تیری آواز سے میری سماعت بحال ہو گئی اور جب سے تجھے جانا میرے قلب کا مکدر آئینہ انوار سے جگمگا اُٹھا۔

"پنہاں!" تو نے مجھے اس قابل بنایا کہ قدرت کے شاہکار (عورت) کو سمجھ سکوں تجھے جاننے کے بعد پیغمبرِ عربی کا یہ قول سمجھ میں آیا کہ "تمہاری دنیا کی تین چیزیں مجھے مرغوب ہیں۔ عورت، خوشبو اور نماز" لوگوں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اس کی تاویلیں کی ہیں۔ مگر میرے نزدیک یہ قول کسی تشریح و تاویل کا محتاج نہیں۔ بات بہت پیاری اور بہت گہری ہے گہرائی صاف کہ ہر شخص سمجھ سکے۔ پیغمبر کی ذات ذوجہتین ہوتی ہے، ایک جہت اُس کی نبوت ہے اور دوسری بشریت، نبوت کی معراجِ کمال یہ ہے کہ ذاتِ احدیت سے قرب تمام حاصل رہے۔ اس کا بہترین واسطہ عبادت (صلوٰۃ) ہی ہو سکتی ہے اور بشریت کی تکمیل

عورت کے سوا اور کسی شے سے ممکن نہیں۔

انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے مرد کی دنیا ناقص اور ناتمام ہی رہتی ہے جب تک عورت اس میں داخل نہ ہو۔ مرد کی زندگی ایک نقش ہے اور عورت اُس کا رنگ، مرد کی زندگی ایک بربط ہے اور عورت اُس کا نغمہ۔ مرد کی زندگی زمین کی مانند ایک کرہ ہے اور عورت اُس کا آفتاب جب دن ہو اور ماہتاب جب رات ہو۔ مرد کی زندگی ایک پیکر ہے اور عورت اُس کی روح۔ مرد کی زندگی ایک ریگ زار ہے اور عورت اُس میں ایک سرد و گوارا پانی کا چشمہ، مرد کی زندگی ایک طویل خواب ہے اور عورت اُس کا وہ خوش گوار حصّہ جو بیدار ہونے کے بعد یاد رہ جائے۔ مرد کی زندگی ایک افسانہ ہے اور عورت اُس کا دلچسپ ترین باب، مرد کی زندگی ایک عرصۂ کارزار ہے اور عورت اُس کی امن گاہ و جائے پناہ۔ مرد کی زندگی موسموں کا ایک مکمل دَور ہے اور عورت اُس کی بہار، مرد کی زندگی ایک کتاب ہے اور عورت اُس کا شیرازہ۔ مرد کی زندگی ایک فضائے بسیط ہے اور عورت اُس کی شفق، دھنک اور روشنی۔ غرض جس طرح عالم نبوّت کے لئے سب سے زیادہ مہتم بالشان چیز نماز ہے۔ اسی طرح عالم بشریت کے لئے سب سے زیادہ اہم شے عورت ہے۔ رہ گئی خوشبو تو وہ نماز اور عورت دونوں کے لطف کو دوبالا کرنے والی چیز ہے۔ اسی لئے عورت اور نماز کے ساتھ خوشبو کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

"پنہاں!"، عورت کے متعلق میرے گذشتہ مجرمانہ خیالات سے واقف ہو کر تم مردوں کے متعلق عام طور پر اور میرے متعلق خاص طور پر خدا جانے کیسی پست رائے قائم کرو گی۔ مگر نہیں "پنہاں!"، تم ایک عورت ہو اور مکمل عورت۔ خدا نے تمہاری ہمّت بلند اور فطرت عالی بنائی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری اس ہرزہ سرائی کو پڑھ کر سوائے اس کے کہ ایک دل نواز تبسم تمہارے گلابی ہونٹوں پر کھیلنے لگے اور کچھ بھی نہ ہو گا۔ میں نے عورت کے خلاف جو کچھ کہا تم اُسے اپنے محبوب کے شاعرانہ تخیل کی ایک بے اعتدالی سے

تعبیر کرو گی اور بس۔

خدا میرے گناہوں کو معاف کرے۔ میں نے قدرت کے شاہکار کو کیسے کیسے برے لفظوں سے یاد کیا ہے۔ کبھی اُسے فساد کی بنیاد قرار دیا، کبھی غداری اور بے وفائی کا مجسمہ ٹھہرایا۔ کبھی عین ہوسناکی و ہوس پرستی کہا اور اس کے سوا کیا کیا کچھ نہیں کہا۔ مگر رحمت ایزدی کے مقابلہ میں میری اس قسم کی لغزشیں اتنی حیثیت بھی نہیں رکھتیں جتنی سیلاب کے سامنے ایک تنکے کی ہوتی ہے۔ رہ گئیں تم، تو کیا تمہارا محبت سرشت دل مجھ سے میرے گناہوں کا مواخذہ کرنے کے لیے کبھی آمادہ ہو سکے گا؟۔

آہ جان! تمہیں پا لینے کے بعد اب دل میں اور کسی چیز کی تمنّا باقی نہیں، رہی آرزو ہے تو صرف اتنی کہ خدا میری اس بہشت ارضی کو جاودانی بنادے۔ میں بخوشی اس کے لئے تیار ہوں کہ جنت کو اُن محروم القسمتوں کے لئے چھوڑ دوں جو جیتے جی کبھی فردوس میں داخل نہ ہو سکے یعنی عورت کی محبت سے شادکام نہ ہوئے۔

کسی طرح یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ لذّت کے جویا، سکون کے خواہاں، روحانی مسرت کے ڈھونڈھنے والے سرگرداں کیوں پھرتے ہیں۔ وہ ایک مجموعہ خوبی کی تلاش کیوں نہیں کرتے، عورت، ایک عورت اگر وہ صحیح معنوں میں عورت ہو تو لذت مسرت سکون سب کچھ دے سکتی ہے۔ جب میں لوگوں کو عورت کی حقیقت کے متعلق بحث کرتے دیکھتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں۔ تعجب ہے وہ اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتے کہ نور جب مادی پیکر اختیار کر لیتا ہے تو عورت بن جاتی ہے۔

قدرت نے عورت کو دنیا کے لئے بمنزلہ بہار پیدا کیا ہے۔ مگر یہ ایک معیاری عورت کی تعریف ہے۔ جیسی میری "پنہاں"، اس سے کم درجہ کی عورت ہو تو اُسے گلستاں سے تعبیر کر سکتے ہیں اور نیچے اُتر آئیے تو پھولوں کی کیاری کہیئے۔ اس سے بھی ادنیٰ درجہ ہو تو سبد گل نام رکھئے۔ یہ بھی زیادہ ہو تو گلدستہ سہی۔ کچھ بھی نہ ہو تو ایک پھول

ہے یا خوشبو، اس کے بعد کسی کمی کی گنجایش نہیں، یہ عورت کا پست ترین درجہ ہے۔ کہتے ہیں کہ خوشبو کو ہم دیکھ نہیں سکتے۔ نور کو چھونا ممکن نہیں۔ روح کی آواز ہمارے کانوں میں نہیں آتی۔ مگر یہ اُن لوگوں کا خیال ہے جو عورت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے خوشبو کو دیکھنے کا آرزومند عورت کو دیکھے۔ نور کو چھونے کا تمنائی عورت کے لمس سے لذت گیر ہو۔ روح سے ہم کلامی کا خواہاں عورت سے گفتگو کرے، در حقیقت عورت قدرت کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔

انسانی طبائع مختلف ہیں۔ کوئی موسیقی کا دلدادہ ہے۔ کوئی چاندنی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ کسی کے لئے شعروں میں پیغام سکون ہوتا ہے۔ کوئی پھولوں پر جان دیتا ہے لیکن سب سے زیادہ عالی فطرت وہ انسان ہے جو قدرت کی ان تمام نعمتوں سے یکساں طور پر لذت گیر ہوتا ہے اور اُن میں سے کوئی ایک شے بھی کم ہو تو اُس کی روح بھٹکتی پھرتی ہے۔ ایسے انسان کی ہمہ گیر طبیعت کے لئے سامانِ سکون بہم پہنچانا ناممکن تھا۔ اس لئے قدرت نے اس کے واسطے عورت کو پیدا کیا جو بیک وقت شعر بھی ہے اور نغمہ بھی، پھول بھی ہے اور چاندنی بھی۔ کیوں "پنہاں" یاد ہے وہ شعر جو میں نے پہلی ملاقات کے خاتمہ پر فی البدیہہ کہہ کر تمہاری نذر گذرانا تھا ؎

تم چاندنی ہو، پھول ہو، نغمہ ہو، شعر ہو
اللہ رے حسنِ ذوق مرے انتخاب کا

دنیا کے کسی شاعر، مصور، یا بُت گر کا تخیل آج تک کوئی ایسی حسین چیز دنیا کے سامنے پیش نہیں کر سکا۔ جو عورت میں موجود نہیں۔ عورت اگر نہ ہوتی تو یہ حسن و محبت کی رنگین داستانیں کیوں کر تیار ہوتیں۔ عورت کا حسن اور عورت کی محبت علیحدہ کر لینے کے بعد بھی کیا دنیا اس قابل رہ جاتی ہے کہ کوئی اس میں رہنے کی آرزو کرے۔ وہ دنیا نہ ہوگی ایک ورکشاپ یا فیکٹری ہوگی جس میں گوشت پوست سے بنی ہوئی انسانی مشینیں کام کرتی ہوئی دکھائی دیں گی۔ مرد کی تمام جسمانی اور روحانی مسرتیں عورت کی

ذات سے وابستہ ہیں۔ دن کے وقت اس کا مطالعہ ایک رنگین افسانہ کا مزہ دیتا ہے اور رات کے وقت ایک روح پرور خواب کا۔ وہ آنکھوں کے لئے مہتاب ہے اور ہونٹوں کے لئے شراب اور آغوش کے لئے سکون تمام۔ عورت سے بے نیازی حسن سے لذت گیر ہونے کی صلاحیتوں کے فقدان کا نام ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عورت کو صنفِ لطیف کہنا انتہائی بے انصافی ہے کیونکہ فنونِ لطیفہ میں عورتوں نے کوئی کارنامہ نہیں چھوڑا۔ اور جمالیاتی حس اُن میں مفقود ہوتی ہے۔ کوئی ان کورسوادوں سے پوچھے کہ بدبختو! فنونِ لطیفہ (شاعری، مصوری، موسیقی اور بت گری) کا سب سے اہم موضوع کیا عورت کے سوا کوئی اور چیز بھی ہو سکتی ہے۔ پھر عورت کو صنفِ لطیف بلکہ عین لطافت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

"پنہاں!" آخر میں تمہیں ایک بات اور بتا دوں۔ سچ کہتا ہوں جب سے میں نے تمہیں جانا اُس وقت سے مجھے ہر عورت سے محبت ہو گئی، یا اللہ، یہ پیشانی پر شکنیں، کیوں پڑ گئیں۔ یہ آنکھوں میں برہمی کے آثار کیوں نمودار ہو گئے۔ ہر عورت سے محبت ہو جانے کے معنی یہ تھوڑا ہی ہیں کہ دنیا کی کوئی عورت تمہاری جگہ لے سکتی ہے یا تمہارا بدل ہو سکتی ہے۔ "پنہاں!" میرے پاس صرف ایک دل ہے اور ایک دل کے لئے صرف ایک محبوب کافی ہے۔ وہ ایک دل تمہاری فردوسی محبت سے اس درجہ معمور ہو چکا ہے کہ اب اُس میں کسی دوسری عورت کا تو ذکر کیا، خدا کی بھی گنجائش نہیں،

"پنہاں!" اب مجھے اجازت دو کہ اس شیریں حکایت کا باقی حصہ پھر کسی وقت سناؤں۔ اچھا خدا حافظ، جانِ آرزو!۔

تمہارا، زندگی کی آخری سانسوں تک تمہارا

پریم

سچّی کہانی

(نجومی)

ساقی کے سلئے میں سنے ایک سچی کہانی لکھی ہے جو آپ کے ملاحظہ کے لئے بھیج رہا ہوں، نجومی نے زہرہ کا جو سراپا بیان کیا تھا وہ میں نے اس میں درج نہیں کیا۔ اگر کچھ مضائقہ نہ ہو تو ان سطور کو آپ پُر کر دیجئے ممنون ہوں گا ......

"پ - پ"

بھائی شاہد، میرا جواب صرف ایک شعر تھا۔ سو میں نے لکھ دیا۔ اب آپ اس کو شائع کر کے اُن کی نظروں تک پہونچا دیجئے احسان ہوگا ......

"زہرہ"

"میں اگلی پچھلی سب باتیں بتا سکتا ہوں" بوڑھے نجومی نے بڑے دعوے کے ساتھ کہا۔ "غیب کا حال خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور اگر کوئی اس کا دعویٰ کرے تو یقیناً

جعل ساز اور جھوٹا ہے" میں نے نہایت حقارت آمیز لہجہ میں جواب دیا۔ بوڑھا نجومی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے برہمی کے آثار نمایاں تھے۔

"تجربہ کے بغیر کسی کو جعل ساز اور جھوٹا کہنا اپنی بے وقوفی کو ظاہر کرنا ہے" اُس نے نہایت بیباکی کے ساتھ بگڑ کر کہا "تم سمجھتے ہو کہ جو بات تم نہیں جانتے وہ کوئی نہیں جانتا مگر ایسا نہیں ہے"

"لیکن اگر تم میرے سوالات کا صحیح جواب نہ دے سکے تو؟"

"تو اس وقت تمہیں اختیار ہے کہ مجھے جعل ساز، مکار، جھوٹا، جو چاہے سمجھو"

"اچھا تو میری گذشتہ، موجودہ اور آیندہ زندگی کے متعلق کچھ بتاؤ۔ میں کوئی خاص سوال نہیں کرتا"

"آیندہ زندگی کے متعلق میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تم کہہ دوگے کیسے معلوم کل کیا ہوگا۔ ہاں گذرے ہوئے زمانے کا حال سنو اور آجکل تم پر جو گذر رہی ہے وہ بھی مگر ایک شرط ہے۔ بات سچی ہو تو اقرار کر لینا۔ مجھے جھوٹا ثابت کرنے کے لئے خود جھوٹ نہ بولنا"

میں نے کہا "نہیں، ایسا کبھی نہ ہوگا"

اُس نے میری ولادت کا سال پوچھا۔ پیدائش کا دن اور وقت دریافت کیا، پھر انگلیوں پر کچھ حساب لگایا۔ کچھ کاغذ پر لکھا۔ اپنا بستہ کھول کر اُس میں سے بانس کے کاغذ کی ایک بہت پرانی پوتھی نکالی۔ وہ سیاہ و سرخ روشنائی سے ہندی خط میں لکھی ہوئی تھی۔ اس میں بہت سی جدولیں اور نقشے تھے۔ اُس نے ایک نقشہ کو سامنے رکھ کر پھر کچھ حساب جوڑا اور مجھ سے کہا:

"کئی برس سے تم سخت مصیبتوں میں پھنسے ہوئے ہو"

میں نے کہا "ہاں یہ صحیح ہے اور آگے چلو"

"تمہاری موجودہ زندگی نہایت رنج و غم کی زندگی ہے" اُس نے کہا۔

"تم نے یہ کون سی عجیب بات کہی۔ جو مصیبتوں میں پھنسا ہوا ہو اس کی زندگی میں رنج و غم کے سوا اور کیا ہو گا" میں نے جواب دیا۔

اُس نے پھر اپنی اُنگلیوں پر کچھ حساب جوڑا۔ پھر پوتھی دیکھی اور بولا "خیر یوں ہی سہی۔ مگر آجکل تمہارا وقت سخت تنہائی اور بے چینی میں گذر رہا ہے"

"ہاں یہ بالکل صحیح ہے" میں نے کہا۔

"اور تم دیدہ و دانستہ ایک نئے خطرے میں پڑ رہے ہو"

"وہ کیا؟" میں نے کسی قدر حیرت سے پوچھا۔

"تم نے ایک نئی مگر نہایت خطرناک محبت شروع کی ہے"

"بالکل غلط" میں نے نہایت متانت کے ساتھ کہا۔

"جھوٹ نہ بولو، جو دل کہہ رہا ہے وہی زبان سے بھی کہو۔ بوڑھے نجومی سے تم اپنے راز کو چھپا نہیں سکتے" اُس نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ واقعی اُس نے میرے دل کا چور پکڑ لیا۔ مگر اُسے یہ بھید کیوں کر معلوم ہوا؟ جس کا یہ راز ہے، میں نے تو خود اُسے بھی آج تک نہیں تبلایا۔

مجھے خاموش دیکھ کر اُس نے کہا "کچھ اور سُننا چاہتے ہو"

میں نے کہا "ہاں"

"تم نے نادیدہ محبت کی ہے"

"یہ سب تمہارے قیاسات ہیں" میں نے اپنی حیرت کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"خوب! یہ سب قیاسات ہیں؟ اچھا تو مفصل سُنو! "وہ" جوان ہے، دوشیزہ ہے، خوبصورت ہے، دولتمند ہے، اور بہت سی خوبیوں کی مالک ہے"

"واہ رے نجومی! کیا تفصیل بتائی ہے۔ جوان ہے، خوبصورت ہے، ارے جوان اور خوبصورت سے نہیں تو کیا کوئی بوڑھی ڈھڈو سے محبت کرے گا؟"

"گھبراؤ نہیں، مجھے بات تو ختم کر لینے دو۔"

"اچھا کہو۔"

"وہ ایک ستارہ کی ہم نام ہے۔"

نجومی کے یہ الفاظ سن کر میں اچھل پڑا اور سراپا شوق بن کر پوچھا "کس ستارہ کی؟"

"شُکر کی۔" اس نے جواب دیا۔

شکر کونسا ستارہ ہے مجھے معلوم نہ تھا۔ اس کا عربی، فارسی، یا انگریزی نام وہ نہ بتا سکا۔ میں نے فوراً ہندی، انگریزی کی ایک ڈکشنری الماری سے نکالی۔ اس میں شُکر کے معنی VENUS لکھے تھے اسی کو عربی میں زہرہ کہتے ہیں اور فارسی میں ناہید میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔

"کہو اب یقین آیا؟" اس نے فاتحانہ انداز میں پوچھا۔

میں خاموش تھا۔

"کہو تو لفظوں میں اس کی تصویر کھینچ دوں۔ مگر تم نے اسے دیکھا نہیں تمہیں کیوں کر یقین آئے گا کہ یہ اسی کی تصویر ہے؟"

"مضائقہ نہیں، تم بیان کرو۔"

"سنو......

چشم پُرنم، زرد رخ، خاموش لب، چہرہ اُداس
یادگار بیکسی زہرہ تری تصویر ہے

(دیکھ لیا آپ نے؟ بس یہی نقشہ ہے آپ کی زہرہ کا)

وہ کہہ رہا تھا اور میں بالکل از خود رفتگی کے عالم میں سن رہا تھا۔ جیسے کوئی خواب

دیکھ رہا ہو - آخر وہ خاموش ہو گیا - مگر اُس کے لفظوں نے میرے لئے جو ایک خیالی دنیا بنا دی تھی - کئی منٹ تک میں اُسی میں کھویا رہا - آخر چونکا اور بڑی منت کے ساتھ اُس سے کہا "اچھا ایک بات اور بتا دو - اس محبت کا انجام کیا ہو گا ؟"

"یہ نہیں بتاؤں گا، ہرگز نہیں بتاؤں گا، اور تم پوچھ کر بھی کیا کرو گے - جھوٹے جعلساز نجومی کی باتوں کا اعتبار ہی کیا"

میں نے لاکھ منت کی مگر کمبخت ضدی بڈھا کسی طرح راہ پر نہ آیا "غیب کا حال خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا" یہ کہا اور اپنا بستہ بغل میں دبا، منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا میرے کمرے سے نکل گیا -

* * *

زہرہ ! بظاہر یہ ایک افسانہ ہے مگر در اصل واقعہ ہے اور حرف بحرف صحیح ہے میں اس کے متعلق تمہاری آزادانہ رائے دریافت کرنا چاہتا ہوں - کاش کوئی مجھے بتا دیتا کہ نجومی نے میری VENUS یعنی "پریم" کی دیوی "زہرہ" کی جو لفظی تصویر کھینچی ہے وہ کہاں تک صحیح ہے - میرا دل تو یہی کہتا ہے کہ وہ بالکل اصل کے مطابق ہے - سرمو فرق نہیں - کہو تمہارا کیا خیال ہے ؟ تمہیں اپنی عزیز ترین شے کی قسم جو کچھ کہنا سچ سچ کہنا اور صاف صاف کہنا، ورنہ میری اُلجھن اور بڑھ جائے گی - مجھے اس بدذات نجومی پر سخت غصہ آ رہا ہے، کمبخت سے کتنا پوچھا، کتنی منت کی کہ بتا دے "اس محبت کا انجام کیا ہو گا ؟" مگر بدبخت نے نہ بتانا تھا نہ بتایا - کاش وہ ایک بار پھر مجھے مل جائے تو جس طرح بنے سارا حال اُس سے پوچھ لوں -

سچی کہانی

(فریب)

"ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں آپ سے۔ بتائیے گا؟"

"کیوں نہیں؟"

"سچ سچ بتائیے گا؟"

"بیشک"

"میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آپ مجھے بنا تو نہیں رہے ہیں"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا سلمیٰ"

"واقعی؟"

"واقعی"

"میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کا التفات روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ بار بار میرے دل میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید آپ مجھ سے مذاق کر رہے ہیں۔ صرف مجھے ستانے کے لئے، ورنہ میری طرف آپ کا میلان خاطر

کوئی معنی نہیں رکھتا۔ میں اپنے اندر کوئی بات بھی ایسی نہیں پاتی جو آپ کی گرویدگی کا باعث ہو سکے۔ آج تک کسی نے مجھے "خوبصورت" نہیں کہا۔ انسان اپنے متعلق بہت خوش گمان ہوتا ہے، مگر اس کے باوجود کبھی میں نے اپنے آپ کو خوبصورت نہیں سمجھا۔ جب آئینہ دیکھا دل میں یہی آرزو پیدا ہوئی "کاش میں حسین ہوتی" اگر آپ مجھے بنا نہیں رہے ہیں تو شاید جان بوجھ کر یا نادانستہ طور پر خود اپنے آپ کو فریب دے رہے ہیں۔"

"قبل اس کے کہ میں تمہارے سوال کا جواب دوں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"پوچھیے۔"

"تمہارے نزدیک حُسن کا معیار کیا ہے؟"

"وہی جو ساری دنیا کے نزدیک ہے۔"

"مثلاً۔"

"مثلاً غزالی آنکھیں، ہلالی ابرو، گلابی ہونٹ، شہابی رخسار....

"بس بس، میں سمجھ گیا تمہارا مطلب سلمیٰ! کس قدر غلط اور عامیانہ معیار تم نے قائم کیا ہے۔ حُسن کا یہ معیار اگر صحیح ہوتا تو ساری دنیا صرف اُن چند خوبرویوں پر مرتی جن کی صفت تم نے بیان کی۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ تمہارے نزدیک غزالی آنکھیں انسان کو دیوانہ بنا سکتی ہیں۔ مگر بہت سے لوگ اُن آنکھوں پر بھی جان دیتے ہیں جو نرگس کی طرح گول اور چھوٹی ہوتی ہیں۔ تم سمجھتی ہو کہ ہلالی ابرو ہی کیوپڈ کی کمانیں ہیں مگر سیدھی بھنویں بھی بے پناہ تیر چلا سکتی ہیں۔ آؤ میں تمہیں بتاؤں کہ حُسن کا حقیقی معیار کیا ہے۔

حُسن درحقیقت نام ہے پسند کا اور دنیا میں پسند دو آدمیوں کی بھی یکساں

نہیں ہوئی۔ اس لئے دنیا میں جتنے انسان ہیں اُتنے ہی حُسن کے معیار ہیں تمہیں اگر کسی نے حسین نہیں کہا تو یہ تمہارا قصور نہیں، قصور ہے دیکھنے والے کی نظر کا ہر آنکھ میں یہ صلاحیت کہاں کہ وہ سطح کے نیچے دیکھ سکے تم نے دیکھا ہوگا کہ جاپان کی بنی ہوئی سستی قسم کی رنگین تصویریں عوام الناس کس شوق سے خریدتے ہیں، اُن کے نزدیک رنگوں کی شوخی ہی بڑا حُسن ہے۔ نقوش کی لطافتوں اور خطوط کی نزاکتوں کو وہ نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن مبصر کسی آرٹسٹ کی ایک پنسل ڈرائنگ کو ایسی ہزار رنگین تصویروں سے زیادہ قیمتی سمجھتا ہے۔ عوام الناس اگر اس پنسل ڈرائنگ کی طرف اعتنا نہ کریں تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ اس نقش سادہ میں حُسن نہیں؟"

سلمیٰ! تم اس بانسری کی مانند ہو جس میں ہزاروں میٹھے اور رسیلے نغمے بھرے ہوئے ہیں۔ ایسے نغمے جو اپنے بازوؤں پر بٹھا کر روحوں کو آسمانوں پر لے جاتے ہیں۔ مگر جو شخص بانسری بجانا نہیں جانتا اس کے نزدیک یہ بانسری، یہ رس ساگر، بانس کا ایک ٹکڑا ہے اور بس۔ جو جلانے کے سوا اور کسی کام کا نہیں۔ مگر اس کی قدر اُس سے پوچھو جو اپنے ہونٹوں کو اُس کے لبوں سے ملا کر آبِ حیات برساتا ہے اور کانوں کی راہ سے شراب پلا کر روح کو مست و بے خود بنا دیتا ہے۔

سلمیٰ! تم ایک شعر ہو، مگر ایسا شعر نہیں جو لفظی رعایتوں کا گورکھ دھندا ہو، جس میں گمراہ اور بیمار تخیل نے ہوائی قلعے بنائے ہوں، بلکہ ایسا شعر ہو جو گنجینۂ معنی اور خزینۂ اسرار ہے۔ جو ایک نشتر کی طرح دل میں پیوست ہو جاتا ہے، جسے سُن کر ذوقِ سلیم جھومنے لگتا ہے۔

شاید اب میرے اور دنیا کے نقطہ نظر کا فرق تمہاری سمجھ میں آگیا ہوگا میں نے تمہیں ایک نقش سادہ کہا۔ مگر ایسا نقش جس میں آرٹسٹ نے اپنے موقلم کا کمال

Ranfa

Raufa

Rafeeza

Sitaras

Taja

Nazeer

1/4/18

G. Mohmad. Bhat

Ali Mohd

G. Rasool Bhat

389309

653 | Author Hassin